علمی و تحقیقی مجلّہ

معیار

جلد: ۱ جنوری تا جون ۲۰۰۹ء شمارہ: ۱

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے، جو آج کل ترقی یافتہ علمی دنیا میں بالعموم رائج ہیں اور جن پر "معیار" عمل کرے گا:

☆ مقالہ A4 جسامت کے کاغذ پر ایک ہی جانب کمپوز کروا کر بھیجا جائے جس کے متن کا سطری فاصلہ ۱٫۵ انچ میں رکھا جائے۔ حروف کی جسامت ۱۲ پوائنٹ ہو۔ مقالہ کاغذ کی ایک ہی جانب لکھا جائے اور مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اس کا خلاصہ ضرور شامل کیا جائے جو زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ لفظوں پر مشتمل ہو۔ مقالے کی CD بھی ساتھ ضرور ارسال فرمائیں یعنی مقالے کی "ہارڈ" اور "سافٹ" کاپی دونوں ارسال کی جائیں۔

☆ اگر کسی تصنیف پر تبصراتی مقالہ (Review Article) تحریر کیا گیا ہے تو اس میں تصنیف کا مکمل عنوان، مصنف کا نام، ناشر، شہر، سن اشاعت، صفحات کی تعداد ضرور درج کی جائے۔

☆ متن میں حوالوں کا اندراج یا ماخذ کا حوالہ اگر بین السطور دیا جائے تو حوالے کے لیے مصنف کے نام کا آخری جزو، سن اشاعت اور صفحہ نمبر، جو جہاں ضروری ہو، درج کیا جائے۔ اگر اسی حوالے کو دوبارہ پیش کیا جائے تو اسی صورت میں درج کیا جائے۔ بین السطور حوالہ درج کرتے ہوئے "ایضاً" اور "تصنیف مذکور" سے گریز کیا جائے۔ مثالیں درج ذیل ہیں:

(اقبال، ۱۹۳۲ء، ص ۵۰)، (قریشی، ۱۹۷۶ء الف، ص ۱۲-۱۳) یہاں "الف" اس لیے ہے کہ اس مصنف کا کوئی اور ماخذ بھی اسی سال چھپا ہے اور اس کا حوالہ بھی فہرست منابع/کتابیات میں شامل ہے۔ (نوری، ۲۰۰۹ء، باب چہارم) (عبداللہ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰)، (فاروقی، ۱۹۳۵ء، ص ۵۴)

☆ حاشیے میں بھی ماخذ کا حوالہ درج یا اشاریوں کے مطابق دیا جا سکتا ہے لیکن ضرورتاً "ایضاً" یا "تصنیف مذکور" بھی تحریر کیے جا سکیں۔

☆ مقالہ چاہے مختصر ہو لیکن آخر میں تمام ماخذ یا حوالوں کی فہرست "فہرست منابع/کتابیات" (یا کتابیات) شامل کی جائے۔ اس کا اصول یہ ہونا چاہیے:

۱۔ اگر کتابوں کا اندراج کرنا ہو تو:

احمد، ظہور الدین، ۱۹۹۰ء، "پاکستان میں فارسی ادب" جلد پنجم، لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان۔

۲۔ اگر مجموعہ مقالات کا اندراج کرنا ہو تو:

عبدالرحمن، سید صباح الدین، ۱۹۷۷ء، "جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں تصوف کا حصہ" مشمولہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی اور مشیر الحق، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ص ۱۵۴-۱۸۳

۳۔ اگر جریدے یا رسالے کے مقالے کا اندراج کرنا ہو تو:

نیر، ناصر عباس، ۲۰۰۸ء، "جدیدیت کی فکری اساس" مشمولہ "ادبیات" شمارہ ۷۸، جولائی تا دسمبر، ص ۱۵۷ تا ۱۸۰

۴۔ اگر ترجمے کا اندراج کرنا ہو تو:

سعید، ایڈورڈ (Said, Edward)، ۱۹۸۱ء، "اسلام اور مغربی ذرائع" (Covering Islam) مترجم جاوید تحسین، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان

۵۔ اگر اخبار کی کسی تحریر کا اندراج کرنا ہو تو:

قریشی، سلیم الدین، ۲۰۰۸ء، (۲۳ مئی) "ہم نے کیا کھویا کیا پایا" مشمولہ "جنگ" (کراچی) ص ۸

۶۔ اگر سرکاری ذخیرے کا اندراج کرنا ہو تو:

F 262/100 NAP: Descriptive Catalogue of Quaid-e-Azam Papers جلد ۳، ص ۴۸، (۲۶ جولائی ۱۹۴۰ء)

۷۔ اگر انٹرنیٹ/آن لائن دستاویز کا اندراج کرنا ہو تو:

Social Watch.http://www.chasque.apc.org/socwatch/udex.htm (مورخہ ۱۵ جنوری ۲۰۰۹ء)

ترتیب

گوشۂ نوادر (اردو)

حصۂ انگریزی

لسانی مطالعات

ماخذ مطالعات

گوشۂ نوادر (انگریزی)

معروضات

پاکستان کی جامعات میں، گزشتہ چند برسوں سے ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان کی تحریک اور تشویق و ترغیب کے نتیجے میں، تحقیقی سرگرمیوں میں جو اضافہ اور معیار میں بہتری کی جو صورت حال عام ہوئی ہے وہ خاصی قابلِ تحسین اور معاشرتی علوم کی حد تک بھی، قدرے قابلِ اطمینان ہے۔ یہی صورت تحقیقی مجلوں کی ترتیب و اشاعت کے ضمن میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ چند برس پہلے تک ہمارے بیشتر اساتذہ میں تحقیقی سرگرمیاں کسی طرح قابلِ اطمینان نہ تھیں اور یہی صورت تحقیقی منصوبوں کے اختیار کرنے اور تحقیقی مقالات لکھنے کے عمل میں بھی نظر آتی تھی مگر اب حالیہ عرصہ میں بیشتر جامعات کے معاشرتی علوم و فنون کے کلیے اور شعبہ جات زبان و ادب اور خصوصاً شعبہ ہائے اردو اپنے تحقیقی مجلوں کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں اور ان کی اشاعت کے تواتر اور معیار میں مسابقت کی ایک مناسب اور مثبت فضا بھی فروغ پاتی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اگرچہ ابھی نوزائدہ ہے لیکن اپنے ہمہ جہت تدریسی خصائص کے ساتھ ساتھ تحقیق کے فروغ اور تحقیق کے ترقی یافتہ عالمی معیار کی مناسبت سے جدید تر سائنٹفک اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے معیار کی بلندی کے لیے پرعزم ہے۔ معیار کی بہتری اور بلندی کے مقصد ہی کے ذیل میں تحقیقی منصوبوں کے موضوعات کے تعین و انتخاب میں بھی یہ شعبہ خاصا حساس ہے۔ اس لیے سرسری، سطحی، اطلاقی، شخصی اور فرسودہ و بے اثر موضوعات سے، جو معاشرے اور مستقبل کے لیے کوئی ناگزیر افادیت نہیں رکھتے، گریز کرتے ہوئے شعبہ میں ایسے منصوبوں اور موضوعات کو ترجیح دی جا رہی ہے جو ہمارے معاشرے کے لیے، مستقبل کی علمی ضرورتوں کے لیے اور دیگر محققین کے مطالعات و منصوبوں کے لیے مفید و کارآمد ہوں۔

زیرِ نظر مجلّہ بھی شعبہ کے مذکورہ عزائم اور مصالح کا مظہر رہے گا۔ چناں چہ اسے شعبے کے متعینہ معیار کے مطابق علمی و تحقیقی اور غیر مطبوعہ مقالات کے لیے مخصوص کیا جا رہا ہے لہٰذا ہمارا اصرار ایسے مقالات کے حصول و شمول پر ہے جو فکر انگیز و معلوماتی ہوں اور دریافت و انکشاف کی حیثیت رکھتے ہوں یا علمی و ادبی نوادر، مخطوطات اور دستاویزات کی تحقیق و تدوین یا تعارف و تنقید پر مشتمل ہوں۔

ہم ایسے متون کے اردو تراجم کے بھی ایک تحقیقی مجلّے میں شمولیت کے حق میں ہیں کہ جو خود تحقیقی ہوں، تحقیق کے فکری و معاشرتی تقاضوں کو متاثر کرنے کا سبب بن سکتے ہوں یا علمی و فکری مباحثہ کے محرک بنے ہوں یا بن سکتے ہوں، تا کہ اس طرح بھی اردو زبان میں موجود خلاؤں سے پُر ہوتا رہے اور اردو کے مصنفین اور اساتذہ و طلبہ ان سے بہرہ مند ہوتے رہیں۔

اس مجلّے میں ایک "گوشۂ نوادر" کا بھی اہتمام کیا جا رہا ہے تا کہ اس میں شامل نوادر، جو عام اور دستیاب نہیں ہیں، محققین، اساتذہ اور طلبہ کی رسائی میں آ سکیں اور مطالعے و استفادے اور تحقیق و تدوین کا موضوع بن سکیں۔ اس ضمن میں ایسے اردو نایاب اور غیر مطبوعہ مخطوطات و دستاویزات کا عکس بھی پیش کیا جانا مقصود ہے جو اہم ہیں لیکن عام رسائی میں نہیں ہیں تا کہ اس عکس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا سکے یا انھیں اپنے تحقیقی منصوبوں یا تدوین و ترتیب کا موضوع بنایا جا سکے۔ یہاں ہم ایسے متون بھی شامل کرنے کے حق میں ہیں جو اگرچہ کبھی شائع

ہوئے تھے لیکن اب نایاب ہیں اور جو مذکورہ تناظر میں ترتیب و تدوین یا حواشی و تعلیقات کے ساتھ دوبارہ اشاعت کے متقاضی ہیں۔

"معیار" میں ذولسانی (اُردو، انگریزی) مقالات کے شامل کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اُردو زبان و ادب، لسانیات اور اُردو دنیا کی تاریخ و تہذیب اور افکار و خیالات سے متعلق مطالعات و تحقیقات اگر انگریزی زبان کے وسیلے سے پیش کی جاری ہیں تو "معیار" کے قارئین اور اُردو زبان و ادب کے محققین، مصنفین اور اساتذہ و طلبہ کو ان سے خاطر خواہ استفادے کے مواقع میسر آ سکیں۔

مدیران

معیار: علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد؛ شمارہ ۵، جنوری-جون ۲۰۱۱ء

منشائے مصنف سے انحراف: محرکات اور اسباب

حنیف نقوی*

ادب کے مطالعے میں متن وہی حیثیت رکھتا ہے جو کسی تعمیر میں خشتِ اول کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی تو دیوار خواہ کتنی ہی بلند ہو جائے "ٹیڑھی کی ٹیڑھی" رہے گی۔ متن میں بنیادی کجی کبھی الفاظ کی معمولی تقدیم و تاخیر یا کمی بیشی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور کبھی لفظوں کی حد سے تجاوز کر کے جملوں اور عبارتوں یا مصرعوں اور شعروں کی تبدیلی، تخفیف یا اضافے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان تغیرات کے نتیجے میں متن کی استنادی حیثیت مخدوش ہو جاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہی بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ جب کوئی متن منشائے مصنف کے مطابق نہیں رہتا بلکہ کسی دوسرے شخص کی ترجیحات کا تابع ہو کر یا کسی ناگزیر اتفاق کے تحت جزوی طور پر اپنی شکل بدل لیتا ہے تو اس سے اخذ کردہ نتائج اپنی تحقیقی اہمیت اور تنقیدی معنویت کھو بیٹھتے ہیں کیوں کہ کسی جملے یا عبارت میں ایک دو لفظوں کی کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر جو بہ ظاہر بہت اہم نہیں معلوم ہوتی، بعض اوقات مصنف کے مبلغِ علم، اس کے نقطۂ نظر یا اسلوبِ نگارش کے بارے میں پڑھنے والے کی رائے بدل دیتی ہے۔ "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد" کے بہ مصداق عبارت میں ہر جملے کا اور جملے میں ہر لفظ کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے چناں چہ کسی جملے کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے یا کسی لفظ کے اپنی نشست بدل لینے سے اس عبارت کے مفہوم میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے وہ بعض صورتوں میں منشائے مصنف سے مطابقت کی شرط کو پامال کرتی ہوئی اس سے انحراف یا اختلاف کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو تدوینِ متن جسے بعض غیر ذمہ دار و سہل پسند حضرات معمولی درجے کا کام تصور کرتے ہیں، فی الحقیقت حد درجہ ذمے داری کا اور دیدہ ریزی و دماغ سوزی کا کام ہے۔

منشائے مصنف سے انحراف اگرچہ ایک خارجی عمل ہے لیکن اس کا اطلاق عموماً اس کے داخلی یا معنوی اثرات پر منحصر ہوتا ہے۔ مثلاً مرتبِ متن اگر املا کی کسی ایسی شکل کو بدل دیتا ہے جو مصنف کے عہد میں رائج تھی مگر اب ترک کی جا چکی ہے تو عام حالات میں اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا، اس لیے یہ تبدیلی منشائے مصنف کی خلاف ورزی میں شمار نہ ہوگی لیکن اگر املا کی یہی قدیم اور متروک شکل کسی خاص عہد کے تلفظ کی نمائندگی کرتی ہے یا وزنِ شعر کی تابع ہے یا پھر حسابِ جمل سے مربوط ہے تو اس کا بدل دینا کسی صورت میں بھی جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مصنف ترجیحی طور پر کسی ایسے املا کا پابند رہا ہے جو نہ اس کے عہد کا معمول تھا اور نہ اب رائج ہے تو اسے بھی اپنی حالت پر برقرار رکھنا لازم ہوگا۔ مؤخر الذکر چاروں صورتوں میں متن کے اصل املا سے انحراف منشائے مصنف سے انحراف تصور کیا جائے گا۔

منشائے مصنف یا اصل متن سے انحراف کو بہ اعتبار نوعیت دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ انحراف شعوری یا ارادی ہے تو

---

* سابق پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی؛ پتا: CK-46/30-B، تیسری منزل، ہتیا باغ، وارانسی (بھارت) ۲۲۱۰۰۱

اس کے لیے ''تحریف'' کی اصطلاح استعمال ہوگی اور اگر اس میں شعوری ارادے کو دخل نہیں بلکہ یہ محض اتفاق یا سہو کا نتیجہ ہے تو اسے ''تسامح'' سے تعبیر کیا جائے گا۔ عملی طور پر ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہ ہونے کے باوجود تسامح کی بہ نسبت تحریف زیادہ خطرناک مضمرات کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً کسی مرتب یا ناقل سے محض بے خیالی میں کوئی لفظ، کوئی ٹکڑا یا کوئی جملہ چھوٹ جاتا ہے یا بر بنائے سہو اصل لفظ کی جگہ اس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا لفظ لے لیتا ہے تو بیشتر صورتوں میں ایسی تمام غلطیاں عبارت کی بے ربطی یا بیان کے نقص اور نظم کی صورت میں شعر کی ناموزونیت کے باعث فوراً گرفت میں آجاتی ہیں اور پڑھنے والا بالعموم کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص کسی خاص مقصد کے تحت بالارادہ اس قسم کے تصرفات کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے اس عمل کے نتیجے میں نہ صرف منشائے مصنف ہی پامال نہیں ہوتا، کبھی کبھی انتہائی مغالطہ انگیز یا مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ''نکات الشعرا'' کے نسخۂ رام پور کے ناقل نے جابجا شعرا کے انتخابات سے اشعار کم کر کے کم سے کم وقت میں اپنا کام نمٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی یہ جلد بازی کئی جگہ منشائے مصنف کی پامالی کا سبب بنی ہے۔ مثلاً سجاد اکبر آبادی کا ایک شعر ہے:

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے　　　　جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

اس کے بارے میں میر صاحب کا ارشاد ہے کہ: ''ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیوان ایں شعر تو اعد دست بہم کی وجہ از بس کہ از خواندن ایں شعر بطلے بری و دوہم ای خواہم کہ بہ صد جان بسم''۔ نسخۂ رام پور میں یہ عبارت موجود ہے۔ مگر مندرجہ بالا شعر جس سے یہ تعلق رکھتی ہے اس سے پہلے کے مزید تین اشعار کے ساتھ شامل متن نہیں۔ چناں چہ یہ عبارت ان چاروں اشعار سے قبل کے مندرجہ ذیل شعر سے مربوط ہو گئی ہے:

بے تکلف ہو نپٹ سب سے ملے ہے سجاد　　　　دختر رز بھی عجب طور کی دیوانی ہے

اگر ''نکات الشعرا'' کے دوسرے معتبر نسخے موجود نہ ہوتے تو یہ قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میر صاحب کے یہ تعریفی جملے اس شعر سے متعلق نہیں۔

کاتبوں کی عجلت پسندی کی طرح مرتبین کی سہل پسندی بھی متن کی تبدیلی ہیئت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مخطوطات کی ترتیب و تدوین کے دوران بعض اوقات ایسے الفاظ سے بھی سابقہ پڑتا ہے جن کی ہیئت ظاہری میں ان کی صحیح قرأت کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح کبھی کبھی ایسے جملے یا مصرعے سنگ راہ بن کر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں جن میں ایک دو لفظوں کی کمی معنی کے تعین یا وزن کی تکمیل کو ایک مسئلہ دشوار بنا دیتی ہے۔ مرتب اگر فرض شناس ہو اور ذمے دار ہے تو وہ ایسے مقامات پر کسی دوسرے ماخذ کی مدد سے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بر بنائے قیاس صحیح متن پیش کر کے حواشی میں اصل صورت حال کی وضاحت کر دیتا ہے۔ بہ صورت دیگر مشکوک و مبہم الفاظ یا ناقص مصرعوں اور جملوں کو ان کی اصل کے مطابق نقل کر کے اور ان کے سامنے قوسین کے اندر (کذا) لکھ کر یا سوالیہ نشان (؟) قائم کر کے ان نقائص کی نشان دہی میں کسی قسم کی ہچکی محسوس نہیں کرتا۔ اس کے خلاف سہل پسند اور غیر ذمے دار مرتبین اس قسم کی موشگافیوں اور وضاحتوں کو ضروری نہیں سمجھتے اور اپنی صواب دید کے مطابق جس قرأت کو موزوں اور برمحل خیال کرتے ہیں، بلا تامل داخل متن کر کے بزعم خود تمام زحمتوں کا سد باب کر دیتے ہیں۔ اس کی دو مثالیں مولوی عبدالحق کے مرتبہ تذکرہ نکات الشعرا کے حوالے سے درج ذیل ہیں۔ پہلی مثال انعام اللہ خاں یقین کے حالات و کلام سے متعلق حسب ذیل جملہ ہے:

''بجھے برایں اتفاق دارند کہ شاعری بدخالی از نقص نیست'' (ص ۸۲)

ثلاث الشعرا کا یہ ایڈیشن جس خطی نسخے پر مبنی ہے اس میں اس جگہ تین لفظی فقرے "خالی از تخلص" کی بجائے صرف ایک لفظ لکھا ہوا ہے جس کی قرأت غیر واضح ہے۔ قیاساً اسے "متقصی" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "یقینی" بھی۔ فاضل مرتب نے اسے "تخلص" کی مسخ شدہ شکل قرار دے کر اس سے قبل دو لفظوں کے اضافے کے ساتھ متن کی ایک بامعنی شکل متعین کر دی لیکن دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متنازعہ فیہ لفظ اصلاً "متقصی" یا "تخلص" نہیں "یقینی" تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مصنف کا مقصود صرف قارئین کو یہ بتانا تھا کہ معاصرین کی ایک جماعت کے نزدیک یقین کا شاعر ہونا امر یقینی نہیں۔ کسی شاعر کے کلام کے نقائص سے مملو ہونے اور اس کے مطلقاً شاعر نہ ہونے میں زمین آسمان کا جو فرق ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔

تذکرے کے اس ایڈیشن میں احمد گجراتی کی پانچ اشعار پر مشتمل ایک غزل کے دوسرے شعر کا متن حسب ذیل ہے:

نشان بے نشاں ہم ملک یک رنگی میں پاتے ہیں　　　خبر چھوڑی دوئی کا ہم نے جب سے کاست گھر نکلے

(ص ۷۹) اصل قلمی نسخے میں یہ شعر ناقص صورت میں منقول ہے:

لساں لے لساں پاتے ہیں ملک یک رنگی　　　خبر سر پاؤں کی چھوڑی، دوئی کاست گھر نکلے

اس شعر اور مولوی عبدالحق کے پیش کردہ شعر میں الفاظ و معانی کے اعتبار سے جو واضح فرق ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرتب کی سہل پسندی یا غیر ذمہ داری بعض اوقات متن پر کیسے دور رس اثرات مرتب کرتی ہے۔

تحریفِ متن میں کبھی کبھی کاتب یا مرتبِ متن کی ذاتی پسند و ناپسند یا عقیدت و ارادت بھی دخیل ہوتی ہے۔ مثلاً زیرِ کتابت یا زیرِ ترتیب کتاب میں وہ بعض محترم اشخاص کے ناموں کے ساتھ اپنی طرف سے ایسے القاب و آداب یا رموز و علائم کا اضافہ کر دیتا ہے جو مصنف کی بجائے اس کے اپنے عقیدے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر وہ کسی خاص شخص کو قابلِ احترام نہیں سمجھتا تو مصنف کی تحریر کردہ اظہارِ عقیدت کی تمام علامات کو بیک قلم متن سے خارج کر دینے میں اسے کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ اردو کے ایک مرحوم اور بزرگ محقق نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصنیف فسانۂ عبرت کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اسی جذباتی محرک کے زیرِ اثر خاموشی کے ساتھ اس کے بعض ایسے جملے حذف کر دیے جن کی اشاعت سے ان کی ایک پسندیدہ شخصیت کی شبیہ پر حرف آنے کا امکان تھا۔ اتفاقاً ان کے ایک کم عمر معاصر کو اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مل گیا تو جوابی کارروائی کے طور پر انھوں نے اسے من و عن شائع کر دیا۔ اس طرح یہ تحریف جسے پوری احتیاط کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا، عالم آشکار ہو گئی۔

تحریف کے پس پشت کبھی کبھی اصلاحِ حال یا خیر خواہی کا جذبہ بھی کار فرما ہوتا ہے۔ مثلاً مصنف کا کوئی دوست یا شاگرد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی تصنیف لسانی اعتبار سے کمزور یا بیانِ واقعات کے لحاظ سے ناقص ہے تو وہ حقِ دوستی یا حقِ شاگردی کی بنا پر ان نقائص کو دور کرنے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتا لیکن یہ خیر سگالی جس کا اصل مقصد کتاب کو اس کی ظاہری و معنوی کمزوریوں سے پاک کرنا ہوتا ہے اس کے پایۂ استناد کو کمزور کر دیتی ہے۔ شورش عظیم آبادی کے تذکرے کے نسخۂ آکسفورڈ کا یہی معاملہ ہے۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ خانقاہ رشیدیہ جون پور سے حاصل ہوا ہے۔ اس نسخے میں شورش نے غالباً بربنائے انکسار بہ حیثیت شاعر اپنا تعارف سپردِ قلم کرنے سے احتراز کیا ہے اور صرف "از غلام حسین شورش" لکھ کر اپنے منتخب اشعار نقل کر دیے ہیں۔ اس کے برخلاف نسخۂ آکسفورڈ میں ان کا ترجمہ، احوال مندرجۂ ذیل تفصیلات کے ساتھ موجود ہے جو یقیناً کسی اور کی کارگزاری ہے۔

"سید غلام حسین عرف میر بھیکا شورش تخلص، از نجیبانِ عظیم آباد است۔ علم و فضل و ریاست از بزرگاں میراث

> دارد۔ در ابتدائے مشق از خدمت میر باقر مرحوم کہ جد بزرگوار تخلص بہ نمود ضمیر بود بہ وراثت آخر دیوان خود در
> از نظر مرد اکسیر عشق تخلص گزرانید فوائد کافی حاصل نمود۔ شعر بہ فصاحت و سلاست تمام می گوید۔ غزل در
> طرفہ الحسن انجام می نماید۔ قصیدہ و مثنوی و رباعی بہ شستگی و رنگینی بلا کلام و تمام پذیری سارد۔ مذاق صوفیہ دارد۔ کثر
> شعر ہم بہ مذاق صوفیہ فرمایند۔ یک لک قریب چہار ہزار شعر بہ نظر در آمدہ۔"[1]
>
> پروفیسر محمود الٰہی کے بقول "مصحفی (کا پہلا مسودہ) ترجمہ شورش تک موجود تھیں جس کے اکثر مباحث اس
> کے شکار ہوئے ہیں۔" موصوف کا خیال ہے کہ "ان تصرفات کے پیش نظر مسودہ آ کسفورڈ کو شورش کا اصل تذکرہ
> نہیں کہا جا سکتا"۔[2]

اس قسم کے تصرفات کی ایک اور مثال امیر لکھنوی اور امیر مینائی کا مرتب کیا ہوا دیوان مصحفی ہے جو ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۸ء میں مطبع تاج المطابع، رام پور سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ امیر مصحفی کے شاگرد تھے اور امیر مینائی امیر کے شاگرد۔ دونوں نے مل کر اپنے استاد اور دادا استاد (مصحفی) کے کلام پر اس طرح اصلاح کا قلم چلایا ہے کہ اس کی شکل کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ محرک وہی عقیدت و ارادت ہے جو یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ استاد کے کلام میں سہو طور پر زبان کی کوئی کمزوری، محاورے کی کوئی غلطی، بندش کی کوئی سستی یا بیان کا کوئی سقم نظر آئے لیکن اصولی طور پر یک عام مدون متن کی طرح کسی شاگرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی حیثیت عرفی کی بنا پر اپنے استاد کے اشعار میں ترمیم و اصلاح کر کے اپنی پسند یا ترجیحات کے مطابق ان کی شکل تبدیل کر دے۔

امیر و امیر نے جس بے دردی کے ساتھ مصحفی کے کلام کو مسخ کیا ہے میر علی اوسط رشک نے اتنی ہی بے رحمی کے ساتھ اپنے استاد ناسخ کے کلام کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ کلیات ناسخ پہلی بار رشک ہی کے زیر اہتمام ناسخ کی وفات (۱۶ اگست ۱۸۳۸ء) کے ساڑھے چار برس بعد جنوری ۱۸۴۳ء میں میر حسن رضوی کے مطبع محمدی، لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ناسخ کو دبستان لکھنؤ کے شعرا میں اصلاح زبان کی یک منظم تحریک کے بانی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس اصلاحی تحریک کے خد و خال اور رجحانات کے بارے میں ہمارا سارا علم ان کے بعض شاگردوں کی تحریروں اور بیانات و معمولات پر مبنی ہے اور رشک اس گروہ و قاعدہ کے سرخیل تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ کلیات ناسخ کی اشاعت سے قبل لکھا گیا کلام ناسخ کا کوئی معتبر قلمی نسخہ شاگردوں کی وساطت سے دریافت شدہ ان لسانی تصرفات کی تائید نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف مختلف داخلی و خارجی شواہد اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ کلیات ناسخ کے موجودہ شکل رشک کی اصلاح و ترمیم کے بعد اختیار کی ہے۔ ایک گمنام معاصر نے اس صورت حال کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "دیوان اول و ثانی شیخ صاحب نوشتۂ میر حامد علی و یکے دیوان محررۂ دست مبارک شیخ صاحب بہ اقربا
> تبرک ترسیل کردہ ام کہ ہمیں نسخہ با جناب میر علی اوسط رشک صاحب گرفتہ و اصلاح فرمودہ و بہ طبع
> در آوردہ۔ بعض اشعار شیخ صاحب را چناں از قلم خود فرسودہ اند کہ خواندہ نمی شود۔"[3]

کلیات کے اس پہلے ایڈیشن کے آخر میں "تصحیح اغلاط و تنقید الفاظ کلیات امام بخش ناسخ از میر علی اوسط متخلص بہ رشک" کے عنوان سے یک مفصل غلط نامہ بھی شامل ہے، جس میں "سہو کاتب کی غلطیاں درست" کرنے کے پردے میں ان اصلاحات کی سہولت پیدا کرنے کی گنجائش نکال لی گئی ہے جو پہلی نظر میں چھوٹ گئی تھیں۔ ان میں الفاظ کی معمولی تبدیلیوں کے علاوہ پورے پورے مصرعوں کی تبدیلی کی بھی چند مثالیں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تصحیح طلب مصرعوں کا اغلاط کتابت میں شمار ایک ایسا عمل ہے جسے عقل سلیم کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتی۔

■

کی غلط؟

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مختلف فقرے حوالے مولانا محمد حسین آزاد کے بیان کردہ دو علاحدہ علاحدہ واقعات سے تعلق رکھتے ہیں جس پر ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب میں تبصرہ کیا ہے۔ صحیح صورت حال کا اندازہ ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

(الف) "آزاد لکھتے ہیں کہ میر ضاحک کے انتقال پر سودا میر حسن کے یہاں گئے اور میر ضاحک کی ہجویں چاک کر دیں۔ دوسری طرف میر حسن نے ضاحک کے قلم سے سودا کی ہجویں چاک کر دیں۔ شیرانی نے توجہ دلائی کہ سودا کا انتقال ۹۵ھ میں ہوا اور ضاحک خود آب حیات کے مطابق ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے۔

(ب) "سودا، ضاحک اور سکندر کا واقعہ (آزاد نے) سلیمان شکوہ کی موجودگی میں لکھنؤ میں دکھایا ہے قاضی صاحب کہتے ہیں کہ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور سلیمان شکوہ اس کے دس برس بعد لکھنؤ گئے"

اہل علم جانتے ہیں کہ سودا کے سال وفات (۱۱۹۵ھ) کے سلسلے میں محققین کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں اور یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے کہ سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قاضی صاحب کے نام کے ساتھ ۸۵ھ کا حوالہ صریحاً کتابت کی غلطی ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے اس غلطی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتاب کے دو مختلف مقام اجزا کو باہم ملا دے کر دیدہ و دانستہ ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس سے بہ حیثیت محقق و عالم مصنف کے اعتبار و احترام پر حرف آتا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ تحریف کی انتہائی قبیح صورت ہے۔

کبھی کبھی شعبی احساس برتری یا محض مظاہرۂ شوق بھی اس قسم کی تحریفات کا محرک ہوا کرتا ہے چنانچہ حضرات صرف اپنی منصبی حیثیت یا علمی مرتبے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر مصنف یا مضمون نگار کی تحریر میں اصلاح اور قطع و برید کو جائز طور پر اپنا حق تصور کرتے ہیں۔ رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی تحریروں میں ان کے مدیروں کی طرف سے اس حق کا استعمال ایک عام بات ہے۔ کثر ایسا ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے کوئی لفظ، فقرہ یا جملہ کسی خاص پس منظر میں استعمال کیا ہے اور مدیر اس پس منظر یا اس کی اہمیت سے واقف نہیں چنانچہ وہ سے غیر ضروری یا غیر مناسب خیال کرتے ہوئے قلم زد کر دیتا ہے یا بدل دیتا ہے۔ نتیجہ نکلتا ہے کہ بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور منشائے مصنف فوت ہو جاتا ہے۔

تحریر مطور نے ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی تحریک پر "مآثر غالب" مرتبہ قاضی عبدالودود کی از سر نو ترتیب و تصحیح کا کام انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار (ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ) ادارے کی طرف سے اس کام کے نگراں اور ان کے ایک رفیق کار کتابت و طباعت کے ذمہ دار تھے۔ اس کے مقدمے میں ایک جگہ میں نے لکھا تھا:

"طبع اول پر اضافے کے طور پر تین خطوں کے جن تین نئے مکتوب الیہوں (نواب علی اکبر خان طباطبائی، مولوی سراج الدین احمد اور خواجہ فیض الدین حیدر) کا پتا لگا ہے ان سے متعلق توجیہات اور شواہد مناسب مقامات پر پیش کر دیے گئے ہیں"

کتابت شدہ مسودہ میری نظر سے گزر چکنے کے بعد فاضل نگراں یا ان کے رفیق کار نے کسی وقت اس عبارت کو اس طرح بدل دیا

طبع اول پر اضافے کے طور پر جس نئے مکتوب الیہ (مولوی سراج الدین احمد) کا پتا لگایا گیا ہے اس سے متعلق توجیہات اور شواہد

مناسب مقام پر پیش کر دیے گئے ہیں۔"

میں نے اپنی تحریر میں "تین خطوں کے تین نئے مکتوب الیہ" دریافت کرنے کی بات کی تھی۔ ان میں سے ایک نام رحو بند بیغم مدین حیدر، پہلے سے مکتوب الیہم کی فہرست میں موجود تھا اور نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے نام کے خط سے متعلق شوہد "استدراکات" کے تحت پیش کیے گئے تھے، اس لیے شیخ موصوف نے میرے بیان کو خلاف واقعہ تصور کرتے ہوئے یہ دونوں نام حذف کر دیے اور متعلقہ عبارت میں بھی حسب ضرورت ترمیم فرما دی۔ "تین نئے مکتوب الیہ" اور "تین خطوں کے تین نئے مکتوب الیہ" میں جو فرق ہے وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا اور ان کی اس نافہمی نے راقم کے مقصود و مطلوب پر حرف غلط کی طرح سیاہی پھیر دی۔

نواب رضا علی خاں فرماں روائے رام پور نہ صرف موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ جو پارسی تھیٹر کے اپنے زمانے کے ممتاز اداکاروں میں سے تھے، ان کے مصاحبین میں شامل تھے۔ نواب صاحب نے ان کی نگرانی میں سرکاری کتب خانے کے لیے آغا حشر کے ڈراموں کی نقلیں تیار کرائیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے یقیناً معتبر و مستند ہوں گی، لیکن جب انھیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو نواب صاحب نے یہ ضروری خیال فرمایا کہ اپنے حق استادی کا استعمال کر کے ان کی خامیاں دور فرما دیں۔ چناں چہ جہاں جہاں انھوں نے مناسب سمجھا، اصل متن میں رد و بدل کر دیا۔ غنیمت یہ ہے کہ شائع شدہ ڈراموں کے سرورق پر یا مقدمے میں ان کی شان استادی نمایاں کرنے کی غرض سے اعلیٰ حضرت کی ان استادانہ کاوشوں کی طرف اشارے کر دیے گئے ہیں ورنہ پڑھنے والوں کے لیے یہ اور کرنا دشوار ہو جاتا کہ فلاں ڈرامے کا فلاں حصہ یا فلاں مکالمہ یا فلاں گانا آغا حشر کی تصنیف نہیں۔ "یہودی کی لڑکی" کا مقدمہ اس سلسلے میں حسب ذیل معلومات فراہم کرتا ہے۔

"شیکسپیر ہند آغا حشر مرحوم کے ڈراموں میں مشرقی ستارہ (یہودی کی لڑکی) سب سے تاباں و روشن ڈرامہ ہے۔ قابل مصنف نے اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے سارا زور قلم ختم کر دیا ہے　　لیکن دوربین نگاہیں ہی یہ جانتی ہیں کہ اس ڈرامے میں فسانے کے تین حصوں میں سے صرف درمیانی حصہ پیش کیا گیا ہے اور پہلا اور آخری حصہ اس میں نہیں ہے۔ چناں چہ اس تکمیل کے بعد مصنف کو فسانے کا دوسرا (کذا = تیسرا) اور آخری حصہ "شیر کی گرج" کے نام سے تصنیف کرنا پڑا جو منظر عام پر آ چکا ہے لیکن پہلے حصے کو مصنف اپنی مصروفیت و موت کی جلد بازی سے لکھنے نہ پایا اگر چہ ڈرامے کا پہلا حصہ ہمیشہ طویل ہوا کرتا ہے مگر اعلیٰ حضرت حضور پر نور نے اپنی خداداد ذہانت و بلند خیالی سے صرف ایک ڈراپ اور چند سین بڑھا کر فسانے کی تکمیل فرما دی اور صرف یہ اضافہ ہی نہیں فرمایا بلکہ ڈرامے میں بھی جا بجا اصلاح و اضافے فرما کر ایک نئی روح پھونک دی۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہو گا کہ مشرقی ستارہ ملک کے موجودہ آسمان ادب پر اب مشرقی ستارہ کہے جانے کا مستحق ہو گیا ہے۔

اس ڈرامے میں افسانوی ترمیم کے ماسوا بہت سے گانوں اور قصوں کا بھی اضافہ ہوا ہے جن میں کہ اکثر خود اعلیٰ حضرت کی تصنیف لطیف ہیں اور یہ ساری موسیقی ہندستانی اداکاریوں کا رنگین مرقع ہے۔"

"بولا سنگل" "عرف" "جگت سور داس" میں ضروری ترمیمات کے جو چار چاند لگائے گئے ہیں ان کے بارے میں اسٹیٹ پریس کے مہتمم کا یہ اعلان بھی تحقیقی متن سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے خاصا سامان بصیرت رکھتا ہے:

"یہ مشہور تماشا آغا حشر صاحب مرحوم کاشمیری کی جدت طبع کا بہترین نمونہ تھا، جس میں ہمارے اعلیٰ حضرت کی ذات بابرکات حیول اور جدت ادا دوربین نظر نے ضروری ترمیمات کے چار چاند لگا کر ایک تازہ روح پھونک دی ہے۔ ترمیمات اور اصلاح نے جو کیے گئے ہیں

تماشے ہوبا“ اور دل کش بنانے کے لیے نہایت ضروری تھے۔ ان کی وجہ سے آغا صاحب مرحوم کی تصنیف میں ایک پرلطف اور قابل اعتنا تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اب یہ تماشا الگ نیا تماشا بن گیا ہے“۔

بعض صورتوں میں ناشرین کتب کے درمیان ناجائز مسابقت بھی تحریف متن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چناں چہ جب کسی کتاب کو اس کے موضوع یا اسلوب کی بنا پر غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی طباعت و اشاعت ایک منفعت بخش کاروبار کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ نتیجے کے طور پر جہاں اس کے خوب صورت اور دیدہ زیب ایڈیشن سامنے آتے ہیں، وہیں سستے اور سہل الحصول ایڈیشنوں کی اشاعت بھی عام ہو جاتی ہے۔ ان دونوں ہی صورتوں میں عملاً ہوتا یہ ہے کہ صحت متن کو پس پشت ڈال کر تمام تر توجہات یا تو کتاب کے حسن ظاہری پر مرکوز کر دی جاتی ہیں یا جز رسی اور کفایت شعاری کی نذر ہو جاتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ متن کی اصل شکل و صورت مسخ ہونے لگتی ہے اور بہت سے الفاظ فقرے اور جملے وقتاً فوقتاً رد و بدل اختیار کر کے ناشر کی منشا کے مطابق صورت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرزا رجب علی بیگ سرور کے شاہ کار ”فسانۂ عجائب“ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب اس کتاب کی شہرت و مقبولیت عام ہوئی اور ناشرین کتب کے درمیان اس کی اشاعت کے لیے مسابقت کا آغاز ہوا تو متن کی اس تحریف کا دروازہ خود بخود کھل گیا جو اس قسم کے حالات میں غیر متوقع نہیں ہوتی۔ کتاب کے ایک خاص ایڈیشن کے خاتمے میں خود سرور نے اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے

یہ سلسلہ اور بدر دگواروں نے بھی طبع کیا۔ لا پہ طرز زمانہ کہ ایک حال پر نہیں رہتا، کم و بیش ہو گیا۔ جو فقرہ نہ پڑھا گیا، وہ اپنے طور پر گڑھ لیا اس کی صحت و غلطی میں بہت کدوکاوش از حد ہوئی ہے“

آغا حشر بنیادی طور پر اسٹیج کے فن کار تھے۔ ان کے ڈرامے ان کے لیے اظہار فن کے وسیلے سے زیادہ حصول معاش کا ایک مستقل ذریعہ تھے، اس لیے انھیں ان کی طباعت و اشاعت سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ چناں چہ اردو کے پہلے ڈرامے ”آفتاب محبت“ اور ایک ہندی ڈرامے ”سیتا بن باس“ کے علاوہ ان کا کوئی ڈراما ان کی مرضی یا اجازت سے شائع نہیں ہوا۔ ڈراموں کے جو مطبوعہ ایڈیشن دست یاب ہیں، ان کا تمام مواد ثانوی ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اور اس میں بڑا حصہ ان اداکاروں کا ہے جنھیں اپنے کردار ادا کرنے کے لیے چھوٹے بڑے تمام مکالمے زبانی یاد رکھنے پڑتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں صحت متن کا لحاظ رکھنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ناشرین کی نظر میں اپنے تجارتی مقاصد کی تکمیل بہر حال اس سے زیادہ اہم تھی۔ نتیجے کے طور پر جو ہونا چاہیے تھا، وہ ہو کر رہا۔ ان ڈراموں کے متداول متون اپنی اصل سے کس حد تک مختلف ہیں، اس کا اندازہ ”رستم سہراب“ کے ایک مکالمے کی دو مختلف روایتوں سے لگایا جا سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں

(الف) ”آفتاب کی سنہری کرنوں کے ساتھ چاروں طرف خوب صورتی اور رنگینی بکھری ہوئی ہے۔ پرندوں کے ترانوں پر ہوائیں رقص کر رہی ہیں۔ وہیں پر صبح کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور بلبل کے نغموں کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگل قدرت کا بنایا ہوا ایک شعر اور یہ سرخ، زرد پھول اس شعر کے حسین استعارے ہیں“۔

(ب) ”آفتاب کی سنہری کرنوں کے ساتھ چاروں طرف خوب صورتی اور رنگینی بکھری ہوئی ہے۔ پرندوں کے ترانوں پر ہوائیں موسیقی رقص کر رہی ہے۔ وہیں پر صبح کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور بلبل کے نغموں کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگل قدرت کا بنایا ہوا ایک شعر، یہ بلند پہاڑ اس شعر کا مضمون، یہ بہتے ہوئے چشمے اس شعر کی روانی اور یہ سرخ، سبز، زرد پھول اس شعر کے حسین ستعارے ہیں“۔

تحریف متن کی یہ تمام صورتیں اور ان کے علاوہ جو اور صورتیں ہو سکتی ہیں، ان کی خطرناکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ

عام حالات میں معتبر خارجی شواہد کے بغیر محض غور و فکر اور تجربے یا قیاس کی بنیاد پر ان کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ اگر کسی کتاب کا کوئی معتبر مطبوعہ نسخہ پیشِ نظر نہ ہو یا غیر مطبوعہ ہونے کی صورت میں ایک ہی قلمی نسخہ دست یاب ہے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ مرتب، ناشر یا ناقل نے پیشِ نظر متن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور وہ کس حد تک قابلِ اعتبار ہے۔ تسامحات یعنی اتفاقی یا غیر ارادی تبدیلیوں کا معاملہ اس سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اگر مرتبِ متن لسانی ارتقا کے مختلف مراحل، املا اور انشا کی عہد بہ عہد روایات اور کاتبوں کی کم سوادی و ناپختہ کاری کے نوع بہ نوع مظاہر سے پوری طرح واقف ہے (اور مرتبِ متن کے لیے یہ واقفیت بے حد ضروری ہے) اور جلد بازی و سہل پسندی کا عادی نہیں بلکہ ایک ایک نقطے، ایک ایک جملے اور ایک ایک پیرا گراف پر غور و فکر کو ضروری خیال کرتا ہے تو بہ یک نظر یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ زیرِ ترتیب متن کہاں کہاں اور کس حد تک مجروح ہے اور منشائے مصنف سے اس انحراف کا سبب اور نوعیت کیا ہے۔ اس قسم کے تغیرات میں بالعموم مندرجہ ذیل عوامل کار فرما نظر آتے ہیں۔

مکتوبی مماثلت:

فارسی اور اردو کی بیش تر مشرقی زبانوں کی کتابیں کتابت اور نقل در نقل کے مختلف مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچی ہیں۔ اپنے اس سست رفتار سفر میں جو بعض اوقات کئی کئی صدیوں تک جاری رہا ہے، انھیں اچھے اور برے ہر قسم کے دن دیکھنا پڑے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستانِ سعدی، دیوانِ حافظ اور اسی قبیل کی بعض دوسری مشہور و مقبول کتابوں کے خاص اہتمام سے تیار کیے گئے خوش خط اور مطلا و مذہب قلمی نسخے اور عام قارئین کے لیے روا روی میں لکھے گئے سادہ و کم رو مخطوطات اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مستثنیات سے قطعِ نظر ان دونوں ہی صورتوں میں رسم الخط اور املا کی بعض پیچیدگیوں مثلاً اعراب بالحروف کی روایت، نقطوں کے انضباط اور شوشوں کے تعین میں حد درجہ بے احتیاطی کی روش، کاف اور گاف و یائے معروف و یائے مجہول میں امتیاز کا فقدان اور ان سب پر مستزاد کاتبوں کی کم سوادی اور جلد بازی نے وہ گل کھلائے ہیں کہ ان کارگزاریوں کو دیکھ کر بعض اوقات عقل حیران رہ جاتی ہے۔ چناں چہ اس قسم کی مثالیں عام طور پر مل جاتی ہیں کہ شعر یا جملے کے کسی ایک لفظ کو روا روی میں یا غلط فہمی کی بنا پر بہ اعتبارِ کتابت اس سے مماثل کسی لفظ سے بدل کر پڑھا گیا اور اگلے ایک دو لفظوں میں اسی مناسبت سے جزوی تبدیلی کر کے جملے یا شعر کی ساخت درست کر دی گئی۔ میر حسن علی تجلی کا مندرجہ ذیل شعر جو قدرت اللہ شوق کے تذکرے "طبقات الشعرا" کے نسخۂ مطبوعہ (مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی) سے منقول ہے اسی ذیل میں آتا ہے:

کہاں تک گریہ، بس روتی سحر تک		گلی کوٹھوں میں پاتے ہیں کمر تک

قیاس کے مطابق شعر کی اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے:

کہاں تک گریہ، بس روئے سحر تک		گلی کوچوں میں پانی ہے کمر تک

مصرعِ اول میں "روتی" اور "روئے" کے درمیان التباس یائے معروف و یائے مجہول میں عدمِ تفریق کی وجہ سے پیدا ہوا۔ دوسرے مصرعے میں "کوچوں" کے جزوِ آخر "چوں" کو نقطوں کی عدم موجودگی میں "ٹھوں" پڑھا گیا، اس کے بعد "پانی" کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی۔ چناں چہ وہ "پاتے" بن گیا اور "ہے" کو سہوِ کتابت پر محمول کر کے "ہیں" سے بدل دیا گیا۔ اس طرح شعر کی ہیئت مکمل طور پر تبدیل ہو گئی اور اس کا ظاہر و باطن دونوں منشائے مصنف کے خلاف ہو گئے۔

محمد شاکر ناجی کا ایک شعر "دیوانِ ناجی" مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق میں اس طرح منقول ہے:

شعر ہے، اور معلوم ہوتا ہے رشید حسن خاں کے مرتبہ ایڈیشن میں پہلی بار اور اس کے بعد انجمن کی مرتبہ ''کلاسکی ادب کی فرہنگ'' میں دوسری مرتبہ یہ لفظ اپنے صحیح املا اور اعراب کے ساتھ ضبطِ تحریر میں آیا ہے۔

''بہبا'' کے معنی گستاخ، بیباک اور شوخ و شنگ کے ہیں۔ قاضی عبدالودود مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اردو میں یہ لفظ صرف سات یا آٹھ بار استعمال ہوا ہے۔ اس غرابت کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر کاتبوں نے اور ان کے اتباع میں مرتبینِ متن نے بھی اس کے نقل کرنے میں غلطی کی ہے۔ چناں چہ تذکرۂ گلشنِ ہند (طبع ثانی مطبوعہ ۱۹۰۶ء ص ۲۹) اور تذکرۂ شورش مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی (ص ۸۸) میں خواجہ اہل الدین اہل عظیم آبادی کے مصرعے 'یہ طفلِ اشک میرا عاشقی میں بہبا نکلا' میں اسے ''بے بہا'' لکھا گیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے ''دو تذکرے'' کے لیے تذکرۂ شورش کے اپنے تیار کردہ متن میں ان دونوں تذکروں کے مرتبین کے برخلاف اسے ''بہ نیا'' یعنی ''بہ'' اور ''نیا'' دو علاحدہ علاحدہ لفظوں کی صورت میں نقل کیا ہے (جلد ۱، ص ۲۱۰)۔ کربل کتھا (مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد) میں اگرچہ متن میں اسے اس کی اصل کے مطابق ''بہبا'' ہی لکھا گیا ہے (ص ۲۱۰) لیکن حاشیے میں اسے ''بہبا'' سے مشتق اسم صفت بتایا گیا ہے اور فہرستِ الفاظ ''مصطلحۂ قدیم'' میں ہائے ہوز کو دونوں جگہ ہائے مخلوط سے بدل کر اس کی مرجح صورت ''بھبھا'' قرار دی گئی ہے جو صریحاً غلط ہے اور وزنِ شعر کے اعتبار سے بھی قابلِ قبول نہیں۔ بعض دوسری کتابوں مثلاً تذکرۂ گلزارِ ابراہیم مرتبہ کلیم الدین احمد اور کربل کتھا مرتبہ خواجہ احمد فاروقی کی بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔

''لگونہا'' کے معنی خوش نما، دیدہ زیب اور دل فریب کے ہیں۔ اردو کے معروف مصنفین میں سے ہمارے علم کی حد تک سے صرف میر تقی میر، قائم چاند پوری اور شیر علی افسوس نے استعمال کیا ہے۔ میر کے جس شعر میں یہ لفظ آیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے۔

حیرت زدہ کسی کی یہ آنکھ ہے لگونہیں　　　　مت بیٹھو آرسی کے ہر لحظہ رو بہ رو تم

شعر کی یہ قرأت دیوانِ دوم کے مخطوطہ بنارس پر مبنی ہے جو میر صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ کلب علی خاں فائق رام پوری کے مرتبہ نسخے میں جسے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے اسے بہ صورتِ ذیل نقل کیا گیا ہے۔

حیرت زدہ کسی کی یہ آنکھ سی لگے ہے　　　　مت بیٹھو آرسی کے ہر لحظہ رو بہ رو تم

افسوس کے یہاں یہ ''آرائشِ محفل'' میں دو بار اپنی اصل صورت میں اور دو بار محرف شکلوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے تین مقامات پر جمعیت کے ربط آخر میں نون کے اضافے کے ساتھ یعنی ''لگونہاں'' (=لگونہی) اور ''لگونہیں'' (=لگونہے) لکھا ہے۔ قائم چاند پوری نے اسے اپنی غزلوں کے دو اشعار میں استعمال کیا ہے۔ مجلسِ ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۵ء میں شائع شدہ کلیاتِ قائم کی جلد اول میں اسے ان دونوں مقامات پر دو حصوں میں تقسیم کرکے ''لگوں ہیں'' لکھا ہے اور اختلافِ نسخ کے ذیل میں ایک جگہ سے ''لاکھوں ہی'' کی مسخ شدہ شکل بتایا گیا ہے۔

''طیغورس'' پہلی بار یوپی بورڈ کی انٹرمیڈیٹ کے لیے منظور شدہ نصابی کتاب ''ادبی پارے'' (حصہ نثر) میں شامل سرسید کے ایک مضمون ''تہذیب الاخلاق کی ادبی خدمات'' میں راقم السطور کی نظر سے گزرا تھا۔ عبارت جس میں یہ لفظ آیا ہے حسبِ ذیل ہے:

'یونانی زبان سے جو علم طب عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ اگر کوئی طیغورس ہو تو وہ خود اس کو تسلیم کرے گا۔'

کتاب میں تحریر کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اسے ''طیغورس'' (ط ی غ و ر س) کی بجائے ''یغورس'' (ی غ و ر س) بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ چناں چہ پڑھانے والے اس کا تلفظ ''یغورس'' (ی غ و ر س) ہی کرتے تھے۔ جہاں تک معنی کا تعلق ہے یہ معتبر اور ے

پہلے عرض کیا جا چکا ہے روزمرہ کے لیے قواعد کی پابندی ضروری نہیں، اس لیے یہاں "آ ے" کا استعمال بالکل درست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان کے تمام معتبر مطبوعہ نسخوں میں اسے یاے مجہول کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس کے برخلاف عام ایڈیشنوں میں "آئی" کو ترجیح دی گئی ہے حالانکہ اس صورت میں یہ مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے لیکن کاتب اور اشاعت کتب سے وابستہ افراد اور ادارے بالعموم اس قسم کی باریکیوں پر نظر نہیں رکھتے۔

محاورات کی مثال میں عورتوں کے ساتھ مخصوص ایک قدیم محاورہ "اچھوں مرادوں سے پالنا" پیش کیا جا سکتا ہے جو اب تک کسی لغت میں راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ معروف ادبی کتابوں میں بھی یہ غالباً صرف "کربل کتھا" میں ایک بار استعمال ہوا ہے۔ اس کتاب کے مرتبین کو بربنائے غرابت اس کی ہیئت اصلی کے تعین میں جو ناکامی ہوئی ہے وہ مندرجہ ذیل شعر سے ظاہر ہے

تجھ کو پاتی تھی دکھیا اے بچے ہائے کن الچھوں کن مرادوں سے

مصرع اول میں "پالی" کا "پاتی" سے اور مصرع ثانی میں "اچھوں" (ای چھوں) کا "ال چھوں" سے بدل جانا مرتبین کی اصل محاورے سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ متن کتاب کے بعد "فہرست الفاظ مستعملہ قدیم" میں "الچھوں" کے وہ معنی "پہ" کا اندراج کر کے انھوں نے اپنی اس غلطی کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ "کربل کتھا" کے قدیم الفاظ سے بحث کرنے والے بعض دوسرے حضرات نے بھی اسی منفرد شکل (پہ) میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی اصل بظاہر ہندی کا معروف لفظ "اچھا" ہے جو بہ شکل جمع "اچھاؤں" سے بتدریج "اچھوں" اور "اچھوں" بن کر عورتوں کی زبان میں رائج ہو گیا۔

املا و انشا کی روایات سے بے خبری:

زبان ایک نمو پذیر وسیلۂ اظہار ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنا رنگ اور اپنے انداز بدلتی رہتی ہے۔ ادب کا ان تبدیلیوں سے متاثر ہونا ایک بدیہی امر ہے چناں چہ ادبی تاریخ کے ہر عہد کی پہچان اس کی مخصوص لفظیات اور اظہار کے مخصوص پیرایوں سے ہوتی ہے۔ کسی قدیم ادب پارے کی نقل، کتابت یا تدوین کے دوران اگر اس پہلو کو مد نظر نہ رکھا جائے تو متن میں مختلف النوع تغیرات کی راہیں از خود ہموار ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ مرزا غالب "یہاں" اور "وہاں" (بروزن جہاں) کی بہ نسبت ہائے ملفوظ کے ساتھ "یہاں" اور "وہاں" (بروزن جاں) کے استعمال کو فصیح تر سمجھتے تھے۔ ان کے پیش روؤں میں خواجہ میر درد کے یہاں بھی یہ لفظ اکثر ہائے ملفوظ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کلیے سے استثنا کی صرف دو تین مثالیں ملتی ہیں لیکن ان کا متن معتبر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے عہد تک جن شعرا کے یہاں یہ دونوں لفظ "جاں" کے وزن پر استعمال ہوئے ہیں، وہاں ان کا املا ہائے ملفوظ کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ اس کے برخلاف جو لوگ غالب اور ان کے معاصر یا پیش رو شعرا کے کلام میں انھیں ہائے ملفوظ کے بغیر یعنی "یاں" اور "واں" لکھتے ہیں، وہ منشائے مصنف سے انحراف کے مرتکب ہوتے ہیں کیوں کہ اس طرح یہ الفاظ باعتبار تلفظ اپنی اس شناخت سے محروم ہو جاتے ہیں جو املائی سطح پر صوتی تغیرات کی تاریخ میں ایک خاص دور کی علامت تصور کی جاتی ہے۔ مولانا حالی نے غالباً اسی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے "یادگار غالب" میں یہ حتمی فیصلہ دیا تھا کہ کلام غالب سے منقول اشعار میں جہاں کہیں یہ دونوں لفظ آئے ہیں وہاں انھیں ہائے ملفوظ کے بغیر یعنی عام لوگوں کی روش کے مطابق "یاں" "واں" لکھا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں ان کا املا کہیں ہائے ملفوظ کے ساتھ اور کہیں ہائے ملفوظ کے بغیر لکھا گیا ہے لیکن

(شعر نمبر ۴۴)	شکیب و صبر تو جام رمیدہ	دو خواری بیہودہ سخن کشیدہ
(شعر نمبر ۵۲)	چو شد مدت پیا کے ساتھ رہتے	سخن با یک دگر کہتے و سنتے
(شعر نمبر ۵۵)	بکٹ قصہ ہے پٹ مشکل کہانی	دوانی کی سنو سکھو! کہانی

یہ تینوں شعر "بکٹ کہانی" مرتبہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی و پروفیسر مسعود حسین خاں کے تیسرے اور چوتھے ایڈیشنوں مطبوعہ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۶ء میں بعینہ اسی طرح منقول ہیں۔ مرتبین نے اس مثنوی کا متن دس قلمی نسخوں کی مدد سے تیار کیا ہے۔ آخر میں "متن بکٹ کہانی" کے عنوان سے ان نسخوں کے اختلافات بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ اس حصۂ کتاب کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اور تیسرے شعر میں ان نسخوں کے درمیاں میں متن کا کوئی اختلاف موجود نہیں۔ لیکن یہ اطلاع کس حد تک صحیح ہے یہ کہنا مشکل ہے کیوں کہ ان دونوں شعروں کے دوسرے مصرعوں کے قوافی درست نہیں اور یہ سقم اتنا واضح ہے کہ اس کا دس کے دس کاتبوں کی نظر سے اوجھل رہ جانا بہ ظاہر ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ مبادیات شاعری اور لغت سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص بہ یک نظر اندازہ کر سکتا ہے کہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کا قافیہ "کشیدہ" کی بجائے "کشودہ" ہونا چاہیے۔ اصول قافیہ کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی یہ مصرع "کشودہ" ہی کا متقاضی ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر کے مصرع ثانی میں قافیے کی تکرار بھی خلاف قاعدہ ہے۔ اس کا مناسب ترین متبادل "دوانی" ہو سکتا ہے۔ بہ ظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ غلطیاں طباعت کے لیے متن کی تیاری کے کسی مرحلے میں ان اشعار میں داخل ہو گئی ہیں اور فاضل مرتبین بے خیالی یا عجلت کے باعث ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دے پائے ہیں۔ دوسرے شعر کا معاملہ ان دونوں شعروں سے قدرے مختلف ہے۔ مرتبین کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق دس قلمی نسخوں میں سے دو کے کاتبوں نے اس کے مصرع ثانی میں "سنتے" کو "کہتے" پر مقدم رکھا ہے یعنی ان کے یہاں قافیہ "سنتے" نہیں "کہتے" ہے۔ ان دو نسخوں میں سے ایک (مخزونہ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد؛ مکتوبہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء) اس مثنوی کا قدیم ترین اور اہم ترین نسخہ ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اصول قافیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نسخے کے اندراج کو شامل متن کر دیا جاتا کیوں کہ یہی منشائے مصنف کے مطابق معلوم ہوتا ہے لیکن مرتبین کے نزدیک غالباً راویوں کی اکثریت زیادہ قابل لحاظ تھی اس لیے انھوں نے تدوین متن کے اس بنیادی نکتے کو نظر انداز کر دیا۔

شہرت عام:

جب کوئی سرگزشت کہانی بن جاتی ہے تو اکثر وہ اپنی اصل سے دور ہو جایا کرتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ان اشعار اور مقولوں کے ساتھ بھی پیش آتا ہے جو شہرت عام کا شرف حاصل کر کے زبان زد ہو جاتے ہیں۔ کسی شعر یا مقولے کے ضرب المثل بن جانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے دروبست کے لحاظ سے سہل ممتنع کے درجے پر پہنچا ہوا ہو اور معنوی اعتبار سے بھی نہایت بلیغ اور ذہن و فکر کو متاثر کرنے والا ہو۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شعر یا قول بیان کی کسی خامی یا جھول کے باوجود محض اپنی بلاغت و معنویت کی بنا پر اس طرح روزمرہ کی گفتگو اور مکالمے کا حصہ بن جاتا ہے کہ عوام و خواص بھی اسے بلا تکلف استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ایسے اشعار کی اس طرح پذیرائی ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ اس کی ہیئت ظاہری میں اتنی تبدیلیاں آ جاتی ہیں کہ رائج الوقت صورت اپنی اصل سے کافی مختلف ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی غیر ارادی اور غیر محسوس تبدیلی ہیئت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

یاد گار زمانہ ہیں ہم لوگ   یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

طرز بیدل میں ریختہ کہنا	اسد اللہ خاں قیامت ہے
پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے	حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
بھاگ ان بردہ فروشوں سے ، کہاں کے بھائی	بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر پائیں
خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال	کہ آگ لینے کو جائیں ، پیمبری مل جائے
ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد	وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا
بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر	یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

پہلا شعر مصحفی کے شاگرد نواب سلام خطر لکھنوی کا ہے۔ اصل شعر کے مصرع ثانی کا جزو اول "سن رکھو تم" ہے ، "یاد رکھنا" نہیں۔ رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" کا آغاز اسی شعر سے کیا ہے اور اصل متن سے اس کی مطابقت برقرار رکھی ہے۔ فسانۂ عجائب" کے وسیلے سے جب اس شعر کو شہرت عام حاصل ہوئی تو رفتہ رفتہ اس نے وہ صورت اختیار کرلی جو سطور بالا میں پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ مرزا غالب ہرگوپال تفتہ کے نام ۲۴ / جون ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

' رجب علی بیگ سرور نے جو فسانۂ عجائب" لکھا ہے آغاز داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ　　　　یاد رکھنا ، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور 'یاد رکھنا' فسانہ کے واسطے کتنا مناسب"۔

غالب نے دوسری بار اس شعر کو میر سرفراز حسین کے نام کے مکتوب نمبر ۲ میں نقل کیا ہے۔ یہاں بھی اس کی وہی شکل ہے جو تفتہ کے نام کے خط میں ملتی ہے۔ عام طور پر یہ شعر اسی طرح مشہور ہے۔

غالب کا مقطع تحریر و تقریر میں بالعموم اسی طرح نقل ہوتا رہا ہے لیکن مولانا عبدالرزاق شاکر میرٹھی کے نام کے ایک خط میں خود غالب کے نقل کردہ متن کے مطابق اس کے مصرع اولیٰ کا آخری لفظ "لکھنا" ہے "کہنا" نہیں۔ مولانا عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان غالب کی اشاعت اول میں شاکر کے نام کے اسی خط کے حوالے سے اسے تین جگہ نقل فرمایا تھا' ایک جگہ مقدمے میں اور دو جگہ اصل متن میں۔ ان میں سے متن میں ایک جگہ" ریختہ لکھنا" اور باقی دونوں مقامات پر" ریختہ کہنا" لکھا تھا لیکن "ریختہ لکھنا" کے ساتھ منقول شعر کے حاشیے سے غلط نامے میں یہ ہدایت موجود تھی کہ" جس سطر میں یہ شعر آیا ہے اسے اس سے پہلے کی سطر کے ساتھ یہاں سے قلم زد کر دیا جائے"۔ اس طرح مقدمہ مرتب میں ایک جگہ اور ایک جگہ متن میں" ریختہ کہنا" برقرار رہا۔ اشاعت ثانی میں بھی یہی دونوں اندراجات پائے جاتے ہیں۔ اصل ماخذ کے حوالے کے باوجود شہرت عام کے زیر اثر عرشی صاحب جیسے محتاط محقق کی تحریر میں غلط متن کا در آنا اس امر کی دلیل ہے کہ ضرب المثل بن جانے والے اشعار کا اپنی اصل صورت پر برقرار رہنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر شیخ محمد ابراہیم ذوق کا ہے۔ اس کا اصل مصرع اولیٰ "کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے" تھا۔ مضمون کے لحاظ سے اس شعر میں ضرب المثل بن جانے کی پوری صلاحیت موجود تھی لیکن پہلا مصرع اپنی بندش کے اعتبار سے چست اور درست اور رواں دواں نہ تھا۔ عوام نے جو ہر وں کے سب سے بڑے پارکھ اور مزاج شناس ہوتے ہیں' اسے اس طرح خراد پر چڑھایا کہ اس کی موجودہ شکل نکل آئی جو اصل شکل کے مقابلے میں زیادہ موثر اور دلکش ہے۔

چوتھا شعر میر سوز کا ہے۔ یہ جس غزل سے تعلق رکھتا ہے اس کے قوافی 'گہر' اور 'ساغر' وغیرہ اور ردیف 'ہوئے' ہے۔ مصرع

رشید صاحب نے اس رائے کا اظہار غالب سے متعلق اپنے ایک مضمون میں فرمایا ہے جو "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" کے عنوان سے پروفیسر مختار الدین احمد کے مرتبہ مجموعۂ مضامین "نقدِ غالب" میں شامل ہے۔ ان کے بعض دوسرے اقوال کی طرح یہ قول بھی اس قدر مشہور ہو کر اس نے ایک کہاوت کی حیثیت حاصل کر لی، لیکن انھوں نے جو کچھ کہا تھا، اس کی اصل شکل یہ تھی:

مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل۔[51]"

متذکرہ صدر تحریروں میں اس قول کے مندرجات جن مختلف صورتوں میں نقل ہوئے ہیں وہ منشائے مصنف سے لفظاً ہی نہیں بعض اعتبار سے معناً بھی مختلف ہیں۔ رشید صاحب نے غالب کے بعد اردو کو مغلیہ سلطنت کی دوسری بڑی دین قرار دیا تھا، [illegible] نے اس منصب سے معزول کر کے اقبال کو اس پر فائز کر دیا۔ شمیم صاحب نے رشید صاحب کی قائم کی ہوئی ترتیب ہی نہیں بدلی، جزوی طور پر اس کی نوعیت بھی بدل دی۔ رشید صاحب نے اس فہرست میں ترجیحی طور پر غالب کو بہ حیثیت کل سب سے پہلے جگہ دی تھی، شمیم صاحب نے تیسرے مقام پر پہنچا دیا اور اس کی مجموعی شخصیت کو نظر انداز کر کے فضیلت کی یہ دستار اس کے اردو دیوان کے سر باندھ دی۔ اردو جو رشید صاحب کے اس تعین میں دوسرے مقام پر تھی، پہلے مقام پر آ گئی اور تاج محل جسے تیسرے نمبر پر رکھا گیا تھا، دوسرا نمبر پا کر غالب پر سبقت لے گیا۔ دوسری صاحب کے ہاں صرف اجزائے بیان کی ترتیب بدلی ہے، ان میں کوئی معنوی تغیر نہیں ہوا، لیکن اصل سے انحراف خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اصولاً غلط ہے، اس لیے اس تبدیلی سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مثال سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ شہرتِ عام اور حافظے کی فریب کاری میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اشعار یا اقوال کسی معتبر ماخذ کی پشت پناہی کے بغیر محض متواتر شہرت و بزرگوں کی روایت کے وسیلے سے ہم تک پہنچے ہیں، تحقیق انھیں ماننے کے قابل اعتماد ادبی ورثے کے طور پر قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہے۔

مزید غور کیا جائے تو اس موضوع سے متعلق بحث کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آ سکتے ہیں لیکن اب تک جو مثالیں پیش کی جا چکی ہیں، وہ اس موقف کی وضاحت اور تائید کے لیے کافی ہیں کہ تدوینِ متن نہایت صبر آزما اور وقت طلب کام ہے۔ جو لوگ فطری طور پر محنت کے عادی نہیں اور درستی کو تحقیق کا جزوِ لاینفک نہیں سمجھتے، وہ اس قسم کے کاموں کی ذمے داری قبول کر کے اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ہی ضائع نہیں کرتے، ادب کے سنجیدہ اور باشعور طالب علموں کے لیے نئے نئے مسائل بھی پیدا کرتے رہتے ہیں، کیوں کہ مجروح اور نامعتبر متن کی بنیاد پر صرف ہوائی قلعے تعمیر کیے جا سکتے ہیں، بامعنی اور نتیجہ خیز تنقید و تحقیق کا فروغ ممکن نہیں۔ ناسخ کے کلیات میں رشک کے دخلِ بے جا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یہ رشک ہی تھے جن کے لسانی اختیارات خود انھی کے حوالے سے ناسخ کی طرف منسوب ہوئے اور وہ اصلاحِ زبان کی باقاعدہ تحریک کے بانی قرار پائے۔ رفتہ رفتہ اس روایت نے ہماری ادبی تاریخ میں اس طرح قدم جما لیے کہ حقیقت و قدر کے انکشاف کے بعد خود بھی پیرِ تسمہ پا کی طرح ناقدینِ ادب کی گلو خلاصی کے لیے تیار نہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تدوینِ متن سے معاملے میں دست درازی یا بے احتیاطی کا مظاہرہ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو کتنے دور رس اور دیرپا اثرات کا حامل ہوتا ہے۔

حواشی

۱۔ ہند کرے، مرتبہ کلیم الدین احمد، جلد دوم، پٹنہ، ۱۹۶۲ء، ص ۴
۲۔ تذکرۂ شورش، مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی، لکھنؤ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۶
۳۔ حقائق ارباب الرأی، مجلہ حیدرآباد، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰۲
۴۔ تذکرۂ شعرائے اردو، طبع جدید، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۱۹۵
۵۔ ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی، شمارہ ۷ تا ۱۶ دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۴
۶۔ مشرقی ستارہ، عرف جودی کی لاڑکی، رامپور، ۱۹۳۵ء، ص ۴
۷۔ بلوہمنگل عرف بھگت سورداس، کانے کی کتاب مع خلاصہ تماشا، مطبوعہ انجمن پریس، رامپور، سرورق
۸۔ بہ حوالہ فسانۂ عجائب، مرتبہ رشید حسن خاں، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۵۲
۹۔ رستم سہراب، شائع کردہ ساہتیہ اکیڈمی، انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۳۴
۱۰۔ کلیات آغا حشر کاشمیری، جلد چہارم، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۲
۱۱۔ بہ حوالہ رشید حسن خاں کی زیر طبع کتاب "گنجینۂ معنی کا طلسم" سے مستعار ہے۔
۱۲۔ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، شمارہ اگست ۱۹۶۱ء، ص ۳۳
۱۳۔ غالب اور آگرہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۸۹
۱۴۔ دو دنیائیں، دو ادب، شائع کردہ مرکز الادب، نادرہ، ممبئی، ۲۰۰۷ء، ص ۳۸
۱۵۔ نقد غالب، مرتبہ مختار الدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۳۸

Abstract

This article covers an important issue of literary research about the editing of the text. Editing of text is a difficult and painstaking task. The researchers who are involved in editing but do not employ hard work and honesty, leave a lot of errors in the texts. It may cause wrong judgements and initiate false claims about the classical texts and their contents. An example of this careless attitude can be seen in the editing of Nasikh's Kuliyat-e Nasikh compiled by one of

his pupil Rashk. Rashk has stated some linguistic principles which were wrongly diverted to Nasikh and Nasikh has been considered the initiator of a linguistic reform movement. Thus the writer tried to prove here by quoting several examples that the deviation for the author's choice puts long lasting effects.

معیار ۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تاریخ شاہ جہاں پور کے مآخذ مطالعہ و تحقیق

ابو سلمان شاہجہانپوری*

شاہ جہاں پور صوبہ یو پی کا ایک اہم ضلع اور اس کا شہر ہے۔ اس کا رقبہ ساڑھے چار ہزار مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر اس ضلع کے نقشے پر شمال اور مشرق اور جنوب سے مغربی سمت میں نظر ڈالی جائے تو پیلی بھیت، کھیری، ہردوئی، فرخ آباد، بدایوں اور بریلی کے اضلاع کی سنہری زنجیر میں گھرا شمال مشرق سے جنوب مغرب میں ۱۲۰ کلومیٹر لمبا اور بالائی حصے میں کھیری اور پیلی بھیت کے بالمقابل ایک مقام پر صرف سو کلومیٹر اور ہردوئی اور بریلی کے بالمقابل ایک مقام پر ۱۲ کلومیٹر چوڑی ایک شاداب سرزمین نظر آئے گی، بس یہی شاہ جہاں پور ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا کہ کبھی یہی "میرا وطن" تھا۔

شاہ جہاں پور کی طویل تاریخ ہے جو بے شمار نشیب و فراز سے گزری ہے لیکن اس نے قدیم دور سے آزادی کی منزل تک اور اس کے بعد گزرنے والے ساٹھ برسوں میں تاریخ کے ہر دور اور ہر معرکہ حیات کی ہر آزمائش میں کامیابی سے اس کا سر فخر سے بلند رہا ہے۔

اس کا پانی شیریں، آب و ہوا معتدل اور زمین زرخیز ہے۔ اس کے موسم قدرت کی تقسیم کے عین مطابق اور خوش گوار ہیں۔ اس کی ہواؤں میں خوش بو بسی ہوتی ہے اور اس کی فضائیں محبت کے نغموں سے معمور رہیں۔ شاہ جہاں پور کی اپنی قابلِ فخر تاریخ ہے۔ اس کی اپنی تہذیب اور اپنا طرزِ تمدن ہے۔ اس میں بسنے والی اقوام کے اوصاف و خصائص میں، اخلاق و عادات میں، ذوق و مزاج میں بڑی یکسانیت اور یک رنگی ہے اور جہاں تضاد و تباین ہے اسے تحمل و مروت نے ایک دوسرے کے لیے گوارا بنا دیا ہے۔ اس کے عوام کی زبان ہمیشہ اردو رہی ہے۔ اس کی اپنی شان ہے۔ ان کے طرزِ بیان اور اسلوبِ تحریر میں ایک ندرت ہے۔ شاہ جہاں پور کی اردو، اردو ہو کر بھی نہ صرف لکھنؤ اور دہلی کی اردو سے بلکہ اپنے پڑوسی اضلاع سے بھی جدا، الگ اور الگ تھلگ اور دلکش ہے۔ شاہ جہاں پور بڑا مردم خیز شہر ہے۔ اس کی تاریخ کا ہر شعبہ حیات اور دائرہ علم و فن ناموروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے امتیازات و خصوصیات بے شمار ہیں۔ شاہ جہاں پور میں وہ سب کچھ ہے جو یہاں کے ایک باشندے کی خوشی کا موجب ہو سکتا ہے۔

شاہجہاں پور پر مختلف نوعیت کی چھوٹی بڑی ایسی تالیفات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، جو میرے علم میں اور بعض مطالعے میں آ گئیں۔ ان میں سے چند کتابیں ضمنی نوعیت کی بھی شامل ہیں۔ ان میں بیشتر تالیفات مخطوطات کی صورت میں تھیں لیکن اب شاید ان کا بھی وجود مٹ چکا ہے۔ صرف تاریخ میں ان کے نام اور خصوصیات کا تذکرہ ہی یادگار رہ گیا ہے۔

* سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی، ڈائریکٹر ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی

بہادر نامہ:

اس تالیف کا موضوع نواب بہادر خاں کے حالات ہیں اور جیسا کہ اس موضوع میں پھیلاؤ کی گنجائش ہے کہ اس میں ان کے خاندان کے افراد کے متعلق واقعات بھی درج ہوں گے چناں چہ مطیع اللہ خاں نے بعض ارکان نواب بہادر خاں کے خاندان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اس تالیف کے مصنف کا نام ڈھونڈے نہیں ملا اگرچہ میں نے مصنف کی تلاش میں کوتاہی نہیں کی پھر بھی اس کا امکان ہے کہ میری نظر ادراک سے قاصر رہی ہو! بہرحال کتاب کے تعارف کے لیے اس کے چند اقتباسات کا نقل کرنا ضروری ہے۔ جناب مطیع اللہ خاں نے بہادر نامے کو نواب بہادر خاں کی اولاد و احفاد کی تصنیفات میں شمار کیا ہے فرماتے ہیں۔

نواب بہادر خاں کی ماسوری تذکرہ اور وفات و وجہ وفات کے بیان میں بہادر خانی انبار و مخبر و اخبار محبت و بہادر نامہ میں جو ان کی اولاد و احفاد کی تصنیف ہے کئی ہوئی غلطیاں موجود ہیں۔ نواب مرتضیٰ خان نے بہادر خانی میں مہم قندھار ۱۰۵۸ھ، ۲۲ جلوس کا واقعہ وفات بہادر خاں ۹ جمادی الثانی سنہ مذکورہ کا ساتھ لکھا ہے اور ایسا ہی نواب احمد خاں کا بیان ہے جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ ۶

بہادر خان سے چھوٹے اور دلیر خاں سے بڑے ان کے ایک بھائی عنایت خاں تھے۔ ان کے اور ان کے بیٹوں کے بارے میں مطیع اللہ خاں مرحوم لکھتے ہیں۔

> ''عنایت خاں کے پانچ بیٹے تھے، عالم خاں، بکا ہمدر خاں، نیک نام خاں، مسعود خاں، عظمت خاں۔ ان میں سے (اول الذکر تین) امجد نواب عزیز خاں میں شاہ جہاں پور چلے آئے تھے۔ (ان) تینوں بھائیوں سے نواب عزیز خاں نے اپنی بیٹیاں بیاہ دی تھیں۔'' نیک نام خاں کے بیٹے جہاں خاں تھے، جن کو جھبو بی بی (ان کے چچا) عالم خاں کی بیٹی منسوب تھیں، جو محلہ بکسریاں کے چھوٹے قلعے میں، جو جھبو بی بی کا قلعہ بعد میں مشہور ہو گیا رہتی تھیں۔ عظمت خاں بھی آخر میں شاہ جہاں پور میں آ بسے تھے۔ ان کی اولاد شاہ جہاں پور میں موجود ہے۔'' ۷

بہادر نامہ کا حوالہ نواب مظفر خاں ابن نواب بہادر خاں کے تذکرے میں بھی آیا ہے۔ صاحب تاریخ مطیع لکھتے ہیں۔

> ''شاہ جہاں نے بعد وفات بہادر خان کے ان کو مختصر منصب پر بہ عہد خورد سالی مقرر کیا تھا۔ عہد اورنگ زیب میں جوان ہو کر قابل بجا آوری خدمات ہوئے اور [illegible] قلعہ پرینڈا کی جنگ میں کام آئے، بیان کیے ان کی زوجہ کا نام تاج بی بی تھا، جو نواب دلیر خان کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے ایک بیٹے شجاعت خاں تھے جن کے نام سے موضع شجاعت پور قریب بادشاہ نگر آباد ہے۔ ان کے لاولد انتقال کر جانے سے نسل کا خاتمہ ہو گیا۔ شجاعت خاں نے (موضع بادشاہ نگر کے پختہ باغ میں) باپ کا مقبرہ بنایا تھا، اسی میں ان کا بھی مزار ہے۔'' ۸

عبداللہ خان ابن نواب تاج الدین خاں نواب بہادر خان کے پوتے نواب دین الدین خان ابن عبرت خاں نے پوتے تھے۔

تولد از تاریخ مطیع

عبداللہ خان کی چار بیویاں تھیں، جن کے بطن سے پانچ بیٹے تھے فیض اللہ خان، مستجاب خان، معین الدین

خان، سعد اللہ خان، شہیار خان۔ بہادر نامہ میں ان کے پانچ بیٹے بیان کر کے، دو کا نام احمد خاں و عمر کی حال لکھا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھوں نے باپ سے بغاوت کی تھی اور لڑائی میں قتل ہوئے تھے مگر انہار البحر میں جو ستر برس پہلے کی تصنیف ہے اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لیے ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔
انتقل للتحو م"

اس بیان سے معلوم ہوا کہ بہادر نامہ، انہار البحر کی تالیف (۱۲۵۵ھ) کے ستر برس بعد تقریباً ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں خود میں کے کسی صاحب ذوق نے مرتب کیا تھا۔

رلا ور حان ابن نواب خان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال کابل میں ہوا تھا، لاش کو شاہجہاں پور لا کر باپ کے مقبرے میں دفن کیا گیا تھا۔ تاریخ مطیع کا بیان یہ ہے

"لاش ان کی کابل سے شاہجہاں پور لا کر ان کے والد کے مقبرے میں دفن کی گئی۔" ے

یہ بات مطیع اللہ خاں نے صرف "بہادر نامہ" کے حوالے سے لکھی ہے۔

بہادر خانی:

بہادر خانی کے مؤلف نواب مرتضیٰ خاں عرف جمعہ میاں نواب بہادر خان کے پڑپوتے نواب تاج الدین خان کے پوتے اور نواب مصطفیٰ خاں عرف حاجی میاں کے برادر خورد تھے۔

تاریخ شاہجہاں پور کے مؤلف خان بہادر مطیع اللہ خاں لکھتے ہیں۔

"نواب مرتضیٰ خاں کے قلم کا لکھا ہوا نسخہ بہادر خانی ۱۲۰۰ھ کا ہے۔ [اس میں] صرف یہ چار سطریں شاہجہاں پور کے متعلق ہیں۔

"در اواخر برائے وطن بہ حضور بادشاہ دیں پناہ عرض کردہ چند دیہات پرگنات را بنام خویش انتقاء کنانید و شہرے در انتقال بہ جانب سمت شرقی بریلی [ظاہر آباد] ساختہ بہ شاہجہاں پور گردانیدہ۔"

باقی جو کچھ ہے وہ بانی شاہجہاں پور کے کارناموں کے بیان میں ہے۔ اور لطف یہ کہ مکمل نہیں۔" ے

اسی تاریخ میں ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے

"نواب مرتضیٰ خاں (ابن فیض اللہ خاں) ذی علم و صاحب استعداد تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں بہادر خانی تصنیف کی مگر اختصار پسندی نے تاریخ شاہجہاں پور کو تاریکی سے روشنی میں لانے کی اجازت نہ دی حالانکہ اس وقت فرامین شاہی و خانگی تحریریں ضروری یادداشتیں ان کے پاس اور ان کے خاندان میں موجود تھیں اور وہ لوگ بھی زندہ تھے جن کے جدے خازن روایات رہا تھے اور مفصل تاریخ جمع کرنا نہایت آسان تھا۔

۲۱ ذی الحجہ ۱۲۲۷ھ (۱۶ دسمبر ۱۹۱۲ء، بروز دوشنبہ) کو اس دنیا سے عدم ہو گئے۔"

احمد خاں نے تاریخ کی

مرتضٰی خاں بود محوی بندہ　　　　بود نواب اعظم و اکرم
گفتم احمد چو سال تاریخش　　　　شد بجنت مقیم در یک دم

ان کی شادی نواب ذوالفقار علی خاں نبیرہ نواب محمد خاں بنگش کی بیٹی سے ہوئی تھی۔(انہارالبحر) جس کے بطن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے محمد خاں عرف جمو میاں تھے، جن کو ان کی پھوپھی زوجہ نواب اعزاز خاں شاہ آبادی نے متبنیٰ کر کے تمام املاک کا مالک کر دیا تھا۔ اس لیے شاہ آباد میں رہا کرتے تھے۔ [۱]

صاحب تاریخ صبیح نے بہادر خانی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

نواب مرتضٰی خان پسر نواب فیض اللہ خان ابن نواب عبداللہ خان کے بیٹے تھے۔ ذی علم و صاحب استعداد تھے۔ تاریخ دانی کا بہت شوق تھا۔ ۱۲۰۰ھ میں انھوں نے "بہادر خانی" لکھی مگر نہایت اختصار سے کام لیا۔ اگر وضاحت سے لکھتے تو ایک بسوط اور مفصل شاہجہاں پور کی تاریخ ہوتی۔ ۲ ذی الحجہ ۱۲۲۷ھ کو راہی ملک عدم ہوئے۔

نواب احمد خاں نے تاریخ کہی۔قطعہ

مرتضٰی خاں بود محوی بندہ　　　　بود نواب اعظم و اکرم
گفتم احمد چو سال تاریخش　　　　شد بجنت مقیم در یک دم

ان کے بڑے بیٹے محمد خاں عرف جمو میاں تھے۔ زوجہ نواب اعزاز خاں شاہ آبادی ان کی پھوپھی نے متبنیٰ کر کے اپنی کل جائیداد کا مالک بنا دیا تھا۔ اسی باعث یہ شاہ آباد میں مستقل طور سے مقیم ہو گئے تھے۔" [۲]

اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مولوی صبیح الدین نے حوالہ تو بہادر خانی کا ضرور دیا ہے لیکن مضمون "تاریخ مظفری" سے نقل کیا ہے۔

دلیر نامہ:

نواب عبداللہ خاں کی ایک تالیف کا ذکر جس کا سر عنوان نہیں تاریخ شاہ آباد موسوم بہ نامہ مظفری کے مولف منشی محمد مظفر حسین خان سیمابی نے کیا ہے۔ دلیر نامہ اس کا نام موضوع کی مناسبت سے میں نے (راقم ابو سلمان۔ش) رکھ لیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع نواب دلیر خاں کی شجاعت بتایا گیا ہے۔ صاحب نامہ مظفری لکھتے ہیں:

"دلیر خان کی شجاعت کے متعلق نواب عبداللہ خان شاہ جہاں پوری نے ایک تاریخ لکھی ہے۔"

اس کے بعد دو جملوں میں کہا گیا ہے

"اس میں تحریر کیا ہے کہ نواب دلیر خاں بڑے متین و قوی شکل کے جوان تھے۔ دو ورزش قوت میں یکتائے روزگار تھے۔"

یہ گویا کہ موضوع کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد کے جملے سے اس کی تالیف کا ... بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تاریخ انہار البحر کے حوالے سے (نواب عبداللہ خان) لکھتے ہیں۔"

اور اس سے آگے اس جملے کی تائید میں دکن کے معرکے میں ایک قلعے کی تسخیر میں قلعے کا دروازہ توڑنے کا واقعہ تحریر کیا ہے کہ کس طرح سے توپ کر فوج کے قلعے میں داخل ہو جانے کے لیے رکاوٹ دور کر دی تھی اور دیگر واقعات کے بیان سے نواب دیر خاں کی شجاعت اور طاقت پر استدلال کیا ہے۔ یہ تمام واقعات مذکورہ لطیف نامہ مظفری کی جلد اول کے صفحہ ۲۱۲ تا ۲۱۸ پر بیان کیے گئے ہیں۔

انہار البحر چوں کہ نواب احمد خاں نے ۱۲۵۵ھ میں لکھی تھی۔ اب اگر صرف یہی اس تاریخ کا ماخذ ہو تب بھی اس کا زمانہ تالیف ۱۲۵۵ھ کے بعد کا ثابت ہوتا ہے۔ ٨

اخبار محبت:

جو نواب محبت خان کی تصنیف ہے۔ وہ در اصل سلاطین تیموریہ کی تاریخوں کا اقتباس ہے۔ جس میں جستہ جستہ مختصر طور سے حالات شاہ جہاں پور بھی کسی قدر بیان کیے ہیں، مگر ان میں غلطیوں کی آمیزش زیادہ ہے۔ ٩

مولوی مسیح الدین نے اپنی تاریخ میں اس کا نام "محبت خانی" لکھا ہے۔ ١٠

انساب قبایل افغانی:

اس تالیف کو نواب محبت خان کی تالیف "اخبار محبت" کا تتمہ یا تصحیح و تفصیل سمجھنا چاہیے۔ اس کے موضوع اور خصوصیت کے بارے میں، اس کے مؤلف خان بہادر مطیع اللہ خان صاحب مرحوم فرماتے ہیں

> "نواب محبت خان ان سب قبیلوں کو افغانستان سے آ کر یہاں آباد ہوئیں۔ منتری نسل سے بتاتے ہیں جو شجرۂ انساب کے خلاف ہے مگر اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان میں اکثر منتری اور منتری میں سب سے زیادہ غوریا خیل تھے، جن کے قبایل کے نام سے دو ثلث کے قریب محلے منسوب ہیں اور ایک ثلث میں بیلی، غرغشتی، بتنی اور دوسلی ہیں۔ اگر اس کی تفصیل معلوم کرنے کا شوق ہو تو ہماری کتاب 'انساب قبایل افغانی' پر نظر ڈالو۔" ١١

چوں کہ یہ کتاب "اخبار محبت" کے شجرہ جات کی وضاحت یا تصحیح کے سلسلے میں ہے اس لیے اس حوالے کا اندراج "اخبار محبت" کے بعد ہی مناسب معلوم ہوا۔ حالاں کہ اس کتاب کا زمانہ تالیف بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں کا کوئی عرصہ ہے۔

تذکرۃ الاحباب (منظوم):

نواب محمد خاں متخلص بہ احمد نواب بہادر خاں کے پڑپوتے نواب تاج الدین خان کے پڑپوتے تھے اور نواب مصطفیٰ خاں عرف حافظ میاں (برادر خورد نواب مرتضیٰ خاں عرف جمو میاں) کے بڑے بیٹے تھے۔ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ تذکرۃ الاحباب میں فرماتے ہیں

وہ تھے شاہ اسحٰق جو دہلوی
وہ تھے میرے استاذ اور تھے ولی

نواب صاحب ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء) تک ضرور زندہ تھے۔ صاحب تاریخ مطیع نے ان کی آٹھ تالیفات نظم و نثر کا ذکر کیا ہے۔

"تذکرۃ الاحباب" ان کی آخری تصنیف گمان کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

"نواب صاحب کی تصانیف میں "مناقب ورقیہ" جو ۱۲۳۰ھ میں لکھی گئی ہے ابتدائی اور "تذکرۃ الاحباب" جو ۱۲۶۵ھ میں تالیف کیا ہے سب سے آخری تصنیف معلوم ہوتی ہے۔"

تذکرۃ الاحباب کے بارے میں مولوی مسیح الدین فرماتے ہیں:

"ان کی کتابیں غدر میں تلف ہو گئیں، صرف "تذکرۃ الاحباب" رہ گئی، جس کا حوالہ اس کتاب تاریخ مسیحی میں اکثر جگہ آیا ہے ان کا طرز تحریر بالکل نرالا اور سیدھا سادہ ہے اگر یہ کتاب نہ مل جاتی تو بہت سے نامور اصحاب کا پتہ نہ چلتا۔ اپنے عزیز و احباب کا حال نظم میں لکھا ہے ان کی خوبیوں کو سراہا ہے ان کے مرنے پر ایک ایک کا ماتم کیا ہے اور ان کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔" [۱۲]

انہار البحر:

جو نواب احمد خاں نے ۱۲۵۵ھ میں لکھی ہے یہ دراصل شجرہ نسب خاندان نواب دریا خان کا ہے جس کی شاخوں میں دو چار پھول کھلے ہوئے تاریخ شاہجہاں پور کے بھی دکھائی دیتے ہیں جن میں نہ رنگ ہے نہ بو اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اس میں اور خوشبو میں تباین و تضاد ہے۔

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں [۱۳]

نواب احمد خاں ابن حاجی میاں، نواب محمد خاں سے عمر میں چھوٹے مگر خوش خصالی و حسن ساری و مہر دل عزیزی میں ان کے ہم سر تھے۔ علمی مذاق بھی طبیعت میں موجود تھا۔ شاعر بھی تھے۔ انہار البحر ان کی تصنیف ہے جو ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰-۴۱ء) میں لکھی ہے۔

اس کتاب میں تاریخی روایات کے بیان میں تو بہت سے تسامحات نظر پڑتے ہیں۔ مگر شجرہ نسب خاندانی عہد نواب بہادر سے پہنچ رہنے تک بے کم و کاست پوست کندہ لکھا ہے اور کسی جگہ ان کے صاف گو قلم کی زبان کو لغزش نہیں ہوئی ہے جس سے ان کی راست بازی و جرأت کا اظہار ہوتا ہے ان کی صاف گوئی نے اس کتاب کو چھپا ڈالنے پر ان لوگوں کو مائل کیا ہے جن کے مستحق اس میں پردہ دری کی گئی ہے۔ [۱۴]

تاریخ مسیحی کے مؤلف کی نظر سے تو انہار البحر ضرور ہی گزری ہے لیکن اس کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو صاحب تاریخ مطبع نے اپنی ظاہر کی تھی۔ ان کا بیان یہ ہے:

"انہار البحر میں احباب شاہجہاں پور اور اپنے خاندان کے حالات بے کم و کاست قلم بند کر دیے اور اپنے خاندانی حالات کو ذرہ برابر نہیں چھپایا۔ انتہائی اخلاقی جرأت و ہمت سے کام لے کر سب سا سے صاف صاف تحریر کر دیے۔" [۱۵]

مولوی مسیح الدین میاں کا یہ بیان ان کے انہار البحر کے مطالعے کا نتیجہ نہیں۔ ان کے سامنے تاریخ مطبع تھی۔ اس سے مضمون انھوں نے تلخیص کر دی۔ بہ طور حوالہ انہار البحر کا دے کر ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے انہار البحر تھی۔

لیکچر بتاریخ شاہ جہاں پور:

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خان نے اس کے بارے میں لکھا ہے

> "جو ایک وکیل بچی شاہ جہاں پور ساکن مراد آباد نے اجلاس ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ شاہ جہاں پور ۱۸۹۵ء میں پڑھا تھا۔ ماخذ اس کا خود لیکچرار کو معلوم نہ تھا۔ ایک شخص نے ان سے بیان کیا، وہ قلم بند کر کے اجلاس میں سنا دیا اور وقتی مقصد حاصل ہو گیا۔ تنقید و تحقیق تو کجا کی نہیں گئی۔ نہ اس کی ان کو ضرورت تھی۔ اس میں اکثر روایتیں بے اصل اور کذب بھی ہیں۔" [۱۱]

رسم یہ پڑ گئی ہے کہ جہاں اس قسم کی انجمنوں کے جلسے ہوتے ہیں، عام طور پر استقبالیہ کی جانب سے اس شہر اور علاقے کی بعض خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور شہر کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ تحقیقات اور علمی مقالات پیش کرنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہوتا۔ محمد سمائیل ایڈووکیٹ مراد آبادی نے جو مضمون پڑھا یا لیکچر دیا، وہ اسی رسم کی ادائگی کے سلسلے میں ہے۔ اس میں واقعی کم روییں اور غلطیاں اور کی منافی باتیں تھیں۔ جن کی گرفت تاریخ شاہ آباد کے مصنف منشی محمد مظفر حسین خاں سلیمانی نے بھی کی اور مولوی مطیع اللہ خاں نے بھی لیکچرر کی خبر لی۔ لیکن اس لیکچر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ شاہ جہاں پور کی تاریخ میں پہلا مقالہ ہے یا اولین مقالات میں سے ایک ہے، چوں کہ وہ ۱۸۹۵ء میں لکھا تھا اس لیے اس قدامت میں کوئی شبہ ہی نہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا نو رو ہالا اجلاس نواب محسن الملک مولوی مہدی علی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ سر سید احمد خاں، ان کے بیٹے سید محمود، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، علامہ شبلی نعمانی، مسٹر بیک (پرنسپل علی گڑھ کالج)، پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر تھیوڈر ماریسن، کالج کے ٹرسٹی اور دیگر عمائدین ہند اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔

گزیٹیر شاہ جہاں پور:

مولوی مطیع اللہ خان صاحب لکھتے ہیں

> "جہاں تک انگریزی عہد سے اس کا تعلق ہے مکمل و مفصل ہے۔ مگر قدیم تاریخ سے اس کی رجیل انکل خان ہے۔ مؤلف نے قدیم تاریخ صرف چند صفحوں میں ختم کی ہے اور کمیریوں کے موافق نتائج نکالنے کے ارادے سے واقعات کو اس قدر توڑ مروڑ ہے کہ ان کی صورت بالکل مسخ ہو گئی ہے۔" [۱۲]

شاہ جہاں پور ضلع کے ایک گزیٹیر ایچ آر نیول کا مرتب مطبوعہ (۱۹۱۰ء) الہ آباد ہمارے سامنے ہے۔ معلوم نہیں صاحب تاریخ مطیع کے سامنے کون سی اشاعت تھی؟ لیکن کوئی بھی ہو جو حادثہ (۱۸۵۷ء) پیش آ چکا تھا۔ اس کے بارے میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر، معلومات، اس کے حوالہ جات اور ان کے ماخذ و مصادر اور ان سے استدلال میں تو ہرگز فرق نہ پڑا ہوگا۔ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہوگا، وہ برٹش اقتدار کے مصالح اور مفادات ہی میں ہوگا۔ برعظیم ہند و پاکستان کے باشندوں کے نقطۂ نظر سے اور ان کے مفاد میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی کسی پہلو سے اور کسی نہ کسی رائے میں سچائی معلوم ضرور کی جا سکتی ہے۔ اور اصحاب فکر اور اہل نظر جو دیر سے حقیقت چھپی نہیں رہتی۔

تاریخ شاہ جہاں پور:

> صرف چند اوراق کا ایک رسالہ ہے جو کسی اسکول ماسٹر نے دیہاتی اسکولوں میں پڑھانے کے لیے
> کسی وقت میں لکھا تھا۔ وہ ایک بے ربط افسانہ ہے جس کا نام تاریخ کہنا تاریخ کو شرمانا ہے
> برگس نہند نام زنگی کافور [۱۸]

جغرافیہ ضلع شاہ جہاں پور:

چوتھی جماعت میں سماجی مضامین کی ۳۲ صفحے کی ایک درسی کتاب "جغرافیہ ضلع شاہ جہاں پور" کے نام سے برکت اللہ ای ٹی مدرس مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور کی لکھی ہوئی میرے سامنے ہے۔ اس میں ضلع کے محل وقوع، رقبہ، آبادی، قدرتی اور انتظامی تقسیم، تحصیلیں، پرگنے، ریل، سڑکیں، ندیاں، نالے، نہریں، زراعت، صنعت و حرفت، پیداوار وغیرہ وغیرہ کے بارے میں معلومات ہیں۔ اس میں ایک حصہ تاریخ کا بھی ہے جس میں ضلع کا صدر مقام اور مختلف قصبات و مقامات کی مختصر تاریخ، آثار قدیمہ اور مختلف خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔

اس قسم کی درسی کتابیں ہر ضلع میں علاقائی و صوبائی ذریعہ تعلیم کی زبانوں میں مثلاً یوپی میں انگریزی، ہندی، اردو زبانوں میں مرتب کی جاتی ہیں۔ ان میں اضلاع کے بارے میں نہایت قیمتی اور صحیح معلومات ہوتی ہیں۔ ان کی زبان عام طور پر سہل بول چال کی اور ہر درجے کے طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ ان کی تدریس لازمی ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے نہ ان سے دلچسپی ہوتی ہے۔ مؤرخین ان کی اہمیت سے آشنا نہیں ہو سکے جس کتاب کے کتابی حیثیت میں ان کی نظر میں جچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ کتابیں نہایت ذمے داری سے مرتب کی جاتی ہیں اور ہر سال کلاس کی تبدیلی کے ساتھ صوبے اور ملک کی تاریخ اور جغرافیے کی تعلیمی سطح بھی بلند ہو جاتی ہے جیسے چوتھی جماعت میں ضلع کی اور پانچویں جماعت میں صوبے کی تاریخ و جغرافیہ اور معاشرتی علوم کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ ابتدائی درجات کی کتابوں کی زبان عالمانہ اور انشا پردازانہ نہیں ہوتی۔ اس فن کی اعلا تصنیفات کی علمی و ادبی خصوصیات ان ابتدائی درسی کتابوں میں ڈھونڈنا درست نہیں۔ ان کتابوں میں محض تاریخ اور علمی جغرافیہ نہیں پڑھایا جاتا۔ طلبہ کو معلومات سے واقف کرایا جاتا ہے اور ذوق پیدا کیا جاتا ہے۔

تاریخ احسانی:

مولوی محمد مسیح الدین میاں نے لکھا ہے کہ منشی احسان علی خاں احسان نے بھی شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھی تھی وہ نہایت ضخیم تھی اور انھوں نے دیکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں

> "مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان علی خان مختار اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر مرحوم شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھ رہے ہیں (مگر) دونوں مؤلف یکے بعد دیگرے پیوند خاک ہو گئے۔ حسن اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں۔ میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار ضخیم جلدوں میں تھیں۔ مختار صاحب نے اپنی کتاب میں صحت روایات اور تاریخی واقعات میں انھوں نے اصول روایت و درایت سے کوئی سروکار نہ رکھا۔" [۱۹]

میں نے مذکورہ شاہ جہاں پور کے دونوں مورخوں کے التزام میں شعرا کے تذکروں، اعزہ و احباب کے نوحہ و ماتم اور قطعات وفات اور شجرہ جات کے مجموعوں اور ان کے مولفین کو تاریخ اور مورخین ہی میں شمار کیا ہے اور انھیں کے اصول کے مطابق "سخن وران شاہ جہاں پور" اور اس کے مصنف مبارک شمیم مرحوم کو بھی تاریخ و مورخین میں شامل کیا ہے لیکن میں یہ عرض کروں کہ سخن وران پر شمیم صاحب کا مقدمہ تاریخ کے زمرے میں ایک تاریخی شہ پارہ شمار ہوگا۔ لیکن میری رائے یہی ہے کہ اس قسم کی کتب کو تاریخی لٹریچر میں اور اس کے مولفین کو مورخین میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر اس بارے میں رعایت کی گئی تو ہر صاحب دیوان، مثنوی نگار اور شجرہ نویس اس کا مستحق ہوگا کہ اس کا ذکر مورخین میں اور اس کے کارنامہ فن کا بیان تاریخ میں کیا جائے! مجھے اعتراف ہے کہ بہت پر شاد سرور کا تذکرہ شعرائے عجم و ہند اگر اس کا کوئی وجود ہے تو وہ لٹریچر کی بہت قیمتی متاع اور شاہ جہاں پور کے حوالے سے اس میں چند شاعروں کا ذکر بھی بہت اہم ہے لیکن اس کے مقابلے میں اور تاریخ کے دائرے میں "سخن وران شاہ جہاں پور" کا مقدمہ اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے اور اس کا حق ہے اس کا اعتراف کیا جائے۔ آئیے اب سرور و شمیم کے تذکروں کا صحیح مطلع کی روایت کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں۔

ا۔ شعرائے عجم و ہند:

یہ بہت پرشاد متخلص بہ سرور ساکن شاہ جہاں پور کا مرتبہ عجم و ہند کا فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ تاریخ صحیح کے مولف نے انھیں ایک کہنہ مشق، یگانۂ روزگار اور زبردست شاعر لکھا ہے۔ وہ اردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے والد دیوان دولت رائے بہجت (وفات ۱۲۱۵ھ) بھی اردو اور فارسی کے خوش گو اور فصیح شاعر تھے اور دادا لالہ مکھ رائے سرور (وفات ۱۱۷۲ھ) فارسی اور ہندی کے شاعر تھے۔ گویا کہ سرور خاندانی شاعر تھے اور ذوق شاعری ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مولوی صبیح الدین میاں کو ان کے مرتبہ تذکرہ شعرائے عجم و ہند کے کچھ اوراق دیکھنے اور اپنی تاریخ میں ان سے استفادے کا موقع ملا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "(سرور) علاوہ ایک زبردست شاعر ہونے کے صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ شعرائے عجم و ہند فارسی میں ان کی بیش بہا تالیفات سے ایک بیش بہا یادگار ہے جس میں شعرائے شاہ جہاں پور کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرور نے یہ ایک بڑا احسان اپنے شہر پر کیا۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو آج بہت سے نامور شعرائے شاہ جہاں پور کے حالات سے کوئی واقف نہ ہوتا۔ سرور نے شعرائے حال کا حال لکھ کے صاحب کمال احباب کے مرنے کا غم کیا ہے اور ان کی جدائی میں خون کے آنسوؤں سے روئے ہیں۔ ان کے نوحہ اور قطعات وفات موزوں کر کے یادگار چھوڑے ہیں۔" [۱۲]

۲۔ سخن وران شاہ جہاں پور:

شاہ جہاں پور کے شاعروں کا یہ تذکرہ مبارک شمیم صاحب (مرحوم) کی کاوش علمی اور صدیوں تک یادگار رہنے والی تالیف ہے۔ وہ اس کا مواد جمع کرنے کے سلسلے میں برسوں شہر شہر پھرے ہیں تب کہیں یہ بیش بہا تذکرہ مرتب ہوا۔ اس میں ۲۲۸ شعرا کے تراجم اور ان کے نمونۂ کلام مع ان پر نقد و تبصرہ کے ہیں۔ یہ ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ لیکن اس پر جو مقدمہ مبارک شمیم مرحوم نے لکھا ہے وہ نہایت قیمتی تحریر ہے اور اس کا تعلق شاہ جہاں پور کی علمی، ادبی و تہذیبی تاریخ ہی سے نہیں، جیسا کہ ان کی تالیف کا اور اس کے موضوع سے ہوتا ہے بلکہ یہ تاریخی شہر کی تاریخ بنا اس کے عروج، اس کی تہذیبی حیثیت، اس کے آسودہ حالی، اس کے خاندان اس کے اختلاف کے تذکرے خود میں بے غرض حیات،

شاہ جہاں پور کی خصوصیات سے ہے اور اس میں بے شمار علمی و تاریخی معلومات ہیں۔ غرض کہ یہ ایک نادر و یادگار تحریر ہے جو شاہ جہاں پور کی تہذیب و تاریخ ۔۔۔۔ سیر دور اعتبار سے یادگار رہے گی۔

تاریخ شاہ جہاں پور، نامۂ اعجازی المعروف بہ تاریخ صبیح

آپ نے تاریخ شاہ جہاں پور کا پورا متن مطالعہ فرمالیا۔ اس کے فاضل مؤلف کا نام اس طرح ہے: عالی جناب مولوی محمد صبیح مدین میاں صاحب خلیل شاہ جہاں پوری (اکسٹرا اسسٹنٹ مجسٹریٹ)۔ "مؤلف نے اس کی تالیف کے لیے اپنے استاد مولوی حکیم محمد صاحب کو محرک قرار دیا ہے۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے بیڑا اٹھایا تھا اور ادھر ادھر سے چند کتابیں حاصل کر کے مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا اور بعض ثقہ حضرات سے حالات کی تفتیش بھی شروع کر دی تھی۔ مگر مولانا موصوف کی ناگہانی وفات نے ان کی ہمت کو پست کر دیا اور اس وقت تک جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا، اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ پھر اسی زمانے میں جب انھیں معلوم ہوا کہ تاریخ شاہ جہاں پور کے موضوع ہی پر نشی حسان علی خاں احسانی اور رحمان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر تاریخ لکھ رہے ہیں تو قصد کا اپنا ارادہ بدل دیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد دونوں مؤلفوں کے انتقال نے ان کی آخری امید پر بھی پانی پھیر دیا۔ پھر اچانک ان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور حسن اتفاق سے ان کو دونوں مذکورہ تاریخیں دیکھنے کو مل گئیں اور بہ قول آں موصوف کے:

"میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار جلدوں میں تھیں۔" [44]

اس کے بعد انھوں نے نقاد کا قلم اٹھایا اور دونوں پر تنقید لکھ ڈالی۔ جہاں تک کہ آخر فکر کر کے مؤلف کی کم نصیبی کا ماتم کر کے اور ان کے ورثا کو عدم توجہی کا مورد الزام قرار دے ہوئے فرماتے ہیں:

"اور یہ کس قدر جائے افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو تمام عمر کی محنت اور نیک

بہتر یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلا طبع کے رہ گئی۔ شعر

حسرت پہ اس مسافر بے کس کے روئیے

جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے!

بہر حال مذکورہ مورخ کی قسمت کچھ بھی ہو اور اس کے ورثا بہ جرم عدم توجہی کسی بھی سزا کے مستحق ٹھہریں، مولوی محمد صبیح مدین کی قسمت جاگ اٹھی اور لکھتے ہیں:

"ان ہر دو قلمی نسخوں کے مطالعے سے یکا یک میرا شوق تازہ ہو گیا اور چوں کہ میرے پاس

بھی سرمایہ ایک حد تک کافی تھا، میں نے خدا تعالیٰ پر بھروسا کر کے لکھنا شروع کر دیا۔" [43]

یہ موقع تھا کہ انھیں مولوی مطیع اللہ خاں صاحب تاریخ مطیع کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ ان کی تاریخ سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، لیکن شکریہ ادا کیا انھوں نے ایک ڈپٹی کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا۔

یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ تمدن و سیاست، تہذیب، ملکی حالات وغیرہ کے مضامین اور شاہ جہاں پور کے بانیوں اور ان کے خاندانوں کے تذکار و حالات میں ہے۔ دوسرا حصہ بانیان ضلع و شہر کے مختلف طبقات کے بیان میں ہے۔ مشتمل علما و مشائخ، اولیا، شعرا، حکما اور ڈاکٹر، شرفا، اصحاب حرفت لطیفہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ آخر میں ایک تتمہ ہے جس میں بعض بیرونی مشاہیر جن میں [illegible]

شعراء وغیرہ کے تذکار ہیں۔

کتاب کے شروع میں شاہ جہاں پور کے ایک معروف اہل قلم سید معین الدین کا مقدمہ ہے۔ اس میں کتاب کی خصوصیات اور اس کے مؤلف کی شخصیت اور سیرت و خدمات کی بات کہی گئی ہے۔ وہ حقیقت اور کتاب کے واقعی معیار سے بہت بلند ہے۔

مولوی مسیح الدین نے خود لکھا ہے کہ تاریخ شاہ جہاں پور لکھنے کی ترغیب انھیں ان کے استاد مولوی حافظ حکیم مرحوم نے دی تھی اور بار بار کے اصرار سے وہ اس پر آمادہ ہو گئے تھے اور نواب عبداللہ خاں مرحوم نے انھیں محبت خانی (اخبار محبت از نواب محبت خاں) کی تلاش کر کے منگوا بھی دی تھی اور ان کے ایک محلے دار عباس علی خاں نے تذکرۃ الاحباب (از نواب محمد خاں متخلص بہ احمد) اور انہار البحر از نواب احمد خاں اعنایت کر دی تھی۔ ابتدا میں انھیں یہی کتابیں ہاتھ لگی تھیں۔ ان تینوں کتابوں کی نوعیت یہ تھی۔

۱۔ اخبار محبت کے بارے میں مؤرخ تاریخ مطبع لکھتے ہیں: وہ در اصل سلاطین تیموریہ کی تاریخوں کا خلاصہ ہے جس میں جستہ جستہ حالات شاہ جہاں پور بھی کسی قدر بیان کیے ہیں۔ مگر ان میں غلطیوں کی آمیزش بیہودہ ہے۔

۲۔ تذکرۃ الاحباب کے بارے میں مسیح الدین خاں نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف نے اپنے عزیز و احباب کا حال نظم میں لکھا ہے۔ ان کی خوبیوں کو سراہا اور ان کی وفات پر ماتم کیا ہے۔

۳۔ انہار البحر کے بارے میں بھی مولوی مسیح الدین نے لکھا ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے احباب اور خاندان کے حالات تحریر کیے ہیں۔ مولوی مطیع اللہ خاں نے لکھا ہے کہ "یہ در اصل شجرۂ نسب خاندان نواب دریا خاں کا ہے" اس کی مزید صفت یہ بیان کی ہے کہ اس میں اور اخبار محبت میں تباین و تضاد ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک کتاب تو تاریخ سلاطین تیموریہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے اور کہیں کہیں کوئی بات شاہ جہاں پور کی آبادی کے بارے میں آ گئی ہے۔ دوسری کتاب نظم میں احباب و اعزہ کا تذکرہ ہے اور تیسری دریا خاں کے خاندان کے بعض افراد کا تذکرہ اور شجرۂ نسب کی کتاب ہے۔ ان تینوں کتابوں میں تاریخ شاہ جہاں پور کے لیے اس کے سال بنیاد ۱۰۳۹ھ سے "تاریخ مسیح" کے زمانۂ تکمیل ۱۳۳۱ھ تک کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ اور نمبر ۲ و ۳ میں بعض بیانات و معلومات میں جو تضاد تھا اس کی کوئی بحث کہ ان میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے؟ مولوی مسیح الدین کی تاریخ میں موجود نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تینوں کتابیں ان کی دسترس میں تھیں۔ انھوں نے پڑھا بھی ہوگا لیکن ان سے استفادے کا پتا نہیں چلتا۔ نواب بہادر خاں اور نواب دلیر خاں کے اخلاف کی چند اور کتابوں کا پتا بھی چلتا ہے لیکن ان سے بھی استفادے اور ان کی معلومات سے کتاب کے مباحث کی زینت کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

"ان کتب کے مل جانے سے مجھ کو ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد وہ تحقیق کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"اور میں نے ثقہ اور معمر حضرات سے گزشتہ حالات و واقعات کی جانچ شروع کر دی اور جن کتب و رسالہ جات میں یہاں کے حالات کا پتا چلا ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔"

تحقیق و تفتیش کے اس مرحلے میں انھوں نے کسی ایک ثقہ اور معمر شخص کا بھی نام لیا اور نہ کسی کتاب و رسالے کی نشان دہی کی جس سے انھوں نے کوئی معلومات حاصل کی ہوں۔ یہ ایسا مسئلہ تھا ہی نہیں کہ وہ معمر لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں اور معلوم کرتے ہوں کہ صورت واقعہ کیا ہے اور نہ تاریخ شاہ جہاں پور اس کے بانیان کرام کے بارے میں کتابیں اور رسالے کسی کتب فروش کی دکان پر

دستیاب تھے اور نہ کوئی لائبریری تھی جس میں یہ ذخیرہ موجود ہوتا۔ یہ بیان قطعاً غلط ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ بات یہ ہے کہ مولوی مطیع اللہ خاں اور منشی احسان علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے کام اور تاریخ شاہجہاں پور کی تصنیف و تالیف کے مساعی و مشاغل کی جو شہرت ہوئی اور اس سے مولوی مسیح الدین میاں کو استفادے کے جو مواقع اتفاقاً حاصل ہو گئے تھے، اس کے بعد انھوں نے جو منصوبہ بنایا تھا اور جس میں وہ بعد میں کامیاب بھی رہے تھے۔ اس کے لیے زمین ہموار یا فضا تیار کر رہے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مذکورہ العصر جو مصنفین کے حصوں کے بعد بھی مایوس ہو رہے تھے کہ ان میں تاریخ شاہجہاں پور کے لیے کوئی مواد موجود نہیں تھا اور یہ محسوس کر کے انھوں نے ہمت ہار دی اور اس کے لیے بہانہ اپنے استاد کی موت کا تذکرہ تھا۔

اوپر کے بیان کے تسلسل میں لکھتے ہیں:

مگر مولانا (حافظ حکیم محمد صاحب) موصوف کی ناگہانی وفات سے میں کچھ ایسا شکستہ خاطر ہو گیا

کہ ان مسودات کو الماری میں بند کر دیا۔"

یہاں تک پہنچ کر انھوں نے تحریر کی راہ اختیار فرمائی ہے:

اسی زمانے میں مجھ کو معلوم ہوا کہ منشی احسان خاں مختار اور خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر

مرحوم شاہجہاں پور کی تاریخ لکھ رہے ہیں مجھ کو اطمینان ہو گیا اور میں نے قطعاً اپنا ارادہ بدل دیا

مگر یہ امید بھی پوری نہ ہوئی اور دونوں مؤلف یکے بعد دیگرے پیوند خاک ہو گئے۔" ۳۴

مگر دیکھیے کہ قسمت کی یاوری نے کیا گل کھلایا کہ

"حسن اتفاق سے مجھ کو یہ دونوں کتابیں دیکھنے کو مل گئیں۔ میں نے ان کو اول سے آخر تک بالاستیعاب

پڑھا۔ یہ دونوں تاریخیں تین تین، چار چار جلدوں میں تھیں۔"

مولوی مسیح الدین میاں کے لیے یہ "حسن اتفاق" ایسا ہی تھا جیسے بغیر تقیہ و گرجہ کے کسی نومولود یا سعادت کی تاریخ ولادت نکل آئے۔ اپنی اسی تاریخ مطیع میں مولوی مطیع اللہ خاں کے تذکرے میں دیگر بے شمار کاموں کے اعتراف کے ساتھ مؤلف کی محنت و جاں کاہی اور اس کی تاریخ سے استفادے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا (مطیع اللہ خاں) مرحوم نادرروزے کے پابند، نہایت وضع دار، مستقل مزاج، روشن دماغ اور مدبر تھے۔ شاہجہاں پور کے دولت مند و مقتدر اصحاب میں شمار تھا۔ تصنیف و تالیف کا شغل برابر رہتا تھا۔ شاہجہاں پور کی تاریخ مطیع نہایت محنت و جاں کاہی سے تالیف کی تھی مگر وہ اس کو روزانہ کی کاٹ چھانٹ کی وجہ سے طبع نہ کرا سکے، میں نے (اپنی) اس کتاب (تاریخ مطیع) میں زیادہ حالات آپ کی تاریخ سے لیے ہیں۔"

اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ روزانہ کاٹ چھانٹ کی وجہ سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے تھے۔ یہاں تکمیل نہ ہونے کا ذکر نہیں صرف کاٹ چھانٹ کی وجہ سے طبع نہ کرا سکنے کا بیان ہے۔ لیکن میں قارئین کرام کی توجہ ان کے اس اعتراف کی طرف دلاؤں گا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں زیادہ حالات تاریخ مطیع سے لیے ہیں۔ اس بیان میں انھوں نے "زیادہ حالات" اخذ کر لینے کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اور میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کچھ بھی ان کی تحقیق کا نتیجہ نہیں۔

خان بہادر مطیع اللہ خاں ایک صاحب فکر مورخ تھے انھوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھیں ہندوستان کی قدیم و جدید تاریخ پر عبور تھا۔ انھیں قدیم تاریخ نویسی کی خصوصیات اور جدید طرز تاریخ نویسی اور اس کے تقاضوں کا بخوبی علم تھا۔ ملازمت کے دوران مختلف مدارج، پیر و گردش حالات، کے مشاہدے، عوام کی زندگی اور ان کے مسائل کے مطالعے اور تجربات نے ان کی فکر کو پختہ اور بصیرت کو گہرا کر دیا تھا۔ انھوں نے قدیم تاریخ نویسی پر جو تبصرہ کیا ہے اور جدید طرز تاریخ نویسی پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے ان کی بلند خیالی، تاریخ میں ان کی گہری نظر اور وقت کے تقاضوں اور تاریخ نویسی کی موجودہ ضرورتوں اور ان کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اسی نقطۂ تاریخ کے مطابق شاہجہاں پور کی تاریخ کا خاکہ تیار کیا تھا اور پہلی جلد اگرچہ اپنے پہلے مسودے کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے لیکن اس کے مباحث کے پھیلاؤ، ان کی ترتیب اور ان کے مضامین دیکھ کر خان بہادر مرحوم کی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مطیع اللہ صاحب نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

☆ اس کا پہلا حصہ انھی کے الفاظ میں ”قیام شاہجہاں پور“ ہے۔ اس میں شاہجہاں پور اور ضلع شاہجہاں پور کی قدیم و جدید تاریخ اور بحالہ ان بانی شاہجہاں پور کے حالات میں ہے۔ یہ رجسٹر سائز کے ۹۸۸ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔

☆ دوسرا حصہ ”اعیان شاہجہاں پور“ کے عنوان سے ارباب کمال اور خوانین کے تراجم پر مشتمل ہے اور

☆ تیسرا حصہ ان لوگوں کے تذکار میں ہے جو مختلف اقوام کے لوگ تھے۔ شاہجہاں پور میں آ کر رہے اور شاہجہاں پور کی ترقی، علوم و فنون کی ترویج و اشاعت، ایک نئی تہذیب و طرز زندگی کو جنم دینے کا موجب اور شاہجہاں پور کو زینت دینے اور اس کی شان و شوکت میں اضافے اور قدیم و جدید کا ایک حسین سنگم بنانے میں جن کا تہذیبی ذوق اور طرز زندگی کام آیا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاہجہاں پور نے الگ حیثیت میں روہیل کھنڈ کا حصہ بن کر، اودھ میں شامل ہو کر اور کمپنی کے زیر انتظام آ کر تمام مختلف حالات میں اپنے امتیاز کو باقی رکھا۔ محترم جمیل احسن خان شاہجہاں پوری حمید و رشید حضرت مولوی مطیع اللہ خاں، جن کے صرف ہمت سے پہلی جلد کو اہل نظر اور اصحاب ذوق سے روشناس کرایا ہے آں موصوف کا خیال ہے کہ اس کا بقیہ حصہ ایک ہزار صفحات کی ضخامت رکھتا ہے اگر ان تینوں حصوں کے مواد کو جمع کر دیا جائے تو رجسٹر سائز کے پورے دو ہزار صفحات اور تاریخ صبیح کے مطبوعہ کے مطبوعہ صفحات دو سائز میں پورے تین ہزار صفحات بنیں گے۔ جب مولوی صبیح کے تمام مضامین و مباحث دونوں حصوں کے پانچ سو صفحات میں سما گئے ہیں۔

ایسا کیوں کر ممکن ہوا؟ صرف اس لیے کہ مولوی صبیح الدین میاں نے اصل مآخذ تک رسائی حاصل نہیں کی، یہاں کے پاس تاریخ شاہجہاں پور کے لیے ضروری مواد تھا، نہ انھیں اس کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی، نہ ان میں تاریخ نویسی کی صلاحیت تھی، نہ شوق نے مہمیز لگائی، نہ ذوق نے رہنمائی کی۔ ان کے سامنے مولوی مطیع اللہ کی اطلاعات جو جزئیات و کلیات پر حاوی مکمل و مستند تاریخ شاہجہاں پور کی تین چار جلدیں اور منشی احسان علی خاں احسان کا کل سرمایۂ تاریخ موجود تھا۔ ان سے ضروری مواد اپنے ذوق کے مطابق مواد اخذ کر لیا اور تاریخ صبیح مکمل ہو گئی۔

منشی احسان علی کی تاریخ میں نے نہیں دیکھی، مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ میرے سامنے ہے اور تاریخ صبیح سے اس سے بہت سے مضامین و مباحث کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں؛

- انھوں نے ان تمام مباحث سے صرف نظر کر لی جو تاریخ کے اہم مباحث ضرور تھے اور مولوی مطیع اللہ خاں نے اس میں بڑی جگہ کھپائی تھی لیکن مولوی صبیح الدین میاں کا ذوق ان سے آشنا نہ تھا اور نہ وہ انھیں تاریخ میں اہمیت ہی دیتے تھے۔ اس سے یے

انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان مباحث کو جو پچاسوں نہیں سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، چھوڑ دیا جائے۔

۲۔ پچاسوں مقامات پر انھوں نے متن میں مرحوم مطیع اللہ خاں کا حوالہ دیا ہے کہ وہ یہ لکھتے ہیں اور حصہ اول میں تقریباً بیس سو مختلف مضامین میں اور حصہ دوم میں ساٹھ سے زیادہ تراجم میں استفادے کا اعتراف کیا ہے۔

۳۔ پچاسوں مقامات پر مضمون کو بغیر حوالے کے نقل کر لیا ہے۔ حالاں کہ وہ مضمون، بیان اور لفظوں کی یکسانیت اور جملوں کی ساخت اور ترتیب میں تاریخ مطیع میں موجود ہے۔

۴۔ اور یہ جو انھوں نے لکھا ہے کہ اخبار محبت، تذکرۃ الاحباب اور انہار البحر کے مل جانے سے انھیں ایک گونہ تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے ثقہ اور معمر لوگوں سے گزشتہ حالات و واقعات کی تلاش شروع کر دی اور جن کتب و رسالہ جات میں یہاں کے حالات کا پتا چلا ان کو منگا کر ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا تھا تو اس کا کوئی ثبوت بھی ہونا چاہیے لیکن اس قسم کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

الف زبانی روایت کے صرف دو حوالے ہیں وہ بھی کسی حوالے کی تائید میں! اس طرح ثقہ اور معمر حضرات سے استفادے کا تو مسئلہ یوں صاف ہو گیا۔

ب مذکورہ بالا تینوں کتابوں کے تمام حوالے ٹھیک ٹھیک انھیں مسائل و مباحث میں ہیں جن میں مولوی مطیع اللہ خاں نے ان کا حوالہ دیا ہے۔

ج ان کے علاوہ پوری تاریخ مسیح میں کسی نادر کتاب یا رسالے کا حوالہ کسی اہم بحث کے تصفیے یا کسی خاص بیان کی تائید و توثیق یا کسی دعوے کے استدلال یا اثبات میں نظر سے نہیں گزرا۔

۵۔ متعدد مقامات پر طویل طویل عبارتوں کے بعد لکھ دیا ہے ' تاریخ مطیع ملاحظہ'' کسی علمی بحث میں کسی صاحب قلم کی تحقیق سے استفادے کا یہ انداز ہرگز پسندیدہ نہیں! ایسے تمام مواقع پر محقق کی کاوش کا پورا پورا اعتراف کرنا چاہیے تھا!

تاریخ شاہ جہاں پور موسومہ تاریخ مطیع:

مولوی مطیع اللہ خاں نے شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تھا، تو یہ فیصلہ انھوں نے بے سوچے سمجھے نہیں کیا تھا۔ وہ کسی کی نقل کر رہے تھے، نہ انھیں اپنی ناموری اور شہرت مقصود تھی اور نہ انھیں کسی نے مصنف بننے کی ترغیب دی تھی۔ انھوں نے شاہ جہاں پور کی تاریخ کو وقت کی ایک ضرورت سمجھ کر تاریخ کا ایک خلا پر کرنے کے لیے قوم و ملت کی رہنمائی کے لیے، ذہن و فکر کی تربیت کی غرض سے، قوموں کی صف میں امتیاز پیدا کرنے اور اپنا صحیح مقام پانے کے لیے اور زندگی کی پستیوں سے نکالنے اور ایک کامیاب اور باعزت زندگی کے حصول کے لیے، مختصر یہ کہ ایک معرکۂ حیات فتح کرنے کے لیے، وہ شاہ جہاں پور کے ماضی کی سیر کرانی چاہتے تھے تا کہ ظہور حسرت کی روشنی میں، تجربات کی بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔ ان کے ذہن میں تاریخ نویسی کا ایک اہم مقصد اور جامع خاکہ تھا۔ ان کی یہ بات پیش نظر تھی کہ قدیم طرز تاریخ نویسی میں جو باتیں تاریخ کی اہم خصوصیات سمجھی جاتی تھیں اب وہ تاریخ میں جگہ پانے کی لائق نہیں سمجھی جاتیں اور جن باتوں کو تاریخ کی خصوصیات کے خلاف سمجھا جاتا تھا اب انھیں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مولوی مطیع اللہ خاں لکھتے ہیں کہ اب اس مسئلہ میں کا مطالبہ یہ ہوتا

ہے:

''حسن کو پرانے مؤرخ خنگ وبد مزہ سمجھ کر ہاتھ تک نہیں لگاتے یعنی تعلیم و تمدن، اقتصادیات و رواج، صنعت و حرفت، تجارت و کاروبار، عوام، ملک کا امن و خوش حالی، اخلاق و دماغی ترقی و تنزل، سلطنت و معدلت گستری وغیرہ کی شرح کیجیے۔''

مؤلف تاریخ مطلع کے نہایت بلند خیالات تھے۔ چناں چہ انھوں نے نہ صرف پٹھانوں کی تاریخ لکھی کار دی بلکہ شاہجہاں پور کے شہر و قصبات سے دیہات تک اور نہ صرف سیاسی بلکہ علمی، تعلیمی، تہذیبی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور حکومت کے نظم و نسق کے دور دراز گوشوں تک پھیلی ہوئی تاریخ کا خاکہ تیار کیا۔ آخر میں انھوں نے اس تاریخ کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے

''یہ کام صرف قومی وطن کی محبت اور بزرگوں کے کارناموں کی حفاظت اور آیندہ نسل کی واقفیت کی امید سے کیا گیا ہے اس کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔''

اس کے بعد مؤلف نے کتاب کے نام اور اس کے مضامین کی تقسیم کی صراحت کی ہے۔ انھوں نے کتاب کے تمام صفحات کو تین عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس تذکرے کو فاضل مرتب ہی کے الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ مؤلف مرحوم لکھتے ہیں۔

نام اس کا ''تاریخ مطلع'' ہے۔ جس سے سال ختم تالیف ۱۳۴۰ ہجری بلا تعمیہ و تخرجہ نام مصنف پر طور پر ظاہر ہوتا ہے

قطعہ

از عنایات خالق رفیع　　　　یافت اتمام چاپ نقش بدیع

سال تالیف بخشم زیرو　　　　کرد ارشاد کہ ''تاریخ مطلع''　　۱۳۴۰ھ

(۱۳۴۰ھ ہجری سال کے مطابق شمسی کیلنڈر کا سال ۱۹۲۲ ہوتا ہے۔)

مضامین کے لحاظ سے اس کے تین حصے ہیں:

پہلے حصے کا نام ''بنیان شاہ جہاں پور'' ہے۔ اس میں شاہ جہاں پور و ضلع شاہ جہاں پور قدیم و جدید تاریخ اور خاندان شاہ جہاں پور کے حالات ہیں۔

دوسرے حصے کا نام ''اعیان شاہ جہاں پور'' ہے۔ اس میں ارباب کمال و خوانین شاہ جہاں پور کے تراجم ہیں۔

تیسرے حصے کا نام ''واردان شاہ جہاں پور'' ہے۔ اس میں ارباب فضائل و عزیزین وارد ین کے تذکرے ہیں۔

فاضل مؤلف نے اس پر ایک نہایت عالمانہ و جامع مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو بذاتہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ پر ایک بلند پایہ محققانہ نہایت فکر انگیز و مفید اور لائق مطالعہ مقالہ ہے۔ اس کے مطابق ان کے اپنے نظم و اصول تاریخ نویسی میں ان کا کامیابی کا فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکتا جب کہ اس کی تینوں جلدیں سامنے ہوں۔ اب تک چوں کہ اس کا پہلا حصہ ہی شائع ہو سکا ہے اور وہی ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہے بہت خوب ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔

خدا کرے اس کے بقیہ دونوں حصوں کی اشاعت کا سر و سامان ہو جائے۔

مولوی صبیح الدین کی تنقید اور اس کا پس منظر:

صاحب تاریخ مطلع ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم کے آغاز سے لے کر کتب وسطی تک کی تحصیل شاہ جہاں پور میں کر لی تھی۔ تکمیل کے لیے مدرسہ عالیہ رام پور کا سفر اختیار کیا اور ایک مدت قیام کر کے تکمیل علوم کی۔ پرائیویٹ طور پر انگریزی سیکھی اور قابلیت پیدا کی۔ ۱۸۹۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کے منصب سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

مولوی مطیع اللہ خاں نہایت ذہین شخص تھے۔ مطالعے اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور ایک عمدہ کتب خانہ اپنی زندگی میں جمع کر لیا تھا اور کئی تصانیف بھی یادگار چھوڑی تھیں۔ یہ کتب خانہ ربع صدی تک خان بہادر مرحوم کے اخلاف نے سنبھال کر رکھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد جب شاہ جہاں پور میں "گاندھی فیض عام کالج" کا قیام عمل میں آیا تو اس کے حوالے کر دیا۔ ۱۸ر جون ۱۹۲۵ء کو جب کہ ان کی عمر تقریباً ۵۶ برس کی تھی، ان کا انتقال ہو گیا اور ان کا وطن مالوف اور مولد و منشائے طفولیت ہی ان کا مدفن قرار پایا۔ ان کی زندگی کا وہ دور جو ۱۸۹۳ء میں ان کی ملازمت سے شروع ہوا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً ۵ برس کے مختصر دور پر محیط تھا، نہایت شان اور وقار کے ساتھ بسر کیا۔ وہ اپنی زندگی میں نیک نام تھے اور اپنے پیچھے نیک نامی کی شہرت چھوڑ گئے۔

ان کی یادگاروں میں ان کے نیک اور مہذب بیٹے محترم جمیل احسن کے علاوہ چند تصانیف بھی ہیں۔ ان کی ایک تالیف "انساب قبائل افاغنہ" ہے۔ اس کا ذکر معارف میں ایک مضمون میں کیا ہے۔ ان کی ایک تالیف "سالار مسعود غازی اور ان کے غزوے" کے بارے میں ہے جو شاہ جہاں پور سے شمال میں پانچ میل کے فاصلے پر "بہرالہ" کے مقام پر پیش آیا تھا۔

فاضل مؤلف نے مذکورہ بالا دونوں تصانیف کا ذکر خود اپنے قلم سے اپنی "تاریخ مطلع" میں صفحہ ۳۶-۱۳۵ اور صفحہ ۸۷-۱۸۰ پر کیا ہے اور چوں کہ انھوں نے قارئین تاریخ مطلع کو دونوں کتابوں کے موضوعات کے تفصیلی مطالعے کی دعوت دی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کتابیں شائع بھی ہوئی تھیں۔ مرحوم کی ایک دینی تالیف "جو قرآنی اصطلاحات" کا ذکر ان کے خلف سعید اور یادگار سلف جمیل احسن شاہ جہاں پوری نے تاریخ مطلع پر اپنے پیش لفظ میں کیا ہے۔ انھی نے یہ کتاب چھپوائی تھی۔ ان تینوں کتابوں کے تذکار کے مطالعے سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان مطبوعات کی اشاعت کیا ہے اور کب اور کہاں سے ان کی طباعت و اشاعت عمل میں آئی تھی۔

ان کی اہم کارنامہ تالیف "تاریخ شاہ جہاں پور موسوم تاریخ مطلع" ہے۔ یہ تاریخ لکھ کر انھوں نے اپنے وطن دوست، صاحب علم و ذوق اور ایک قابل مؤرخ ہونے کا نہ صرف ثبوت دیا ہے بلکہ ایک اہم فرض ادا کیا ہے۔ انھوں نے اہل شاہ جہاں پور کا سر بلند کر دیا ہے۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے تاریخ نویسی کے تصور کے مطابق ایک بلند پایہ اور جامع تاریخ شاہ جہاں پور لکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ اپنی ملازمت کے زمانے میں انھوں نے قوم و وطن کی جو خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ لیکن ٹھیک ٹھیک اسی دوران (۱۸۹۳ء تا ۱۹۲۰ء میں) انھوں نے اپنے مطالعہ و علم، اپنے مشاہدے اور تجربات سے جو فائدہ اٹھایا اور تاریخ لکھ دی وہ ایک زندہ جاوید یادگار ہے، جس سے ان کا نام اور ان کے وطن مالوف کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔

اگرچہ اس کی اشاعت پر ایک سال سے زیادہ وقت گزر چکا ہے، اہل علم و نظر اور اصحاب ذوق کے حلقوں میں اس کی شہرت ابھی تک عام نہیں ہو سکی۔ اس بات کو میں اس طرح محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک کسی صاحب قلم نے اس پر نقد و تبصرہ کا قلم نہیں اٹھایا۔ بجز ۱۹۳۰ء کے مگر ہوگا جب مولوی محمد صبیح الدین شاہ جہاں پوری نے اپنی تاریخ کی تکمیل کے لیے اس سے استفادہ کیا تھا تو تاریخ صبیح میں اس کی

خصوصیت پر تبصرہ کیا ہے۔

وہ اپنی تاریخ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"مؤلف تاریخ مطبع نے انتہائی کوشش اور جاں کاہی سے مؤلف کتاب کی ذمہ داری کو مد نظر رکھتے ہوئے پوری تحقیقات اور محنت سے واقعات اور حالات کو جمع کیا۔" ۱۵

اس کے بعد وہ اس کی کسی خوبی کے بیان سے گریز کر کے اس کی خامیوں کے بیان پر توجہ کرتے اور بہت صرف فرماتے ہیں لکھتے ہیں۔

"مگر روز انہ کانٹ چھانٹ کے وہم سے وہ اس کو مکمل نہ کر سکے اور انھوں نے اپنی کتاب میں ان واقعات اور ان مشاہیر کے حالات کو بھی سمیٹ لیا، جو اتفاقیہ طور پر شاہجہاں پور میں آئے تھے اور جن کا شاہجہاں پور سے کوئی خاص تعلق یا واسطہ نہ تھا اس سے کتاب کی ضخامت تو بہت زیادہ ہو گئی مگر مقامی بزرگوں کے بہت نام چھوٹ گئے۔ اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ڈپٹی صاحب کا بیشتر حصہ عمر سرکاری ملازمت کی وجہ سے باہر گزرا تھا۔ اور دوران ملازمت ہی آپ نے اس کو ترتیب دیا تھا اس وجہ سے وہ یہاں کے مشائخین و اہل فن حضرات کے حالات جمع کرنے سے قاصر رہے۔

جس طرح انھوں نے کتابی معلومات حاصل کرنے میں کوشش و محنت کی ویسی ہی مقامی حالات کی فراہمی میں ایک حد تک کامل لاپروائی سے کام لیا۔

اور نیز اپنے زمانے کے اکثر شعر و اہل فن حضرات کو قطعاً قلم زد کر دیا، جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں کہ گو ان کی تاریخ میں معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔

مگر اس کو بجائے شاہجہاں پور کی تاریخ کہنا تاریخ روہیل کھنڈ اور ہاں تاریخ مشاہیر ہند کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

مگر پھر بھی معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید ہوتا اگر مکمل طور پر طبع ہو جاتی اور یہ کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو اور تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلا طبع کے رہ گئی۔ شعر

حسرت پہ اس مسافر بے کس کے روئیے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے"

تاریخ صبیح کے پیش لفظ کے صفحہ ایک و دو کی مسلسل عبارت ہے اسے مکمل جملوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تا کہ جواب کے نکات واضح رہیں اور تفہیم میں سہولت ہو۔

اوپر کے اقتباس میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں۔

ا۔ مرحوم مطیع اللہ خان کی تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کی پہلی جلد ہے جو ۹۸۸ صفحات پر محیط ہے اس میں "کانٹ چھانٹ" کا کوئی عمل ہی نہیں ہوا۔ اس کی صورت یہ ہے

الف مسودے کی ریڈنگ کے دوران بعض چھوٹے ہوئے الفاظ بڑھا دیے گئے ہیں۔

ب بعض جگہوں پر جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور صاف محسوس ہوتا کہ اس مقام پر جملہ ہی چھوٹ گیا ہو۔

یا عبارت کی وضاحت کے لیے اس جملے کے اضافے کی ضرورت ناگزیر تھی۔

ج　　ایک آدھ لفظ کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔

یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں جن پر کاٹ چھانٹ کے عمل کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ فاضل مصنف کو اپنے علمی اور تاریخی مضمون پر اور عربی زبان (اُردو) اور اسلوب نگارش پر اتنا عبور ہے کہ اس کے قلم سے جو جملہ نکلا ہے وہ ایسا مکمل اور اتنا جامع ہوتا ہے کہ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، پھر جو بھی عمل ہوا ہے اتنا کم ہوا ہے کہ بڑے سائز کے ۸۸۸ صفحے کی کتاب میں اسے کم سے کم پر ہے پر بھی وقوع کے بجائے عدم وقوع پر محمول کیا جائے گا، پھر یہ بھی واضح رہے کہ کتاب کا یہ پہلا مسودہ ہے اسی صورت سے اس کے چربے اتار کر چھاپ دیا گیا ہے۔

مولوی مسیح الدین مرحوم نے ''کاٹ چھانٹ'' کے عمل اور اس کی حد تکمیل کو ان کے وہم کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ جب آپ کسی کو وہم میں مبتلا قرار دیا جائے یا کسی کو مراقی سے منسوب کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے اسے اپنے اوپر اعتماد نہیں، وہ شخص پختہ فکر، مستقل مزاج اور صاحب الرائے نہیں بلکہ نا قابلِ اعتماد اور فاترالعقل ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ میاں صاحب کی سخت زیادتی ہے۔ خاں صاحب ہرگز کسی وہم میں مبتلا تھے نہ انھیں کوئی مراقی تھا۔ نہ وہ بے اعتمادی کے شکار تھے۔ ان کے سامنے تاریخ کا ایک خاکہ تھا اسے انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اسی کے مطابق انھوں نے اسے مکمل کیا تھا اور تکمیل کے بعد بھی وہ اس میں رنگ بھرتے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہر لحظہ ہوش و حواس مصروف رہتے تھے۔ معین الدین بھائی مترجم اور نگ ریب ڈیولین سے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھوانا بھی درحقیقت ہنگامی شہادت کے انتظام اور تحریک رد استغاثہ کے سر و سامان سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۔　　ہر تالیف میں مذکورات و مندرجات کے دو درجے ہوتے ہیں، ایک اوّلی دوسرے ضمنی کسی داستان کی تکمیل ان دونوں قسم کے کیریکٹروں کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہ مصنف کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ثانوی کیریکٹر یا ضمنی واقعے کو متن میں شامل کرے، حاشیے میں سے جگہ دے یا ضمیمہ و استدراک کے ذریعے تصنیف میں حسن پیدا کرے اور تکمیل کا کارنامہ انجام دے۔ مصنف کے اس اختیار کو اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کے طریق استعمال پر حسن و قبح کی بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کا تذکرہ ہی نہیں کیا گیا ہے جس کا شاہجہاں پور سے کوئی خاص تعلق اور واسطہ نہ رہا ہو! پھر اگر کسی درجے میں یہ بات اصول تصنیف کے خلاف بھی ہو تو اس کا حق صاحب تاریخ مسیح کی حد تک تو صاحب ''تاریخ مطیع'' کی بھی حاصل ہونا چاہیے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولوی مسیح الدین صاحب نے اپنی ۳۵۸ صفحے کی تاریخ میں ۳۳ صفحات کا ضمیمہ غیر متعلق شخصیات کے بارے میں شامل کیا ہے۔ اگر وہ اسے شامل نہ کرتے تو ان کی کتاب کے حسن کو ہرگز نقصان نہ پہنچتا! مولوی مطیع اللہ خاں کو ۸۸۸ صفحات کی تاریخ میں اسی سائز میں سو صفحے کا ضمیمہ شامل کرنے کا حق تھا۔ بلاشبہ انھوں نے اپنی تاریخ کے آخر میں مثلاً عبدالقادر بدایونی کا مفصل تذکرہ لکھا ہے لیکن شاہجہاں پور کاٹ اور اس علاقے سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے، اس سے فائدہ اور فائدہ حاصل ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔　　یہ کہنا کہ غیر متعلق حضرات کے تذکرے نے جگہ گھیر لی۔ اس کی وجہ سے مقامی بزرگوں کے بہت نام چھوٹ گئے۔'' درحقیقت اس اعتراض سے پہلے انھیں چند بزرگوں کے نام گنا کر یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ وہ بزرگ اس شان کے تھے کہ ان کے تذکرے سے تاریخ شاہجہاں پور کی عزت کو چار چاند لگ جاتے۔

آخر مسیح الدین میاں نے مشائخ، شعرا، اطبا وغیرہ میں ایسے حضرات کو شامل کر کے جن کے نام تاریخ مسیح نے ... اور

ڈھونڈے سے نہیں ملیں گے، پتا لگا کر کے شاہ جہاں پور کی عظمت کو کون سے چار چاند لگا دیے ہیں؟

یہ کہنا چاہیے کہ شخصیات کے انتخاب میں ان کا معیار بہت بلند تھا اور ان کی کسوٹی پر جو پورے نہیں اترے انھیں تاریخ میں شامل نہیں کیا۔

۴۔　　مولوی مسیح الدین صاحب نے یہ کیا فرمایا کہ انھوں نے اپنے رسالے کے حکما اور شعرا کو بالکل قلمزد کر دیا ہے۔ یہ آپ مرحوم پر مولوی مسیح الدین میاں آنریری مجسٹریٹ درجہ اول پر محض بہتان ہے۔ ان کی تاریخ کا پورا تیسرا حصہ شاہ جہاں پور کے عہد ماضی، سب حال اور خواتین و مشاہیر کے تذکار میں تھا، جس کا انھوں نے صرف لکھنے کا عزم ہی نہیں کیا تھا، بلکہ اسے مکمل کر کے یادگار چھوڑ گئے تھے، جو ان کے اخلاف کے پاس ان کے عظیم الشان تاریخی ورثے کے طور پر محفوظ ہے۔ بالفرض اگر کسی درجے میں اس میں کوئی صداقت بھی ہو کہ انھوں نے اپنے رسالے کے بعض حکما و شعرا کو چھوڑ دیا ہے تو اس کی مناسب توجیہ یہ ہوگی کہ اپنے معاصرین کے کمالات و فضائل کے اور کے میں اکثر معاصر تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور قدما کے فضل و کمال کے اعتراف میں فراخ دلی کے اظہار سے قاصر رہے ہے۔

۵۔　　اور یہ بات جو انھوں نے کہی کہ ''اس کو بجائے شاہ جہاں پور کی تاریخ کے تاریخ روہیل کھنڈ اور ہندو تاریخ مشاہیر ہند کہنا زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔'' یہ بات انھوں نے در حقیقت مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ کی تیسری جلد کے رد میں کہی ہے۔ در حقیقت شاہ جہاں پور کا تعلق روہیل کھنڈ، اور ہندوستان سے کچھ ایسا رہا ہے کہ اودھ اور روہیل کھنڈ کو نظر انداز کر کے شاہ جہاں پور کی تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ شاہ جہاں پور کی خصوصیات خواہ کتنی ہی ادبی ہوں وہ روہیل کھنڈ اور اودھ سے الگ نہیں ہیں۔

۶۔　　اس کے باوجود کہ میاں صاحب کو تاریخ مطیع ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اس کے حسن و خوبی کے اعتراف پر وہ مجبور ہوئے۔ انھیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ

''ان کی تاریخ معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔''

اس سے آگے وہ پھر لکھتے ہیں

''بہر ... معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مفید تھا، کاش وہ طبع ہو جاتی۔''

۷۔　　اس کی عدم اشاعت پر حسرت کا اظہار کر کے وہ ایک دو دھار اخبر صاحب تاریخ مطیع'' کے اخلاف کے سینے میں بھی بھونک دیتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں

''اور یہ کس درجے افسوس ناک امر ہے کہ مؤلف کتاب کی دیرینہ آرزو اور تمام عمر کی محنت اور ایک بہترین یادگار ان کے ورثا کی عدم توجہی سے بلا طبع کے رہ گئی۔''

میں تو میاں صاحب کے اس نقد و تبصرے کے بعد ان کے ذوق و حسرت کا اندازہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی تاریخ کا چھپنا اور مورخ مرحوم کے اخلاف کا اس کی اشاعت کی فکر سے غافل رہنا ہی میاں صاحب کی خوشی کا موجب تھا۔ میرے خیال میں فاضل مؤرخ کو نامراد قرار دینا اور ان کے اخلاف کی مجبوریوں اور حالات کی عدم مساعدت کا ان کی عدم توجہی کو شاخسانہ قرار دینا میاں صاحب کے احساس افسوس ناکی سے کہیں زیادہ شرمناک ہے۔

آخر میں اس تبصرے کو انھوں نے اس شعر پر ختم کیا ہے

حسرت پہ اس مسافرِ بے کس کے روئیے
جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے!

ہمیں بھی اس جہالت اور بد ذوقی پر افسوس اور نہایت شرمناک افسوس ہے کہ میاں صاحب کو، شاعر کا نام معلوم ہے، شاعری بے قدر ہے آشنا ہیں، وزن وغیرہ کی انھیں خبر ہے اور نہ انھوں نے یہ شعر اس کے صحیح محل میں استعمال کیا ہے۔ انھیں مطیع اللہ خاں کے دنیا کی عدم توجہی سے شکوہ ہے اور شعر میں مسافر کی مقصد میں ناکامی، حسرت زدگی اور بد نصیبی کا افسوس ہے۔ کاش! انھوں نے اس شعر کا استعمال نہ کیا ہوتا۔ یہ شعر مصحفی امروہوی کا ہے۔

البتہ تاریخ صبیح کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں بیر دہیر و فن کی قریب العہد بلکہ مولوی صبیح الدین میاں کی ہم عصر شخصیات جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے جاتے تک نمایاں ہوئی تھیں اور ۱۹۳۲ء میں جب مولوی مطیع اللہ خاں نے اپنی تاریخ کا مقدمہ لکھ کر قلم رکھا تھا، اس وقت ان کی کوئی حیثیت نہ تھی، پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مطیع اللہ خاں کے انتخاب کا معیار بہت بلند تھا۔ ان کی کسوٹی پر یہ تمام شخصیات ہرگز پوری نہیں اتر سکتی تھیں۔ مولوی صبیح الدین صاحب کے پیمانہ انتخاب کا اندازہ لگائیے کہ انھوں نے مولوی حافظ حکیم محمد صاحب کا تذکرہ لکھا ہے، جو ان کے استاد تھے اور انھیں کے اصرار پر مولوی صبیح الدین میاں نے تاریخ لکھنے کا عزم کیا تھا، ان کے تذکرے کے ساتھ ان کے والد گرامی مولوی کفایت اللہ کا ترجمہ بھی لکھا ہے۔ ان کی خوبی علمی فضایل یا درس و تدریس کے کمالات و شہرت نہیں ان کا بھولا ہوا اور سیدھے پن کی شہرت تھی اور ان کے دو بیٹوں مولوی حمد اللہ اور منشی فضل احمد کے ذکر کا اصل سبب یہ تھا کہ دونوں ان کے استاد کے چھوٹے بھائی تھے، مستقبل کی اس توقع پر لکھا تھا کہ دونوں کا انتقال عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہو گیا اور صاحب تاریخ صبیح کو توقع تھی کہ اگر یہ دونوں بھائی عمر طبعی کو پہنچتے تو اس صوبے میں بہ اعتبار علم و فضل نہایت ممتاز و یگانۂ عصر ہوتے۔ اور اگرچہ ابھی ان کے علم و فضل کا ظہور نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کارنامہ منظر عام پر آیا تھا لیکن صاحب تاریخ نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ دونوں بھائی دریا سے کیا گئے کہ علم ہی شاہ جہاں پور سے رخصت ہو گیا۔" اس پر ستم یہ کہ اپنے استاد کے بھانجے منشی عبد السلام کے تذکرہ خیر سے بھی قلم کو روک نہیں سکے کہ انھوں نے میاں صاحب کی تاریخ صبیح کی نہایت کوشش اور ہمدردی" سے کتابت کا کام سر انجام دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ موقع ان کی توجہ اور قابلیت کے اظہار کا تھا لیکن کوشش تو محض بے محل لفظ ہے اور ہمدردی" کا جواز شاید اس طرح ثابت کیا جا سکے کہ انھوں نے کتابت کی اجرت میں کوئی خاص رعایت کر دی ہو یا شاید بالکل ہی نہ لی ہو۔ ان کی تعریف میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ان کا ایک دوا خانہ "رفیق الملک" ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹری شدہ شاہ جہاں پور میں ہے، جس میں دواؤں کا بہت اعلیٰ انتظام ہے۔" اس اظہار سے ثابت کر دیا کہ وہ حکیم نہیں عطار و دوا ساز، رفیق الملک کے مالک تھے اور وہ بھی چلتا نہیں تھا۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

- ☆ ایک یہ کہ اس وقت کوئی حکیم اپنے مطب یا دواخانے کو رجسٹرڈ کرا کے نام کو گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کا بھی ثبوت یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں و حکیم محمود خاں اور مومن خاں کے باپ چچا کے تراجم میں ان کے مطبوں کے رجسٹریشن کا نام آیا ہے۔
- ☆ اور نہ خود صاحب تاریخ صبیح نے اپنے استاد مولوی حکیم محمد کی طبابت کے رجسٹریشن کی خوبی کا ذکر کیا ہے، نہ دیگر اطبا کے تراجم میں کہیں رجسٹریشن کا نام آیا ہے۔
- ☆ اگر منشی عبد السلام بھی طبیب ہوتے تو ان کی طبابت اور حذاقت کا ذکر آتا، نہ کہ دواؤں کے اعلیٰ انتظام کا۔ طبعۂ ما

میں اس مقام پر ایک خاندان کے پانچ افراد کا ذکر آیا ہے۔ حالاں کہ ان میں سے ایک کے سوا کوئی عالم نہ تھا اور اس لیے اس صف میں شرکت کی عزت کا سزاوار بھی نہ تھا۔ حالاں کہ خدا انھیں ذوق سے نوازتا تو وہ اس خاندان کے دو افراد منشی فضل اللہ جو میاں صاحب ہی کے بقول "اعلا درجے کے خوش نویس تھے" اور ان کے بھتیجے منشی عبدالسلام جو خوش نویسی کے فن میں ان کے شاگرد تھے، دونوں کا ترجمہ خوش نویس اطباء کے ضمن میں کر دیتے تو وہ خوش نویسوں کا بھی اضافہ ہو جاتا۔

میاں صاحب نے شکوہ کیا ہے بلکہ تاریخ مطیع کے نقص کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صاحب تاریخ مطیع "اہل فن کے حالات جمع کرنے سے قاصر رہے" اور یہ کہ انھوں نے "اہل فن حضرات کو قطعاً قلم رد کر دیا، جس کی وجہ خاص سمجھنے سے قاصر ہوں۔" لیکن اگرچہ شاہ جہاں پور کی تاریخ میں میاں صاحب کے ذوق تحقیق کے مطابق صرف ایک تعویذ بنانے والا، ایک چابک سوار، ایک قوال، ایک نواب، مرید کے درجہ میں بحری اور دو سرودی "بھی لائق تذکرہ تھے تو صاحب تاریخ مطیع نے ان کا یا ان میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہ کر کے اپنے ذوق لطیف کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔

خان بہادر مولوی مطیع اللہ خاں کی تاریخ اس قسم کے رطب و یابس اور فضولیات سے پاک ہے اور یہ اس کی بہت بڑی خوبی ہے۔

چند ضمنی مآخذ

ابھی آپ نے جن کتابوں پر تبصرہ ملاحظہ فرمایا۔ ان کا شاہ جہاں پور سے راست تعلق تھا۔ خواہ ان کی تصنیفی و موضوعی نوعیت کچھ ہو اور ان کا افادی پہلو بھی کسی درجے کا ہو۔ اس پہلو پر بھی ہم نے توجہ نہیں کی کہ ان کا پایہ استناد کیا ہے۔ یہ بحث ہمارے موضوع ہی سے باہر تھی۔ ان تالیفات کے علاوہ کچھ مؤلفات و مرتبات اور بھی ہیں جن کا راست تعلق اگرچہ شاہ جہاں پور سے نہیں، لیکن اگر تاریخی و سیاسی نقطۂ نظر سے کسی صاحب ذوق کا موضوع ہو تو وہ ذیل کے مجلدات و مرتبات و مؤلفات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش:

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق جو لٹریچر ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر تک مرتب اور غیر مرتب کسی شکل میں بھی منتشر تھا، یو پی گورنمنٹ کے زیر اہتمام مرتب کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ لٹریچر چھ ضخیم جلدوں میں ۳۸۳۲ صفحات پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ پچاسوں صفحات پر مشتمل اشخاص، تاریخی عمارات و مقامات کی تصویریں، دستاویزات کے عکس، اضلاع کے نقشے، مہریں، مختلف قسم کے گوشوارے وغیرہ مجلدات کے مجموعی صفحات پر مستزاد ہیں۔ ہر جلد کے آخر میں اشخاص، مقامات، شہر و قصبات، اخباروں، کتابوں، تحریکوں وغیرہ کا انڈکس شامل کیا ہے اور چوں کہ چھٹی جلد بھی پانچ جلدوں کے مجموعی انڈکس پر مشتمل ہے اس لیے کوئی چیز ہو اور اس کا صوبہ یو پی کے کسی ضلعے سے تعلق ہو، ایک منٹ سے پہلے نظروں کی گرفت میں آ جاتی ہے اور ان مجلدات کے مضامین کی غیر سائنٹیفک تدوین ہونے کی وجہ سے جو نقص یہ مصنف محسوس کرتا ہے وہ یک دم دور ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے صوبہ متحدہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق سیاسی و تاریخی مواد کا ذخیرہ اور اہم و حیرت انگیز دستاویزات کا تاریخ و سیاست سے ہند و پاکستان کی عظیم الشان خدمت ہے جو آزاد ہندوستان میں صوبہ یو پی کی حکومت نے انجام دی ہے۔ تاریخ کا یہ بیش بہا سرمایہ جو

ہمارے سامنے غیر مرتب صورت میں چھ جلدوں میں محفوظ جمع ہو گیا ہے۔ اس نے یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ اب اس پر علاقہ و تحقیق و تدوین کے اہتمام کیے جائیں۔ تاریخ کے پچاسوں موضوعات ایسے سامنے آتے ہیں، جن کا تعلق برِ اعظم ہند و پاکستان کے کسی ایک صوبہ یا ریاست سے نہیں بلکہ پورے برِ اعظم کے مفاد سے ہے۔ ان پر توجہ کی جائے۔

تاریخ جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء:

روہیل کھنڈ یا اس کے کسی ضلعے کی کوئی تاریخ لکھی گئی، جس میں "شاہجہاں پور" نے اپنا مقام نہ پایا ہو۔ اس سلسلے میں ۱۸۵۷ء کی تحریکِ حریت کے حوالے سے چند تالیفات ایسی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" ایک اہم تالیف ہے جو جنگ آزادی کی سو سالہ یادگار منانے کے موقع پر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی موقع پر "فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش" کی اشاعت کا آغاز ہوا تھا، لیکن رضوی صاحب اپنی تالیف میں اس سے استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش کی تیسری، پانچویں جلدوں میں خاص طور پر شاہجہاں پور میں تحریک کی سرگرمیوں کا ذکر آیا تھا اور وہ جلدیں ۹۵۵ء اور ۹۶ء میں شائع ہوئی تھیں۔ البتہ انھوں نے اپنی تالیف کے دوسرے ایڈیشن میں ان سے خوب فائدہ اٹھایا اور اس میں شاہجہاں پور نے بھی اپنا حصہ پایا۔ میرے سامنے اس کی لاہور اشاعت ہے جو ۲۰۰۷ء میں جنگ آزادی کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر شائع ہوئی۔ زیرِ نظر اشاعت کی اطلاع کے مطابق جو ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں نظر ثانی و اضافہ شدہ رام پور سے شائع ہوا تھا، یہ اس کی نقل ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات):

یہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیف ہے جو ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ فاضل مؤلف کا تعلق چونکہ آنولہ ضلع بریلی سے تھا۔ اس لیے ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے بریلی اور روہیل کھنڈ کے دیگر اضلاع میں انقلابی سرگرمیوں کے تذکرے نے اس تالیف میں زیادہ جگہ پائی۔ اس میں شاہجہاں پور بھی ہے اور وہاں پیش آنے والے واقعات اور مجاہدین اور ان کی خدمات کا ذکر آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ان کے مقام کے اعتراف سے گریز نہیں کیا۔

قومی محاذِ آزادی اور یوپی کے مسلمان:

اس کتاب کی فاضل مؤلفہ ڈاکٹر عابدہ سمیع (علی گڑھ) ہیں۔ ان کے سامنے چونکہ اسی موضوع پر رضوی و قادری صاحبان کی مرتبہ تالیفات کے علاوہ فریڈم اسٹرگل کا نہایت قیمتی ذخیرہ بھی تھا، جس سے انھوں نے اپنی تالیف میں استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کی تالیف میں ترتیب مضامین اور مباحث کا زیادہ سلیقہ اور حسن پیش کش پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں دہلی میں شائع ہوئی تھی۔
شاہجہاں پور کے تذکرے سے اس کے صفحات مزین ہیں۔

حواشی

۔ "تاریخ مطبع" (جلد اول) صفحہ ۲۲،۲۳

۲۔ ایضاً: صفحہ ۲۲۲ بہ حوالہ "اخبار محبت"۔ "انہار البحر" و "بہادر نامہ"

۳۔ ایضاً: صفحہ ۲۸۲-۸۳

۴۔ ایضاً: صفحہ ۲۸۲

۵۔ "تاریخ مطبع" جلد اول صفحہ ۲۱

۶۔ ایضاً: صفحہ ۲۱۷

۷۔ "تاریخ صحیح" حصہ اول صفحہ ۱۲۷-۳۱

۸۔ 'تاریخ شاہ آباد' ۲۱۰ - ۲م ماہنامہ "مظفری" (حصہ اول) لکھنؤ، مطبع مجتبائی، ۱۹۱۷ء صفحہ ۲۱۸

۹۔ "تاریخ مطبع" صفحہ ۲۷

۰۔ "تاریخ مطبع" صفحہ

۔ "تاریخ مطبع" جلد اول صفحہ ۱۲۵

۲۔ "تاریخ صحیح" جلد اول صفحہ ۱۲۸-۲۹

۳۔ "تاریخ مطبع" صفحہ ۲۷

۴۔ "تاریخ مطبع" صفحہ ۲۲۱

۵۔ "تاریخ صحیح" جلد اول صفحہ ۱۲۹

۶۔ "تاریخ مطبع" صفحہ ۲۷

۷۔ "تاریخ مطبع" صفحہ ۲۷

۸۔ "تاریخ مطبع" صفحہ ۲۷

۹۔ "تاریخ صحیح" جلد اول صفحہ ۲

۲۰۔ "تاریخ صحیح" صفحہ ۱۲۳

۲۱۔ "تاریخ صحیح" صفحہ ۲۲۳

۲۲۔ "تاریخ صحیح" صفحہ ۲

۲۳۔ ایضاً ۲۳

۲۴۔ "تاریخ صحیح" حصہ دوم صفحہ ۱۸۷-۸۸

۲۵۔ "تاریخ صحیح" صفحہ ۲

Abstract

Shahjahanpur is an important district and city of United Provinces, India, having a fertile soil that has produced a lot of great personalities. In this article the author has made an attempt to explore the varied dimensions of the history of Shahjahanpur by going through nineteen books, published and unpublished, on the topic. These books have been discussed and reviewed in order to reveal the multiple aspects of the history of Shahjahanpur. Some of the manuscripts, discussed here are not available anymore and thus this article provides a good source of information for the researchers who went to study any related topics.

The books and manuscripts mentioned in the article include Bahadur Name, Bahadur Khani, Dalair Nama, Akhbar-e-Mahabbat, Ansab-e-Qabail-e-Afghani, Tazkiratul Ahbab, Anharul Bahr, Gazetteer of Shahjahanpur, Tareekh-e-Shahjahanpur, Tareekh-Ahsani and Shu'ara-e-Ajam-o-Hind.

معیار، علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، شمارہ ۱، جنوری-جون ۲۰۰۹ء

تذکرہ گلدستۂ کرناٹک

تصنیف: غلام موسیٰ رضا خان راقمؔ
ترجمہ و تحشیہ: پروفیسر محمد ایوب قادری*
ترتیبِ نو: "معیار"

"گلدستۂ کرناٹک" حکیم غلام موسیٰ رضا خان راقمؔ (۱۷۷۴ء - ۱۸۳۲ء)
کا تحریر کردہ فارسی شعرا کا نادر و تا حال غیر مطبوعہ تذکرہ ہے۔ راقمؔ کا تعلق
کرناٹک (مدراس) سے تھا۔ تذکرے میں اٹھارویں و انیسویں صدی کے ۷۰ شعرا کا
احوال شامل ہے، جو راقمؔ کے معاصر تھے اور چوں کہ مولف سے راست روابط یا
شناسائی رکھتے تھے، اس لیے قوی امکان ہے کہ اس میں مذکورہ شعرا کے حالات
بڑی حد تک قابلِ بھروسا اور مستند تحریر کیے گئے ہیں۔ مولف نے اپنے حالات
تذکرے میں تحریر کرتے ہوئے اس تذکرے کی تالیف کا آغاز سنہ ۱۷۹۴ء / [illegible]
بتایا ہے لیکن ۲۵ سال تک لکھتے رہنے کے بعد اس نے اس سلسلے کو موقوف کر دیا
تھا۔ مگر پھر کرناٹک کے نواب اعظم جاہ کی فرمائش پر دوبارہ لکھنے کا آغاز کیا
اور اپنی وفات (۱۸۳۲ء) تک اس میں اضافے کرتا رہا۔

راقمؔ کی پیدائش محمد پور (ارکاٹ) میں ہوئی۔ اجداد کا پیشہ طب
تھا۔ راقمؔ نے ابتدائی تعلیم ملا گیر (نیلور) میں حاصل کی، پھر مدراس پہنچ کر
مولوی محمد باقر آگاہ سے تلمذ اختیار کیا اور تعلیم مکمل کی۔ ملازمت کا آغاز
"ارکاٹ" میں نواب عمدۃ الامرا کے دارالانشا میں بحیثیت منشی کیا لیکن نواب کے
انتقال کے بعد مدراس آ کر پیشۂ طب میں دربار سے منسلک ہوا اور حکیم باقر
حسین خاں کا خطاب پایا جو اس کے دادا کا خطاب بھی تھا۔ پھر نواب اعظم جاہ نے
اسے اپنا منشی نامزد کیا اور "سراج التواریخ" نامی کتاب کی تالیف پر مامور کیا۔

تذکرہ "گلدستۂ کرناٹک" کا مصنف کا خود نوشتہ نسخہ مدراس کے
"کتب خانۂ مفید عام اہلِ اسلام" میں محفوظ ہے، جب کہ ایک اور نسخہ مدراس

* [illegible]

بھی کے مولوی عبدالرحمن کے ذخیرۂ کتب میں شامل تھا [۱]۔ اس تذکرے کا ایک سرپہلہ قلمی نسخہ "ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ" کے کتب خانے میں محفوظ ہے [۲]۔ شاعری اور نثر میں اس نے بیدلؔ، ظہوریؔ اور ابوالفضل کے تتبع کی کوشش کی ہے [۳]۔

یہ تذکرہ شائع نہیں ہوا۔ صفحۂ صدر نمبر ۲۷۳۹ "کتب خانہ سعیدیہ اہلِ اسلام" مدراس کے نسخے کو مولانا محمد عمر یافعی حیدرآبادی نے نقل کیا تھا اور آخر میں کتابت کی تاریخ ۲۱ مئی ۱۹۳۵ء تحریر کی تھی۔ اس منقولہ نسخے کی بنیاد پر ڈاکٹر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء) نے اس کی تلخیص و ترجمہ کیا تھا اور کئی حواشی کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ تا حال غیر مطبوعہ رہا۔ استاذی ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم و مغفور نے، کہ اس عاجز پر اُن کی عنایتیں و شفقتیں بے پایاں رہی ہیں؛ اپنے مسودے کا عکس اس عاجز کو عنایت فرمایا تھا۔ چوں کہ اصل فارسی تذکرہ شائع نہیں ہوا اور عام طور پر اس کے قلمی نسخے بھی عام دسترس میں نہیں ہیں، اس لیے اس کی تلخیص و ترجمہ مع حواشی، کہ جو ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم کی کاوش ہونے کے باوصف بھی اور غیر مطبوعہ اور ایک تبرک ہونے کے سبب افادۂ عام کے لیے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

موجودہ حالت میں، مسودے کے صفحۂ اول پر علی الترتیب یہ عبارتیں تحریر ہیں:

تذکرۂ شعرائے فارسی

موسومہ

گلدستۂ کرناٹک مؤلفہ علی رضا المتخلص بہ واثق

سنہ کتابت غرۂ شہر ربیع الثانی ۱۲۳۲ھ، صورت اتمام یافت

نقل از کتب خانہ اہلِ اسلام مدراس، نمبر ۲۷۳۹، کتابت ۲۱ مئی ۱۹۳۵ء

از قلم مولانا محمد عمر یافعی حیدرآبادی

تذکرہ کے پہلے ورق پر ۱۲۱۰ھ لکھا ہے، جو یہ عبارت ہے

"المالک الحقیقی ہو اللہ و من حیث الظاہر امیدوار علی موسیٰ رضا علی عفی عنہ مسطری مسطر

عربکاری تنقیح، صفحات ۵۵

۱۔ "محمد یوسف کوکن عمری، "Arabic and Persian in Carnatic (1710-1960)"، مدراس، ۱۹۷۴ء، ص ۵۶۱"

۲۔ ایوانوف، "W. Ivanow, Catalogue of Persian Manuscripts in the Library of Asiatic Society, Calcutta" جلد اول، ضمیمہ اول، کلکتہ ۱۹۲۸ء، ص ۹۱ تا ۔

۳۔ واثق نے "دیوانِ واثق" کے علاوہ کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ حالات کے لیے: "گلزارِ کرناٹک"، [illegible] ص ۱۸۹؛ "صبحِ وطن" ص ۱۸۰ تا ۱۸۱؛ "گلزارِ اعظم"، ص [illegible]؛ "اشاراتِ بینش"، ص ۹۳ تا ۹۵؛ "حدیقۃ المرام"، ص ۲۳؛ "اردو کی مدد ساخت ترقی" [illegible] ص ۵۶۲ تا ۵۶۴؛ "بنگال میں فارسی"؛ "تاریخ تذکرہ ہائے فارسی"، ص ۴۶ تا ۴۵

۵۔　<u>حیدری، غلام حسین</u>

حیدری تخلص، غلام حسین ولد محمد صادق مکری۔ پہلے جودت تخلص تھا، [۱۳] جب ان کے بھانجے نے تخلص کیا تو انھوں نے حیدری تخلص کرلیا۔ مکر کولر کا ایک قصبہ ہے ان کے بزرگ وہیں کے رہنے والے تھے۔ شعروشاعری میں نامور تھے، ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ غلام علی خاں کی ملازمت میں رہے وہیں فوت ہوئے۔

نیست　آئینہ　ساختن　کارے　صاف　دل　سکندری　باشد

۶۔　<u>ذوقی ویلوری، سید عبداللطیف</u>

ذوقی تخلص، سید عبداللطیف عرف غلام محی الدین نام سید ابوالحسن قربی کے فرزند سعید ہیں، [۱۴] جن کا ذکر آگے ذیل میں آئے گا۔ ذوقی بھی عارفانہ ذوق رکھتے تھے۔ شعروشاعری میں دست گاہ کامل تھی۔ غزل و قصیدہ خوب لکھتے ہیں، نثر پر بھی قدرت تھی، قدما کے رنگ میں کہتے تھے۔ عربی و فارسی اپنے والد حضرت (قربی) سے پڑھی۔ علوم معقول و منقول اور اصول و فروع میں فاضل و کامل تھے۔ تین لاکھ اشعار انھوں نے لکھے ہیں۔ دو دیوان، پانچ مثنویاں (در تتبع خمسہ نظامی گنجوی)، مثنوی "معجزۂ مصطفیٰ ﷺ" [۱۵] قصاید متفرق، "رسالہ علم فرائض"، "رسالہ علم بیان و صرف" ان سے یادگار ہیں۔ [۱۶] ۱۱۹۳ھ میں انتقال ہوا۔ [۱۷]

۷۔　<u>راقم، علی رضا، صاحب تذکرہ</u>

خاکسار علی رضا ہاشمی، نسب [۱۸] شافعی مذہب، پیدائش محمد پور، قادری سلسلہ، راقم تخلص، ۱۱۸۰ھ میں بمقام عرف ارکاٹ میں پیدا ہوا۔ جب ہوش ہوا تو صاحب کمالان علم و فن سے استفادہ کیا۔ "قرآن کریم" کے بعد فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ "انشائے ہیری"، "ابوالفضل"، "مجمع الانشا"، "مناظر الانشا"، "رسالہ قوشجی" اور دوسرے فارسی رسالے امیر الدین علی ابن شرف الدین علی خاں تمکین اور سید کمال الدین کمال سے پڑھے، اس کے بعد عربی درسیات مولوی حافظ محمد حسین سے پڑھیں۔ "میبذی" اور "رسالہ تصدیق و تصور" (میر زاہد) بھی ان سے پڑھے۔ بہت سی کتابیں مثلاً "نحو المیر"، "عشرۂ کاملہ"، "مقامات حریری"، "اربعین نووی"، "منہاج" (فقہ شافعی)، "تحفۃ العراقین"، "نفحۃ الیمن" وغیرہ کو دیکھا اور ان کے غوامض حل کیے۔ شعروشاعری میں حضرت آگاہ سے استفادہ کیا، پھر خاندان فن علم طب کا شوق ہوا "سدیدی"، "نفیسی"، "شرح اسباب"، "مفرح القلوب" وغیرہ ملا عبدالعلی بحرالعلوم ابن ملا نظام الدین ابن ملا قطب الدین، حکیم احمد اللہ خان اور مولوی ارتضا علی خان خوشنود سے پڑھے اور ان فن میں کمال حاصل کیا۔ شہرت ہوئی، نواب عظیم الدولہ بہادر کی بیماری میں طلب ہوئے اور اطبا کے زمرہ میں ملازمت لی۔ استفادۂ علوم کا سلسلہ جاری رہا۔ "خلاصۃ الحساب"، "چغمینی"، "تاسیس" (در ہندسہ) انجاری سے پڑھے اور محمد صالح حجازی سے "ترمذی" سے اور صحاح ستہ کی سند حاصل کی۔ [۱۹]

بصورت خضر رہ گردید کثرت فکر دانا را　سواد خط آئینہ باشد روئے معنی را

بہ تر سا بچہ او کرد احیا دین عیسیٰ را　کہ کی داند رعشق و فلک خط چلیپا را

۸۔　<u>قربی ویلوری، شاہ ابوالحسن</u>

قربی ویلوری، سید ابوالحسن نقوی نام ابن سید عبداللطیف۔ [۲۰] ان کا سلسلہ نسب علی نقی پر منتہی ہوتا ہے۔ ان کی والدہ سید ابوالقاسم کی صاحب زادی تھیں جو علم معقول و منقول اور فروع و اصول میں مشہور زمانہ تھے۔ عالم گیر بادشاہ نے ان کو پنج ہزاری منصب اور شاہ جہاں

نرسد جامن او چہ کنم خوار خود را　　بچہ رو دہم تسلی دل دلدار خود را

۱۷۔ اختر، نظام الدین

دل رو کر بدو و پسرے باختہ ام دل　　شد تشنگی صندل سبب درد سر من
در دیدہ خود جاں بہم بازگہ را　　افتد چو دگر بار بر وصل نظر من
سیل تقوٰی کے شود مانع من مستانہ　　خوشہ انگور دانم سبحہ صدانہ را
در شگفتی شد بہ رنگ گل دل ما چاک چاک　　با بہار آمد خزاں بیہات دربستان ما

۱۸۔ اختر، محمد مختر جہاں

اختر تخلص، محمد مختر جہاں، محمد باقر کے بلا واسطہ جد ہیں۔ مختر جہاں لقب تھا۔ مختر جہاں، نواب باقر علی خاں بہادر پر نواب مرتضیٰ خان بہادر مرحوم کے داماد تھے جو عالم گیری دور کے امیر اور بزم جہاں گیری کے روشناس اور قبیلہ نایط کے نامور لوگ تھے۔ پنج ہزاری منصب تھا۔ آخر زمانے میں جب کہ اعظم شاہ کی بہادر شاہ سے لڑائی ہوئی تو اس میں مختر جہاں شہید ہوئے اور اپنے آقا کے کام میں جان نثار کر دی۔

شعر خوب کہتے تھے۔ ان کے اشعار نہ مل سکے۔ محمد سعید اسلمی سے ایک شعر سنا ہے

اختر ائی بر سر نخش است لوش عافیت　　ماسیجا در نسازد خاطر آزاد ما

۱۹۔ آشکار، قادر نواز خان

اصلی نام محمد عبد اللہ ولد شیخ محمد تلمسانی است۔ شیخ محمد تلمسانی، عالم، متورع، قاری، حافظ قرآن اور محدث تھے۔ شہر تلمسان مغرب میں ہے۔ آغاز شعور سے تحصیل علم کی طرف مائل ہوئے۔ وطن مالوف سے مصر آئے، وہاں تجوید، حدیث اور دیگر علوم حاصل کیے اور علمائے نامدار سے سند حاصل کی، وہاں سے مدینہ گئے، حج کیا، پھر ملک روم کی سیاحت کو گئے۔ بادشاہ روم سے ملے، دوبارہ حج و زیارت کو گئے۔ چوں کہ علوم معقول کا شوق تھا لہٰذا ہندستان کا ارادہ کیا۔ دو سال دہلی میں رہے۔ مولانا نظام الدین کی شہرت سن کر ان کی خدمت میں پہنچے اور علوم معقول کی تحصیل کی۔ مولانا سے اجازت لے کر دوبارہ دہلی آئے۔ امرا و اعیان سے تعارف ہوا۔ ان کے کمالات کا شہرہ محمد شاہ بادشاہ کے کانوں تک پہنچا۔ انھوں نے اپنے حضور میں طلب کیا۔ محمد شاہ بادشاہ نے قرآن کی تجوید کی سند شیخ سے حاصل کی چوں کہ شیخ علم میراث میں بے نظیر تھے۔ اس زمانے میں ان کو مدرسہ بادشاہی کا مدرس و متولی کر دیا جو جامع مسجد کے قریب تھا۔ مدرسہ کی سند تولیت راقم نے دیکھی تھی۔ بعض وجوہ کی بنا سے وہاں سے نجیب الدولہ امیر الامرا کی رفاقت میں چلے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے روشن الدولہ ضابطہ خاں کے رفیق ہوئے۔ اسی زمانے میں شیخ نے شادی کی۔ قادر نواز خان، نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ پھر شیخ تلمسانی اپنے چھوٹے بچوں کے ہمراہ اس ملک میں آئے اور نواب امیر الہند والاجاہ کی ملازمت حاصل کی اور محمد پور ارکاٹ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ایک زمانے تک وہ اسی خدمت پر مامور رہے۔ علم شریعت کے نفاذ میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔

قادر نواز خاں فہم و فراست میں ممتاز، نہایت ذہین و فطین تھے۔ طبع موزوں تھی۔ جب وہ نواب امیر الہند والاجاہ کی ملازمت سے سرفراز ہوئے تو ان کے اعزاز و شرف میں اضافہ ہوا۔ خانی و بہادری کا خطاب ملا۔ فوج کے داروغہ مقرر ہوئے۔ نواب کے منظور نظر تھے، کوئی حکم ان کے واسطے کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ نواب عمدۃ الامرا بہادر کے عہد میں جاگیر اور جنگی کا خطاب ملا۔ جناب مولانا اسد العلی (بحر العلوم

سے بیعت کی۔ ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔

حسن شگفتۂ جذبۂ مستانۂ خویشم　　آئینہ حیران پری خانۂ خویشم
دل باختگاں را خبر از ہر دو جہاں نیست　　از بسکہ شدم محو تو بیگانۂ خویشم

۴۰۔ <u>بیا، سید مستان حسین</u>

بیا، سید مستان حسین۔ بیا تخلص کرتے تھے، شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ خاندان سادات سے تھے۔ اخلاق و عادات حمیدہ کے مالک تھے۔ درویشانہ وضع تھی۔

درم ما در گرہ دارد گہر دار　　اگر مسک دو صد لک دام دارد
بفکر زلف و زلفش وقت ما شب دارم　　نماز شام کم با نماز صبح ادا

۴۱۔ <u>تجلی، حکیم عظیم الدین</u>

تجلی، حکیم عظیم الدین تجلی۔ ہندوستان کے باشندے تھے۔ آب و دانہ کے تقاضے کی وجہ سے اس علاقے میں وارد ہوئے۔ ۱۲۱۴ھ میں یہاں آئے۔ ان کو آسودگی حاصل ہوئی اور یہاں کے بزم شعرا کی رونق ہیں۔ فضیلت کے مالک ہیں۔ علم طب میں خوب دست گاہ رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالعلی بحر العلوم کے شاگرد ہیں۔ ان کی ہندی کے مرثیے اور مثنوی مشہور اور شعر اس میں مقبول ہیں۔ ۱۲۸۰ء میں اس زمانے میں شہر چناپٹن سے نظر نگر کے مفتی مقرر ہوئے، کچھ دنوں آسائش سے زندگی گزاری۔ ۱۲۳۱ھ میں انتقال ہوا۔

بسکہ لبریز انا الحق بود اندیشۂ ما　　خون منصور تراود ز رگ و ریشۂ ما
چاک چاک کہ سر زند او سینہ بر زمیں　　غلطیدہ ام بکوئے تو وحشیہ بر زمیں

۴۲۔ <u>جودت، غلام حسین</u>

جودت تخلص، غلام حسین ولد محمد یار خان۔ یہ شعرائے عصر میں ممتاز تھے۔ نازک خیال، جودت طبع اور ذہنی رسا کے مالک تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ کتب درسیہ کی تحصیل نامور اساتذہ سے کی۔ چناپٹن سے نظر نگر میں رہتے تھے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں لگے رہتے۔ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ۱۲۶۳ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے ایک شاگرد محمد عسکری نے ان کی تاریخ انتقال "خاتم الشعرا" سے نکالی ہے۔

بسکہ از نازک مزاجی بے دماغم کردہ اند　　می پرد از خویش موج چین پیشانی مرا
در لباس شرم چوں نور نگہ پوشیدہ ام　　گوشۂ چشمے بس شد بعریانی مرا

۴۳۔ <u>حاجی، عبدالہادی</u>

حاجی تخلص، عبدالہادی نام۔ ان کے والد عبدالکریم خان نحوی تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ نازک بیانی، رنگین خیالی اور فصاحت و بلاغت ان کی خصوصیات ہیں۔ جب وہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے تو اس کے بعد انھوں نے اپنا تخلص حاجی رکھا۔ وطن دہلی۔ دہلی سے اس علاقہ (مدراس) میں آ گئے اور ایک زمانے تک یہاں رہے۔ شعر خوب کہتے تھے۔

بچشم تا رسید از یار پیغام رسیدن ہا　　بود بال کبوتر دیدۂ شوق از پریدن ہا
بعرض حال دل بی گریہ نامم لال می گردد　　چو چشم اضطراب آئینۂ احوال می گردد

۴۴۔ <u>خلوص، سید محمد</u>

تھے۔ عجیب عالی ہمت اور حاتم خصلت تھے۔ خویش و بیگانے میں سے جو کوئی ان کے گھر پہنچتا تو نفیس اشیا اس کو دکھاتے، دیکھنے کے بعد جب وہ تعریف کرتا، وہ اس چیز کو اس شخص کو دے دیتے۔ اگر وہ انکار کرتا تو ناخوش ہوتے اور اس کے قبول کرنے کے لیے مبالغہ اور خوشامد کرتے کہ اس بیچارے کو قبول کرنا پڑتی۔ ویلور کے دامنی کوہ ۱۲ھ میں ان کا مقبرہ ہے۔ ۳۳ھ

۲۸۔ ولی، بیتابی

ان کا اصلی نام سید علی ابن میر باقی خان ہے۔ خوش فکر اور شیریں کلام شاعر ہیں۔ شعر خوب کہتے ہیں۔ فقیر کی دوست سے ہیں اور فن طب میں شہرت رکھتے ہیں۔ ۱۲۱۰ھ میں نواب سراج الدولہ امیر الہند والاجاہ کے یہاں زمرۂ اطبا میں ملازم ہوئے اور وہ پ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ محمد پور میں اوقات میں متعین رہے کچھ دن وہاں گزارے۔ راقم الحروف کو ان کے اشعار نہیں ملے مگر یہ دو تین شعر میرے بھائی شریف علی خان مرحوم نے بھیج دیے ہیں۔

دل پژمردہ را از گریہ خندہ ی توان کردن　　　　زنجیں آب، صحرا را گلستاں ی توان کردن
نمی گنجد دل نازک تحمل حرفے　　　　صد پہ نیم نفس شیشۂ حباب بشکند

۲۹۔ راغب، میر علی رضا

راغب تخلص اصلی نام میر علی رضا۔ قدیم اور مشہور شاعر ہیں۔ نواب سعادت اللہ خان مرحوم کے زمانے میں اس ملک میں آئے اور ویلور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ پختہ فکر اور نازک بیان شاعر تھے۔ مزید حال معلوم نہ ہو سکا۔

جاں بازئی عاشقانہ محال است ز زاہد　　　　راغب نبود جرأت پروانہ مگس را
داریم بانگاز تو اے درد محبت!　　　　بیمار ترا مائل بستر نتواں یافت

۳۰۔ رونق، عارف الدین خان

رونق، عارف الدین خان ابن حافظ محمد معروف بن حافظ محمد عارف الدین برہان پوری، حضرت آگاہ ویلوری سے تربیت و فیض یافتہ ہیں۔ سیدھے خوش فکر شاعر ہیں۔ راقم السطور سے ربطۂ اتحاد و اخلاص ہے۔ مجھے ملاقات سے شاد کام کرتے ہیں۔ تاج الامرا خلف نواب عمدۃ الامرا کے جلیس تھے۔ چار پشت سے ان کے خاندان میں حافظ کلام اللہ ہوتے آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے باپ (دادا) کے نام کا سجع اس طرح کہا ہے

ع معروف و عارف است شد در عارف

ان کے والد کی بزرگی و تقدس حدِ تحریر سے افزوں ہے۔ ان کے والد اپنے اوقاتِ عزیز قرآن کریم کی تلاوت و تہجد میں صرف کرتے ہیں۔ وہ نواب والاجاہ کے زمانے میں برہان پور سے یہاں آئے اور سکونت پذیر ہو گئے۔ ۳۵ھ

بہ سنگیں دلے خوں ی کند لبہائے شیدا را　　　　کہ طاقی ہر دو قبلہ باشد گہوتر سادا
سوخت دل شعلۂ حیداتی با گرد گل باغ آشنائی با

۳۱۔ رغبت، میر مبارک اللہ خان

میر مبارک اللہ خان نام، راغب تخلص۔ ۱۶ھ ان کا اصلی نام سید احمد بن سید محمد عاصم خان بن سید معصوم مہان مالی ہے۔ مام پیٹ کے مضافات میں ایک قصبہ ہے اور ان سادات کی سمت اس قصبہ امام کی طرف ہے اور ان کی اسی سمت مذہب امامیہ، جس سے شیعہ مراد ہے۔

نکہت ہے۔ سید معصوم خاں، عبداللہ خاں کے داماد ہیں کہ جو نواب نظام الملک آصف جاہ کی مصاحبت میں تھے اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ سید محمد عاصم خاں شروع میں اپنے ماموں خواجہ سعد اللہ خاں کے توسط سے نواب سراج الدولہ بہادر والا جاہ کے حضور میں آئے اور ملازمت سے مشرف ہوئے اور جلدی تعلقہ پلنار کے فوجدار مقرر ہوئے اور آخر میں نواب نے اپنی سرکار کا مدار المہام مقرر کیا تا آنکہ بہادر اور جنگ کا خطاب اور ایک لاکھ روپے کی جاگیر مرحمت ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی نہایت احترام سے گزاری اور ۱۲۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ مدراس میں پیدا ہوئے اور بچپن میں میر مبارک اللہ اوصاف عالیہ اور اخلاق حمیدہ سے متصف تھے۔ میر مبارک اللہ اوصاف عالیہ اور اخلاق حمیدہ سے متصف تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ وہ مدراس میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شعر جناب آگاہی کو دکھاتے تھے۔ یہ فقیر خاکسار سے ربط و اتحاد اور محبت و مودت اور بے تکلفی ہے اور اپنے سلوک سے مجھے احسان مند کرتے رہتے ہیں۔ ۹۲

چو رقم سنے گلشن بے تو اے قامت گریباں ہا — کشادہ برگ گل شد ہا چاک گریباں ہا
زبس دیدہ لخت دل برنگ غنچہ ی آید — چو چشم مست او گل کرد چشم گلستاں ہا
نباشد از نزاکت تاب سے نقش دامنش را — اگر از نکہت گل ہم بگردانی لباس را
بسکہ دارد اشک ما صد جلوہ نیرنگیش — چوں دم طاؤس باشد پنجۂ مژگان ما

۳۲۔ زین العابدین شوستری

زین العابدین شوستری ابن سید رضی، شوستر کے سادات امیر اور نواب نظام الملک آصف جاہ مدار المہام میر عالم کے سگے بڑے بھائی ہیں۔ شعر و شاعری خوب کرتے تھے۔ مدتوں اس ملک میں رہے اس کے بعد بالاگھاٹ چلے گئے اور حیدر علی خاں بہادر اور ٹیپو سلطان کے ملازم ہو گئے۔ اگرچہ عمدہ منصب تھے مگر قدردانی اور مرتبہ شناسی کی وجہ سے مقصود دلی حاصل نہ ہوا اور آرام نہ اٹھایا۔ وہیں انتقال ہوا۔ اچھے شعر کہتے تھے۔

از من بود آراستگی شاہد غم را — چاک دل من شانہ کند زلف الم را
ترک نازی ہائے چشم سرمہ سا — ہجر شب خون فرنگی بے صدا

۳۳۔ تمکین، سید محمد خان

تمکین تخلص سید محمد خاں نام شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اصفہان میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ان کے والد وہاں کے ذی عزت سادات سے تھے۔ وہ اپنے وطن سے مچھلی بندر آئے، کچھ دنوں وہاں آرام کیا۔ ۲۷ سال ہوئے کہ مدراس آگئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ پہلے دس سال تجارت کا مشغلہ رہا۔ اہل دربار سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ آخر کو یہاں کے اہل اقتدار سے تعلق پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ حافظ محمد مسعود خان بہادر مدار الملک کی ملازمت میں آگئے جو امیر الامراء کے خطاب سے مشہور ہیں۔ الخ پھر ان کو ترقی ہوئی، خان کا خطاب ملا۔ عہدہ خدمت پر سرفراز ہوئے۔ امیر مذکور کے انتقال کے بعد والا جاہ کے ملازم ہوئے۔ بہادر کا خطاب پایا اور داروغہ دیوان حضور مقرر ہوئے۔ ۱۲۱۶ھ میں انتقال ہوا۔ ۹۳ صاحب دیوان ہیں۔

خواست گردوں کہ مرتم سکند — میر رہ تو خاک ساخت مرا
بہ یگانہ روش در خط سے — خوط داد و پاک ساخت مرا

۳۴۔ شایاں، محمد اسلم خان

غط سے سد دو ہوتا ہے کر دروش ہیں

زاہد و شیخ و برہمن را کر ی بینی بکلم	ہر یکے فرعون وقت دو است لیک اسباب مجست

آمد آں سلطان خوباں شیشہ با پر گل کنید	فرش پا اندازِ راہش راز برگ گل کنید

۳۹۔ عزت، عبدالقادر

عزت تخلص، عبدالقادر حلیم نام ہے۔ عالی فکر شاعر ہیں۔ نظم و نثر خوب لکھتے ہیں۔ قوم نوایط سے ہیں۔ شمس الدولہ اور ان کے بیٹے صبغۃ اللہ کے عہد میں ان کا اعزاز و اعتبار تھا۔ خط شکستہ خوب لکھتے تھے اور اس فن کے سیکھنے والوں کو سکھاتے تھے۔ ہمیں ہم نے بہت تلاش کی مگر دو سے زیادہ شعر نہیں ملے

پائے تا سر تشنہ ام جان ناکام مپرس	آرزو با ہر قدر خوں گشت من ساغر زدم

عزت بہ فہم ہمدمے یارے سوگند	ہر کس کہ بجود کاست کمالے دارد

۴۰۔ عظیم، عظیم الدین

عظیم الدین ولد خان مرحوم نہایت مشہور شخص تھے، دربار میں متعارف تھے، آخر میں انھیں باپ کا خطاب ملا۔ یہ ان کا شعر ہے۔

زخم میدان حشم مظلوم از گل کنید	حقہ ہائے جو ہم از دیدۂ بلبل کنید

۴۱۔ عاصی، نورالدین محمد خان

عاصی تخلص نورالدین محمد خان نام ہے۔ والا جاہی ملازم تھے۔ موزوں طبع تھے۔ ان کا شعر ہے۔ ۲ے

جلوہ نیست در آئینۂ دل	شکن دل کہ شکست من و نیست

۴۲۔ عزت، جگناتھ پرشاد

عزت تخلص، نام جگناتھ پرشاد، خوش اعتقاد ہیں۔ کامستھ سری واستو ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق ہے۔ عزت تخلص کرتے ہیں۔ خوش وضع اور موزوں طبع ہیں۔ دو اسی دیر میں طویل طویل غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ضخیم دیوان مرتب ہو گیا ہے۔ ہم نے نہیں دیکھا ہے۔

در چمن بنگر نشست من و نیست	دور پیمانہ بدست من و نیست

۴۳۔ فائق، سید خیرالدین

فائق تخلص، خیرالدین نام، مرد لیان امام کے ایک معتقد خاندان سے ہیں۔ ان کے باپ کا نام سید معصوم ابن سید ابوالقاسم بن سید ...ی ہے اور امام رنج کے نواح میں ایک گاؤں ہے اور یہ سادات سے منسوب ہیں۔ فائق رنگین طبع اور فکر رسا کے مالک ہیں۔ ... پر قدرت ہے۔ سید ابو سعید والا ان کے ہم سال اور ہم عصر ہیں۔ مرد لیان نام میں کوئی ایسا خوش فکر اور رسا خیال پیدا نہیں ہوا ... صلاحیتوں کے زیادہ شہرت نہیں ہے۔ فی الحقیقت وہ مرد لیان امام میں غنیمت ہیں۔ ۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ محمد خیرالدین فائق نام تخلص ہے اور اسی سے ان کا سال پیدائش نکلتا ہے۔ حضرت آگاہی سے مستفید ہوئے۔ بعض دوسرے علما سے بھی تحصیل علم کی۔ مولوی علاء الدین سے تمام درسی کتابیں "حاشیہ میر زاہد" تک پڑھیں کہ اسی وعامہ شرح سوافق پر ہے۔ راقم الحروف کے قدیم دوست اور مشفق ہیں۔ ۲ے

شنیدن کے توانی شکل چشم آں پری رو را　　مصور مو قلم کے سازد اگر مژگان آہو را
عجب بود اگر فرہاد بجز از چوب باشد　　کہ عطر صندل فرہوں تر صندل کی دہد بو را

۴۴۔ ندرہ، میر غلام حسین

ندرہ تخلص ان کا ہے میر غلام حسین ولد مومن علی خان حیدرآبادی ہے۔ شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ہمی وہ وزن ترکیب پر قدرت ہے۔ مضمون خوب باندھتے ہیں۔ جناب آگاہ سے تلمذ ہے۔ اگرچہ نشوونما حیدرآباد میں ہوئی ہے لیکن ان کا اندازِ فکر اس علاقے کا ہے۔ عام طور سے اُردو میں فکرِ سخن کرتے ہیں۔ ۵ے کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے ہیں۔

من ز گردشِ لیل و نہار گریہ کنم　　ازیں کہ گشت ز من چشمِ یار گریہ کنم
چو روشنے کہ چکد شعلہ وار از مشعل　　ز جوشِ داغ دل خود شرار گریہ کنم

۴۵۔ ندوی، رماشی پرشاد

ندوی تخلص رماشی پرشاد نام ہے۔ راجا حکومت رائے کے پوتے ہیں کہ جو شروع میں نواب سراج الدولہ بہادر تھے۔ موزوں طبع، رنگین مزاج، پسندیدہ اخلاق ہیں۔ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت اپنے اشعار کا مجموعہ راقم السطور کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس میں سے یہ چند اشعار لکھے جاتے ہیں ۶ے

سرد مہری با زمستاں کرد در عالم چو شمع　　شمع سے شوید آب گرم روئے خویش را
یک بار بہام تو رسیدن نتوانست　　صد بار رساندم بفلک آہ رسا را

۴۶۔ فاروقی، خاں عالم خاں ۷ے

مست نازے کہ ز کیفیت خود بے خبر است　　در داغ دل ہم بادۂ مدہوشی ریخت
ثروت حسرت سے بعد توبہ اے فاروقی　　زمجمعہ کہ بشستیم دست ، تو بالیست
از آب دیدہ پر شد پیالۂ دل　　مانند جام ساعت عرق است حاصل ما

۴۷۔ گوہر، محمد باقر خان

گوہر، محمد باقر خان، نایطہ قبیلہ سے ہیں۔ شعر و شاعری کا ذوق ہے۔ خوب فکرِ سخن کرتے ہیں۔ دیوان مرتب ہو چکا ہے۔ قصیدۂ میمیہ، نواب والاجاہ کی خدمت میں پیش کیا اور موضع طلب کیا۔ نواب نے قادرت شعار سے موضع سمرانگی جو پرگنہ کاویری میں واقع ہے مرحمت فرما دیا۔ حسن تحریر کے وقت ۱۲۱۳ھ میں وہ موضع ان کے بیٹوں کے قبضے میں ہے۔ حیدر علی خاں کے ہنگامے میں وہ ویلور کے فوجدار تھے۔ ایک سال کے بعد معزول ہو کر حضور میں آئے۔ چند ماہ کے بعد انتقال ہو گیا ۸ے

سرکشد خط شعاعی درگ ورہۂ ما　　مشرق صبح قیامت بود اندیشۂ ما
کن ز گوشۂ دستار زلف رہبرِ دوں　　زطرہ فتنہ مشوش کن دماغ را
نماند نقش پائے خود نوائی بر گزم جائے　　بپائے بیخودی طے کی کنم صحرائے عشق را
(۱۱۲/الف)

۴۸۔ قاضی احمد شطاری، علی احمد خاں قاضی

قاضی احمد علی المخاطب بہ علی احمد خاں نوکیری ابن عبدالوہاب ۔ پختہ فکر و نازک خیال شاعر تھے ۔ قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے ۔ مضمون خوب باندھتے تھے ۔

مزاج نازکم عطر افزود از تیغ کای یا		مرہائے ترنج غبغب و گلقند دشنامے
دو ناشد قامتم چوں ماہ نو از بار منتہا		کہ یادم کرد آں خورشید سیما بعد ایامے

۴۹ ۔ کمال ، سید کمال الدین

کمال تخلص ، سید کمال الدین نام ۔ فارسی کی بعض کتابیں مثلاً انشائے بیدل و ابوالفضل و مجمع الانشا و مناظر الانشا ، رسہ قوشجی اور بعد سرو بیت میں بعض دوسرے رسالے حضرت امیر الدین علی خاں سے پڑھے ۔ شاہ کمال الدین عارف ، صالح اور متقی تھے ۔

لب و ابروے تو در کشتن و جاں بخشیدن		ذوالفقار اسداللہ و دم روح اللہ

۵۰ ۔ کوکب ، مرزا محمد صادق خان

مرزا محمد صادق خان کوکب ، ایران کے رہنے والے تھے ۔ اصفہان وطن تھا ۔ ۱۲۱۷ھ میں اس علاقے میں آئے ۔ کچھ دن تلاش روزگار میں رہے ، کچھ حاصل نہ ہوا ۔ چوں کہ یہاں انگریزوں کی حکومت ہے ۔ ان کو مفتی کا منصب مل گیا اور ساڑھے تین سو روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی ۔ چند ماہ اس کام پر مامور رہے مگر قاضی القضاۃ مستور جان سے مخالف مذہب ہونے کی وجہ سے نبھ نہ سکی ۔ لہٰذا وطن واپسی کا ارادہ کیا کہ اچانک انتقال ہوگیا ۔ ان کے دوستوں کو صدمہ ہوا ۔ نستعلیق و شکستہ خوب لکھتے تھے ۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے ۔ عارف الدین خان رونق نے سات شعر مجھے لکھ کر بھیجے تھے ۔

ابروے یار دوام دوئے نکوئے دوست		یا رب مبارک است کہ دوام بروئے دوست
اے من فدائے نرگس مردم فریب تو		پنہاں کرشمہ کردن و ظاہر عتاب چیست

۵۱ ۔ لذتی ، افضل خان

لذتی تخلص ، افضل خاں نام ۔ شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے ۔ مجھے ان کے دو تین شعر سے زیادہ نہ مل سکے ۔ ان کا تفصیلی حال بھی معلوم نہ ہو سکا ۔ ایک قبیلہ سے تھے ۔ انھوں نے قصہ چندربدن و مہیار کو مثنوی میں نظم کیا تھا ۔ ایک عزیز لایا تھا ۔ میں نے وہ مثنوی دیکھی تھی ۔ مضامین پختہ تھے ۔ عدم فرصت کی وجہ سے میں انتخاب نہ کر سکا ۔ اگر پھر ہاتھ لگی تو انتخاب کروں گا ۔

سیہ چشمے کہ بسمل وا دہی رقص شمشیرش		دوا مارا سرمہ داں سازد مسی پائے تجیرش
شب کہ آہم علم شعلہ چو برپای کرد		برق ی دیدہ از دور تماشای کرد
صبح و بہار و غنچہ و گل فرش راہ اوست		نسرین و لالہ خار و خس و جلوہ گاہ اوست

۵۲ ۔ مہربان اورنگ آبادی ، سید عبدالقادر

عارف باللہ اور صاحبِ کمال بزرگ تھے ۔ ان کا سلسلۂ نسب شاہ مدار ابن قاضی محمود لاہوری تک پہنچتا ہے ۔ وہ سیہوں سے ملا ہے ۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے ۔ تینتیس (۳۳) سال سے اس شہر میں رہتے ہیں ۔ بچپن میں قرآن شریف پڑھا ۔ آٹھ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہوگئے ۔ اس کے بعد سیرو لغت کی کتابوں کا مطالعہ کیا ۔ سند حدیث بھی حاصل کی ۔ تھوڑی ہی مدت میں جامع کمالات ہو گئے ۔ شاعری میں آزاد (غلام علی بلگرامی) کے شاگرد تھے ۔ ان کا مہربان تخلص آزاد مرحوم کا عطیہ ہے ۔ اس تخلص سے خوش ہوئے تھے ۔ مدتوں

تخلص کی تلاش میں رہے۔ آخر میں فخری تخلص اختیار کیا اور خوش ہوئے۔ ان کے باپ کا نام شریف الدین خاں ہے کہ جو روسہ کے قاضی تھے۔ بوشہ اورنگ آباد کے قریب ہے جہاں حضرت برہان الدین غریب بزرگ اور دوسرے بزرگوں کے مزارات ہیں۔ شریف الدین خاں وہاں کے مشہور عالم و عارف تھے۔ جناب مولانا فخر الدین ابن شاہ نظام الدین نے ان کا حال بتایا ہے کہ اول وہ اپنے ماموں کے مرید ہوئے اور پھر سید فخر الدین اورنگ آبادی کے مرید ہوئے۔ سلوک کی منزلیں طے کیں۔ قادریہ اور چشتیہ طریقوں میں خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے اور مولوی فخر الدین دہلوی سے بھی فائدہ اٹھایا۔ ان کو خلافت ملی، جو ان کے ماموں تھے اور ایک زمانے تک اس ملک میں لوگوں کو رشد و ہدایت فرمائی۔ شعر و سخن کا بھی ہنگامہ گرم رہتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان سے ظاہری و باطنی فیض حاصل کیا۔ ۱۲۰۲ھ میں انتقال ہوا۔ ان کا مزار برہان پور میں ہے۔ آزاد نے خزانۂ عامرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

ان کے شاگرد ذوالفقار دولت آبادی نے تذکرۂ بے نظیر میں تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کے حالات تفصیل سے نہیں لکھے۔ وہ تیس (۳۰) سال سے زیادہ مدراس میں رہے۔ انھوں نے اپنا دیوان مرتب کرلیا تھا ۵۵ میں نے ان کے تفصیلی حالات لکھنے ضروری سمجھے۔

غلام اورنگ گیری نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ وفات کہا ہے ۵۶

فخری آں منکر ز مین و زماں　　کعبۂ وصل ماجد شد طائف

بہتیج ایں ندا بگوشم خورد(*)　　"کارا فوراً عظیما" از ہاتف

۱۲۰۲ھ

گر بہ گلشن روی بہ تعظیمش　　رنگ روئے بہار کی خیزد

موج تبسم کرم است ایں نہ چنیں قبر　　گر گل دہن بجبیں جا گرفتہ است

۵۳۔ ماجد، ذوالفقار الدولہ محمد علی حسین خاں

امیر الامرا بہادر تاج الامرا ۵۷

خلف نواب عمدۃ الامرا بہادر۔ اکثر ماجد اور کبھی کبھی حسین تخلص کرتے تھے۔ ان کا اصلی نام علی حسین تھا۔ خاندان والاجاہیہ میں ان جیسا نازک خیال نکتہ رس شاعر پیدا نہیں ہوا۔ شعر و شاعری میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کا دیوان بہت خوب ہے ۵۸ بیدل کی طرز میں کہتے تھے۔ حضرت آگاہی سے اصلاح لیتے تھے۔ اہل سنت کی بجائے شیعہ طریقہ اختیار کرلیا تھا ۵۹ مفتن پرداروں کی شرارت سے وہ حضرت آگاہ سے ناراض ہوگئے اور ان کو برا بھلا کہنے لگے۔ جب آگاہ کو معلوم ہوا تو رنجیدہ ہوکر زبان سے کچھ نہ کہا مگر جب توقع سے بڑھ گئی تو عام سے بیان کیا تو آگاہ نے جوان مرگی کی بد دعا کی۔ چھ مہینے میں اس کا ظہور ہوا کر ۱۲۱۲ھ میں اٹھارہ سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ میں نے یہ تاریخ نکالی ہے۔

چوں امیر بلند فکر و خیال　　رفت زیں دام گاہ حزن و ملال

وحشت ازشش جہت ہجوم آورد　　شد جہاں محشر ملال و کلال

تیرہ شد روز ما تم لیکن　　خیرہ شد چشم صاحبان کمال

سال تر حیلش از خرد جستم　　گفتہ "خورشید آمد بزوال"

۱۲۱۲ھ

۵۴۔ مجرؔ۔ غلام محی الدین

مجرؔ، غلام محی الدین اپنے قبیلے سے ہیں۔ وہ رنگین خیال شاعر ہیں۔ فارسی کی متداول کتابیں مشہور اور مرحب کی سے پڑھی ہیں۔ متوسطات تک عربی پڑھی ہے۔ فارسی کتابوں کا درس دیتے ہیں۔ غزل گوئی کی طرف رجحان ہے۔ خوب چست فکر ہیں۔

نہ رشک است این کہ ہر قال دیدار　　　بہر دم قرعہ انداز است چشم

ہر سحر بلبل دل ہمدم گیا تنگ دماست　　　تا ز چاک جگرم رشک گلستاں گردی

گردی نپاے خاک نشیاں کوے دوست　　　مردہ ہوا کشید و بیال ہما رسید

سید ابو سعید والا ے تیز ار افسوس ملبوا از جہاں رفت“ سے اور سید خیر الدین فائقؔ نے ”امیر الملک ماہ نو جواں رفت،، سے تاریخ نکالی ہے۔ انھوں نے اپنے دونوں دیوانوں کا انتخاب خود کیا تھا۔ عارف الدین رونقؔ نے راقم الحروف کے پاس یہ انتخاب بھیجا تھا۔

اگر راحت طلب باشی امیر رنج خواہی شد　　　کہ نقش برق باشد خرمن عیش زلیخا را

تا شد قوت پرواز خاک ناتواناں را　　　مروہ شہیدم اے برگاں بہ چیدہ دامان را

نیست امید رہائی من نادانی را　　　اے دل خستہ مکن یاد پر افشانی را

چہ حرف ی زند آں چشم سرمہ گوں با رب　　　کہ ہر کہ رفت بہ بزم عشق خموش ی آید

۵۵۔ منزویؔ۔ میر مرتضیٰ

منزویؔ تخلص، میر مرتضیٰ نام ہے۔ بڑے صاحب کمال تھے۔ نظم و نثر دونوں میں دست گاہ تھی۔ نجوم و رمل میں بھی ماہر تھے۔ ان علوم میں کئی رسالے لکھے جو پنج گنج کے نام سے موسوم ہیں۔ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے تھے۔ فن معانی و بیان و بدیع میں انھوں نے یک کتاب جواہر لاشعاء لکھی ہے ۱۹؎ اور اس کا خطبہ محمد حسین وحشت کے نام ہے۔ نواب دوست علی خان کے آخر عہد میں دہلی سے ویلور آئے۔ نواب دوست علی خان بہ منشی ممتاز رکیس تھے۔ وہاں کئی سال باقر علی خان کی رفاقت میں رہے۔ چوں کہ طبیعت میں آزادی او وارثگی تھی البتہ یک دم قطع تعلق کر کے ارکاٹ عرف محمد پور پہنچے و وہاں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور تخلص کے مطابق زندگی گزار دی نے لگے۔ بڑے بلند ہمت تھے۔ نواب نصیر الدولہ جیسے شخص کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ور نواب نصیر الدولہ جیسے لوگ ان کی ملاقات کو جاتے تھے۔ اگر دل میں آیا تو ملاقات کی اجازت دے دی ورنہ دروازہ نہیں کھولتے تھے ۲۰؎ چنانچہ خود کہتے ہیں۔

اے منزوی از وضع تو عالم گلہ دارد　　　گردوں طپش آورد و زمیں زلزلہ دارد

گر حرم و گہے توبہ و گہ رسم عبادت　　　لاحول بہ تنگ آمد و شیطاں گلہ دارد

ان کے یہ رنگیں اشعار لوگوں میں مشہور ہیں۔

جفا جو برق خو، شوخے کہ جولاں کردہ ی آید　　　بہر سو از نگہ خون شہیداں کردہ می آید

جہانے را برق جلوۂ رخسار خود ظالم　　　برنگ دیدۂ تصویر حیراں کردہ ی آید

دجوش درد دل، صیاد از پرواز آرادم　　　تماشا دارد امشب از ہجوم نالہ فریادم

۵۶۔ محفوظؔ، محمد محفوظ خاں بہادر شہامت جنگ

محمد محفوظ خاں بہادر شہامت جنگ پسر کلاں نواب انور الدین خاں بہادر شہید گوپا موی، بڑے متقی اور اہل دل ہے

قد رواں تھے۔ تمام درسی کتابیں اپنے زمانے کے اہل کمال اساتذہ فن سے پڑھیں۔ علوم عقلی و نقلی میں تکمیل کی۔ شعر و شاعری کی طرف طبعیت مائل تھی۔ محمود تخلص کرتے تھے۔ نظام الدولہ آصف جاہ کے منظور نظر تھے۔ ان کی توجہ سب بھائیوں کے مقابلے میں ان کی طرف زیادہ تھی۔ ان کے والد بھی ان کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ والد کی شہادت کے بعد جاگیر و خطاب اور ارکاٹ کی حکومت ملی۔ نواب سراج الدولہ بہادر والا جاہ بھی خیال فرماتے تھے۔ شعر خوب کہتے تھے۔ ع

کرد عکس رخ طبع کسے نکلے در شراب من اشب
گنارہ گیر بہ پیری روسل گل رعناں کہ پردہ دار حریفاں شب جوانی بود
بکام دل مژہ آب زندگی دارد کجسے کہ ترا زیر ہر لب نہانی بود

۵۷۔ منور، شیر علی خان بانکڈی

منور تخلص شیر علی خان بانکڈی، موزوں طبع خوش وضع اور با اخلاق اور خان عالم خاں کے پوتے تھے۔ منور عالمگیری سرکار کے نامور امیر تھے۔ منور تخلص کرتے تھے۔ رنگین طبیعت اور امیرانہ وضع رکھتے تھے۔

اتفاق جہلا سخت قیامت دارد سنگ ہر سنگ چو افتد شرر آید بروں

۵۸۔ مروت، علی دل خان

علی دل خان ولد عظیم الدین تخلص مروت کرتے تھے۔ صاحب مروت اور با اخلاق تھے۔ استعداد خوب رکھتے تھے۔ دہور کے روشناس تھے۔ شعر کہتے تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں زیارت حرمین کے ارادے سے کشتی پر سوار ہوئے اور وہاں پہنچ کر زیارت حرمین سے مشرف ہوئے۔ وہاں سے وطن کی واپسی کے ارادے سے آئے۔ وہاں بیمار ہو گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ مجھے یہ شعر یاد تھا جو نقل کرتا ہوں۔

بہر طواف گلشن کوے تو غنچہ وار از راہ دور بر زدہ داماں رسیدہ ام

۵۹۔ مشہور، سید علی محمد

مشہور تخلص ۔۔۔ سید علی محمد ولد سید نور اللہ نقوی۔ ان کا مولد و منشا محمد پور عرف ارکاٹ ہے۔ بزرگوں کا وطن بیجاپور ہے۔ استعداد خوب رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ راقم الحروف نے اوائل حال میں دو تین رسالے مثلاً صرف میر اور شرح عوامل (نصف) ان سے پڑھی ہے۔ یہ دو شعر ان کے ہیں۔

مشہور بخاکستر پیری نتواں یافت از دود حضاب آتش ایام جوانی
خوردند بلعد حریفاں ریتی عشق یک قطرہ کم گشت ز لبریزی سبو

۶۰۔ میر محمد شفیع

اس شہر کے باشندے اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے حالات سے میں واقف نہیں ہوں۔ ان کے یہ دو شعر مجھے یاد ہیں۔ خوب کہتے ہیں۔

بدنی آید مرا از سر بریدن ہائے شمع ہر گلے بے بوکر باشد مستحق چہ ست
دلم از نسیخے آئینہ غبارے دارد بدے تیرہ شدن اہل صفا واجب است

۶۱۔ حقانی، نواب سیف الملک بہادر

صفی الدین محمد خاں ناصر تخلص کرتے تھے ۲۰۱ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ قادر علی خان بہادر مغفور کے بیٹے ہیں۔ اور یہ قادر علی خاں موسوی محمد باقر آگاہ کے ہی اہتمام میں ہیں۔ صفی الدین خان دس سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ حیدرآباد آ گئے اور نواب نظام علی خاں بہادر نظام الدولہ آصف جاہ کی ملازمت سے مشرف ہوئے اور مشیر الملک مستطاب مدار المہام کے حضور میں بھی باریاب رہے۔ ۲۱۸ھ میں اپنے والد کے ہمراہ مدراس آ گئے۔ قادر علی خان بعض وجوہ کی بنا پر حیدرآباد واپس چلے گئے۔ صفی الدین خاں نے تحصیل علم اور مشق سخن حضرت آگاہ سے کی ۲۰۳ اور والد سے تعلق ختم ہو گیا۔ اس وقت سے مدراس میں سکونت پذیر ہیں اور راقم الحروف سے تعارف ہے۔

سلام از چشم دل بار بہ بر شاہ \ ژالہ و نالہ عشق اللہ فضل خنک سالی را
راز دل نہ نہفت آخر دیدۂ گریان ما \ سیل پرخون برد گنج خامہ و بریان ما

۶۶۔ <u>والیؔ سید محمد موسوی</u>

ساتویں امام سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ہر طرح کی نظم لکھنے پر قدرت ہے۔ عروض و قوافی کے فن میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ان کا کلیات موجود ہے اس ملک میں آنے کے بعد سید محمد والہ تھوڑے عرصے تک چناپلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ۱۱۸۲ھ میں انتقال ہوا ۲۰۴

اے گوہر بہا نہ کہ شستہ آبرو \ خاک رہ چہرہ در یتیم را
از جفائے دشمن و زخم حوادث فارغم \ نقش پا در خاکساری با سپر باشد مرا

۶۷۔ <u>والاؔ سید ابو سعید</u>

سید ابو سعید ابن سید ابو طیب خاں امامی ۲۰۵ یہ سید ابو طیب خاں اور سید عاصم خاں بہادر مبارز جنگ ایک دوسرے کے ابن عم ہیں۔ (قصبہ) امام کے مشاہیر میں سے ہیں۔ شعر و شاعری کے ذوق سے بہرہ ور ہیں۔ خوب فکر رسا رکھاتے ہیں۔ ایک مثنوی ”آیۂ رحمت“ اطور رساتی نامہ لکھی ہے۔ حضرت آگاہ کے شاگرد ہیں ۲۰۶ جیسا کر خود کہا ہے۔

کند مشق سخن کہ کلکِ سر خطا \ بلکہ از حضرت آگاہ ترقیم سبق

وہ اپنے آبا و اجداد کے طریقے پر سلسلۂ بیابانیہ کے مرید ہیں اور مولوی شاہ رفیع الدین سے بیعت ہیں۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی سے بھی عقیدت حاصل رکھتے ہیں۔ نہایت با اخلاق اور شائستہ فطرت ہیں۔ راقم الحروف سے برادرانہ و مشفقانہ خاص تعلقات ہیں۔ ان کے والد ماجد سید ابو طیب خاں حسن سلوک اور چچا سید ضیاء الدین خاں شفقت و عنایت خاکسار کے حال پر فرماتے تھے۔ میں ان کے بیان و بیان پر تبصرہ کرنے سے عاجز ہوں ۲۰۸

عاملے رای قوس از خلق خوش تسخیر کرد \ بوئے گل زنجیر می گردد بپائے عندلیب
بے سبب نیست خاکساری من \ یار والاں کشیدہ می آید
می شود ظاہر شرافت وقت تحقیق خود بخود \ می دہد والا رسائیدن فزوں تر مشکبو

۶۸۔ <u>یادگارؔ، میر یادگار علی</u>

یادگار تخلص، میر یادگار علی نام وہ یادگار زمانہ اور شعرائے یگانہ تھے۔ تنجور کے سادات سے تھے۔ انھوں نے زہرا اطہر کے مناقب اور سید الشہداء کے مرثیے لکھنا اپنے لیے مقرر کر لیا تھا۔ ان کے سوا اور کچھ نہ لکھتے تھے۔ نواب سراج الدولہ بہادر کی سرکار میں وقائع نگاری

خدمت پر مامور تھے۔ نثر لکھنے پر پوری مہارت اور قدرت رکھتے تھے۔ ان کے مرثیے زبان زد خاص و عام ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنے مرثیوں میں شیعوں کے مخصوص مسائل مثلاً مسئلہ فدک اور قرطاس وغیرہ درج کرتے ہیں۔ مرثیے محض درد و رقت کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ خصومت و منازعت کے لیے۔

گل ہمی گوید و بلبل صبح دم　　دشمن آل محمد خوار باد

۶۹۔ یکدل، آل علی میر مردان

یکدل تخلص، میر علی مردان ابن سید محمد وقتی جن کا حال اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ شعر و شاعری کا خوب ذوق رکھتے تھے۔ ان کا دیوان میری نظر سے گزر چکا ہے۔ ۹۹

آہ کی آید ز دل از گریہ من در فراق　　دوری خیزد نشانی چوں بہ جگر تاب را
ازبسکہ نازک است مضامین شعر من　　شیرازہ بستم از رگ جاں ایں رسالہ را
یکدل صفا مگر کہ ز روشن دلی مدام　　پنہاں نمود دیدہ خود جوہر آئینہ

۷۰۔ یاد، مولوی خواجہ حمید الدین

یاد تخلص، مولوی خواجہ حمید الدین نام ۱۰۰ اقتضائے طبیعت کبھی شعر کہتے تھے۔ با اخلاق اور آزادانہ وضع تھے۔ بے تکلف نہیں کرتے تھے۔ نہایت کالعدم شا کرتے تھے۔ شطرنج خوب کھیلتے تھے اور اس فن میں خود کو سید عبدالعلی عزلت سورتی کا شاگرد بتاتے تھے۔ جب انھیں زیارت حرمین شریفین کا شوق ہوا تو حیدرآباد سے مدراس آئے۔ جہاز میں سوار ہو کر مقامات مقدسہ پہنچے۔ حج و زیارت اور مقامات مقدسہ سے واپس مدراس آئے۔ کچھ دنوں یہاں رہے۔ اس کے بعد اچانک مدراس سے حیدرآباد چلے گئے اور جلد ہی وہاں انتقال ہو گیا۔

یاد علی ست و ورد من و حرز جان من　　یاد علی است و ورد من و حرز جان من
ہر کرا تعبیر پرسیدم ز من وحشت گرفت　　دیدہ ام در خواب شاید چشم آہوئے کسے

آخر وقت میں اپنی تاریخ خود لکھی تھی جو یہ ہے

جائے تاریخ بہر یاران خواندہ باشید "فاتحہ اخلاص"

(۱۲۱۶ھ)

حواشی از محمد ایوب قادری

۔ مولوی محمد باقر آگاہ مدراسی، اصل باشندے بیجاپور کے تھے۔ ویلور میں پیدا ہوئے۔ کرناٹک میں ان کے مثل کوئی فاضل نہ تھا۔ ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی۔
(۱) صبح چمن (۲) نتائج الافکار

۲۔ خانۂ آصفیہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

۳۔ "سحر الحلال" کا قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۲۰۱ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے جس کو مولوی بیٹو کرہ واقی نے کتابت کیا ہے۔

۴۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ سعیدیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

۵۔ مثنوی "ہشت بہشت" میں مندرجہ ذیل آٹھ مثنویاں ہیں۔

(۱) حسن دیپک (۱۱۸۴ھ)، (۲) حسن پرن (۱۱۸۵ھ)، (۳) حسن موہن (۱۱۸۶ھ)، (۴) گنگ موہن (۱۱۸۶ھ)، (۵) آرام دل (۱۱۸۵ھ)، (۶) راحت جان (۱۱۸۵ھ)، (۷) حسن درپن (۱۲۰۱ھ)، (۸) حسن جیون (۱۲۰۷ھ)

۶۔ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

۷۔ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

۸۔ مکتوبہ ۱۲۱۰ھ کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

۹۔ کتب خانہ سالار جنگ میں قلمی صورت میں موجود ہے۔ ابجلیب خان وقت نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے۔

چو رفت از دار دنیا ست آگاہ　وا دریغا وا دریغا وا دریغا

بگفتا از سر ماتم سروشم　قاہ ہاہ ثم ، ابا ، ثم ، ابا

۱۱۸۱+۴۰=۱۲۲۱ھ

اس میں ایک عدد زیادہ ہے۔ آگاہ عدد اس میں حافظ محمد جان کی سمجھ کے پاس لوٹائیا ہو رہے ہو گئے۔

۱۔ نواب والا جاہ نے ۱۱۸۹ھ میں ابھری کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ (صبح وطن، ص ۲۷)

۔ تصانیف ابھری میں "کلیات ابھری" چار جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ "نو رنامہ" (فارسی) نواب انوار الدین خان ارکاٹ کی تاریخ ہے "تحفۃ العراقین" کی شرح بھی ابھری نے لکھی ہے۔

۲۔ شیخ محمد مخدوم کا انتقال ۱۱۶۵ھ میں ہوا۔

۳۔ ملاحظہ ہو "تاریخ النوایط" (ص ۲۷۴)

۴۔ ۱۱۵۱ھ میں ذوقی پیدا ہوئے ("جواہر السلوک" مطبوعہ)

۵۔ اس مثنوی میں سات ہزار اشعار ہیں۔ اس کا اُردو ترجمہ غلام محمود حسرت ویلوری نے کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

۶۔ ذوقی نے اپنی تصانیف کا مفصل حال اپنی ایک تالیف "انشائے لطف الٰہی" میں لکھا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے

(۱) ابدیۃ الاخبار (در تتبع ظہور اسرار) منظوم (۲) عشق نامہ (۳) چمن محبت (۴) قصۂ کیوان شاہ منظوم (۵) معجز مصطفیٰ (مدارج النبوۃ کا منظوم ترجمہ و تخمیس) (۶) معارج النبوہ (منظوم ترجمہ و تخمیس) (۷) تذکرہ اولیائے سلاسل (منظوم) (۸) تذکرۃ الاولیاء (۹) تعداد الشہور (منظوم) (۱۰) دو تخمین (منظوم) (۱۱) قصائد طرز قدیم (منظوم) (۱۲) دیوان قدیم (۱۳) مجموعۂ رباعیات (۱۴) قصائد و رباعیات (۱۵) علیما (بطرز کریما) (۱۶) حکیما (بطرز کریما) (۱۷) ادب الطلاب (۱۸) طالع (۱۹) جواہر ستان (۲۰) احسن الاسلوب (۲۱) انشائے قادری (۲۲) انشائے باقری (۲۳) انشائے عقائد (۲۴) روضۃ الخلد (۲۵) نواقض الروافض (۲۶) آمد نیۃ الاذہان (۲۷) مختصر تحریر (عروض) (۲۸) زین المنتہی (۲۹) اصطلاحات الشعراء (۳۰) غریب اللغات (۳۱) تفسیر لطیفی (در علم تفسیر) (۳۲) جامع عجائب (۳۳) باب الجنات (تصحیح الصلوٰۃ) (۳۴) شرح عبداللہ یزدی (۳۵) رسالہ اکبر و اوسط و اصغر (منطق) (انشائے لطف الحق قلمی ص ۲۱-۲۲)

۷۔ مولوی محمد امین بیجاپوری کے "غالب ہنتخب الایجاد" سے ذوقی کی تاریخ انتقال نکلتی ہے جس سے ۱۱۹۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اور یہ تاریخ ذوقی کے گنبد پر کندہ ہے۔

ذوقی کہ از تراوش فیض زبان او　　گلزار نظم و نثر پر نشوونما رسید
عیسیٰ دمے کہ از نفس جاں فزائے او　　جانے بجانب سخن نے نوا رسید

۸۔ غلام علی موسیٰ رضا ابن حکیم رکن الدین خان المخاطب بہ حکیم باقر حسین خان، راقمؔ کو اپنے والد کا خطاب ملا تھا۔ (تاریخ سوانح ص ۳۹۴)

۹۔ راقمؔ نے ۱۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ سوالقرنے قطعہ تاریخ کہا ہے

دادوے اجل چو خورد راقیؔ　　بادہ جرعہ کتاب ایماں
سالش ز سر بکا دلم گفت　　کا کرد ز زہر ملت لقماں
۱۲۲۷ھ (تاریخ وطن۔ ص ۸۱)

علم طب میں راقیؔ کی عظیم تصنیف جامع الاشیاء (فارسی) ہے جو طبع ہو چکی ہے

۱۰۔ سید عبداللطیف قادری بیجاپوری کا انتقال ۔۔۔ شعبان ۱۱۳۹ھ کو ۸۰ سال کی عمر میں ہوا۔

۱۱۔ مادۂ تاریخ ولادت "تحیۂ کریم المرتضین" ہے جس سے ۱۱۱۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ (انتخاب ویلور ص ۲۲)

۱۲۔ فخر الدین عاطفی بھکری (تاریخ النوائط)

۱۳۔ مثنوی من دیپک از باقر آگاہ

۱۴۔ متن میں الف ماتوا شخوسینیں کی بجائے تثائیں ہونا چاہیے۔ علامہ باقر آگاہ نے ۱۱۸۲ھ لکھا ہے جو صحیح ہے آگاہ کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ گنبد پر کندہ ہے

رکن دیں شاہ ابوالحسن قربی　　پیشوائے مقربان الہ

چوں کرد رحلت قربِ حق سالش   تحت قطبِ ابرار گفت آنگاه

۱۱۸۳ھ

۲۵۔ قربی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) میزان الحقائق (فارسی) (۲) ملفوظات مخدوم عبدالحق ساوی (فارسی) (۳) دیوان اُردو (قدیم) (۴) دیوان فارسی (قدیم) (۵) تقویۃ الایمان (۶) برہان قاطع (۷) عین العیان (۸) کیمیائے سعادت (۹) رسالۂ اخلاق (۱۰) رسالہ حق المعرفت (۱۱) تحفۃ الذاکرین (۱۲) رسالہ مبدء معاد (۱۳) رسالہ توفیق (۱۴) خلاصۃ العرفان (۱۵) رسالہ جمع الجمع (۱۶) لب السلوک (۱۷) معراج نامہ (دکنی) (۱۸) نمک نامہ (دکنی) (۱۹) وحدت نامہ (۲۰) ہدایت نامہ (دکنی)

۲۶۔ مولوی غلام کبریا متوطن بنگال (گلزار اعظم ص ۳۹۸)

۲۷۔ خواجہ عبداللہ خان حیدرآبادی۔

۲۸۔ مخدوم عبدالحق ساوی بیجاپوری المتوفی ۱۱۶۸ھ

۲۹۔ عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ (گلزار اعظم ص ۳۹۸)

۳۰۔ محمود شاہ والا سے مندرجہ ذیل چیزیں یادگار ہیں

(۱) دیوان یار (۲) مجموعہ اشعار رو واقعات یار (۳) قطعات تاریخی والا جاہ وٹیپو سلطان (۴) قصیدہ در مدح آصف الدولہ والی اودھ (۵) رقعات بنام حسام الملک بہادر

۳۱۔ مولف صبح وطن نے ۱۱۹۰ھ یا ۱۱۸۹ھ لکھا ہے (صبح وطن ص ۴۲)

۳۲۔ تاریخ النوائط، ص ۳۷۱

۳۳۔ ابن اسرائیل تلمیذ بیدل (صبح وطن، ص ۲۳۲)

۳۴۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) گلشن سعادت (قلمی) کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے (۲) مجمع الانشاء (۳) دیوان فارسی (ملاحظہ ہو صبح وطن ص ۳۳)

۳۵۔ تاریخ النوائط۔ ص ۳۹۷

۳۶۔ اختر کے یہ اشعار حاشیے پر ہیں لہٰذا اختر کا حال تذکرۂ گلزار اعظم (ص ۲۵-۲۲) سے یہاں درج کیا جاتا ہے اختر تخلص، سید نظام الدین پسر عبدالقادر خوش نویس ۱۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی درسی کتابیں محمد باقر آگاہ، ستقیم جنگ اور ناظر ان سے پڑھیں۔ مشق سخن بھی ان ہی سے کی۔ خوش نویسی اپنے والد سے سیکھی پھر نواب کے ہاں منشی گری پر مامور ہوئے۔ مصاحبت کا بھی شرف حاصل تھا۔ ۱۲۳۲ھ میں نیلور (؟) کی طرف چلے گئے اور راجا رام راج بہادر شمشیر جنگ کے یہاں منشی گری کی خدمت پر سرفراز ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے نظام الانشا اُردو کے دیوان ترتیب دیے۔

۳۷۔ تجمل لکھنو کے رہنے والے تھے

(ملاحظہ ہو گلزار اعظم، ص ۳۱۹ (۱) نتائج الافکار، ص ۸۹ (۲) گلستان بے خزاں۔

۳۸۔ ان کی مثنوی شہید دریا ۱۲۰۹ھ کی تصنیف ہے جس میں دو سو شعر ہیں۔ اس میں اپنے دوست اور ہم سبق ضیاء الحق کے عشق کی وجہ سے غرقاب ہونے کا واقعہ نظم کیا ہے۔ اس کا خطی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۳۹۔ ان کے دوست صبغت اللہ نے قطعہ تاریخ کہا ہے جس کا ایک شعر درج ہے۔ اس سے ۱۲۳۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔

چوں جانش شد خراماں سوے فردوس	خرد گفتا ”تجمل از جہاں رفت“

۱۲۳۰ھ

تجمل مدراس میں دفن ہوئے۔ (سخنوران بلند فکر مطبوعہ)

۴۰۔ جرأت ملطی تھے۔ (تاریخ النوایط، ص ۳۲)

۴۱۔ ٹھٹھہ صوبہ سندھ پاکستان۔

۴۲۔ نتائج الافکار نے لکھا ہے کہ بارہویں صدی کے آخر میں فوت ہوئے (نتائج الافکار، ص ۱۳۷)

۴۳۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی

۴۴۔ نتائج الافکار (ص ۱۳۹) میں لکھا ہے کہ خلوص کی وفات تیرھویں صدی کے آغاز میں ہوئی اور گلزار اعظم نے سن انتقال ۱۲۰۵ھ لکھا ہے۔

۴۵۔ اصل نام محمد مجتبیٰ المعروف مصطفیٰ علی خان ۱۲۳۸ھ میں فوت ہوئے اور مسجد جامع متیال پیٹھ مدراس میں دفن ہوئے (صبح وطن۔ ص ۵۷) مولف گلزار اعظم نے خوشدل کا انتقال ۱۲۳۲ھ میں لکھا ہے۔

۴۶۔ شاہ غلام پیر ابن شاہ یٰسین بلگرامی اور شاہ نصیر الدین سوری سے علوم باطنی کی تحصیل کی (صبح وطن، ص ۶۸)

۴۷۔ بقول مولف صبح وطن خوش دل ۱۲۱۱ھ میں مدراس آئے۔

۴۸۔ خوش دل کے فارسی دواوین کے علاوہ

(۱) تذکرۃ الانساب (۲) تسہیل المقامات (ترجمہ فارسی مقامات حریری) (۳) مواقیت الملوائح بھی ہیں یادگار ہیں کتب خانہ انجمن ترقی اردو (کراچی) میں موجود ہے۔

۴۹۔ ان کا لقب حشمت جنگ ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور علامہ باقر آگاہ کے شاگرد تھے۔ (سخنوران بلند فکر مطبوعہ،

۵۰۔ ۱۲۱۳ھ میں انتقال ہوا اور حضرت مخدوم ساویؒ کے پائین گنبد دفن ہوئے (نتائج الافکار، ص ۱۶۲، سخنوران بلند فکر، صبح وطن، ص ۱۱)

۵۔ رکن العابدین قبیلہ نوایط سے تھے۔

۵۲۔ ان کا سال انتقال معلوم نہ ہو سکا آخر عمر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

۵۳۔ دیوان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) انشا ئے دیوان (۱۱۳۶ھ) (۲) مجموعہ نظم و نثر (مخزونہ انڈیا آفس لائبریری)

اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل چیزیں خاص طور سے اہم ہیں۔ (۱) رسالہ توضیحات الفاتحہ (تفسیر سورہ فاتحہ) (۲) حاشیہ توضیحات الفاتحہ (۳) وحدۃ الوجود و وجودیت (۴) جو یہ خمسہ عربیہ (۵) تحقیق گردش آفتاب (۶) شرح غزل اول حافظ شیرازی (۷) شرح علم العلوم (بہاری) (۸) رسالہ کلید سند نگار (۹) سراپائے دیوان (۱۰) حسن دیوان (۱۱) شرح اسرار خمر (ابیات ولی دکنی) (۱۲) انشا ئے دیوان (۱۳) دیوان دیوان (غزلیات) (۱۴) قصیدہ دکن (۱۵) رباعیات (۱۶) صنائع و بدائع۔

۵۴۔ ۱۱۹۴ھ میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ محمد باقر آگاہ کے شاگرد تھے۔ عربی حاجی محمد اسمٰعیل اور محمد مقیم سے اور فارسی مجرّے سے پڑھی۔

۵۵۔ دیوان رونق، مطبع فخر المطابع حیدرآباد سے طبع ہو چکا ہے۔ رونق کے صاحبزادے محمد مہدی واصف مشہور تھے۔ واصف کے صاحبزادے حکیم عبدالباسط عشق تھے۔ ان کا دیوان "ترانۂ عشق" بھی حیدرآباد سے چھپ چکا ہے۔ ان ہی حکیم صاحب مرحوم کے صاحبزادے مشہور قومی کارکن ملا عبدالقیوم تھے۔ ملا عبدالقیوم بھی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔

۵۶۔ راقب ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے (نتائج الافکار، ص ۱۹۰)

۵۷۔ نواب والا جاہ محمد علی مراد ہیں۔

۵۸۔ مولف تذکرہ گلزار اعظم نے لکھا ہے کہ ۹ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو انتقال ہوا۔ درگاہ مخدوم عبدالحق ساوی میں دفن ہوئے۔

(۱) گلزار اعظم۔ ص ۳۰۶		(۲) سخنوران بلند فکر

۵۹۔ فائق سے بھی تلمذ تھا (سخنوران بلند فکر)

۶۰۔ راقب سے (۱) دیوان (۲) ساقی نامہ (۳) فراق نامہ طیر یادگار ہیں۔

۶۱۔ داروغہ دیوان خاص امیر الامرا (گلزار اعظم، ص ۲۲۸)

۶۲۔ مولف صبح وطن نے تخت کا سال وفات ۱۲۰۶ھ لکھ دیا ہے مگر گلزار اعظم۔ ص ۱۲۸ میں ۱۲۱۶ھ لکھا ہے۔

۶۳۔ شایاں کے اساتذہ میں ان کے والد قاضی احمد، محمد رضا، عبدالقادر مہربان، علامہ باقر آگاہ اور شرف الملک کے نام ملتے ہیں۔ محمد اعلم خان شایاں، میر منشی، داروغہ عدالت، امین دار المغرب اور تحصیلدار وغیرہ رہے ہیں۔ ان کی تصانیف میں مسایل، تعلیم، شرح صبح التقویم، شرح منہاج (فارسی)، مثنوی گلزار دل، ظفرنامہ، وقائع حیدری، عین المصادر اور دیوان یادگار ہیں۔ ملاحظہ ہو (یادگار، ص ۲۴۳ تا ۲۴۳) (۲) تاریخ النوایط۔ ص ۳۲۹

۶۴۔ نام علامہ حسین بیجاپوری ثم بیدری معاصر عالمگیر، مدفون مدرسہ محمود گاواں، بیدر (نتائج الافکار)

۶۵۔ شائق ۱۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ قادری مشرب تھے۔ انھوں نے عربی عبدالقادر مہربان اور سراج العلما شرف الملک سے پڑھی۔ فارسی کی تحصیل محمد باقر آگاہ اور فائق سے کی۔ شعر و شاعری میں فائق (خیر الدین) اور والا (ابوطیب) سے مشورہ رہا۔ ریختہ میں ظفری اور شاہ حسین حقیقت کے شاگرد تھے۔ مخلص ظہوری، ظفری اور بیدل لکھتے تھے۔

(۱)۔ مرج البحرین (مجموعۂ غزلیات) (۲)۔ روضۂ قدسیاں (در احوالِ بزرگاں) (۳)۔ مثنوی رشکِ بہشت (اُردو) (۴)۔ دیوانِ مختصر فارسی و ہندی۔ شائق کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا۔ ان کے بھائی واثق نے مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا ہے۔

بیدلِ عصر حضرت شائق قدس اللہ سرہ السامی
کام دل جست چوں بقربِ الٰہ کرد جہانست جائے ناکامی
ہاتفم سالِ رحلتش فرمود رفت ہیہات ہمدم جامی

۱۲۳۹ھ

(ملاحظہ ہو گلزارِ اعظم، ص ۲۳۵-۲۳۲)

۶۶۔ طالب کے والد کا نام محمد حبیب اللہ تھا۔ (نتائج الافکار، ص ۴۲۴)

۶۷۔ ۱۲۰۳ھ میں مدراس آئے۔ (گلزارِ اعظم، ص ۲۵۲)

۶۸۔ ساحلِ مدراس کی ایک بندرگاہ

۶۹۔ طالب حج سے واپس آئے اور ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی۔ (گلزارِ اعظم، ص ۲۵۲)

۷۰۔ ملاحظہ ہو گلزارِ اعظم، ص ۲۵۵-۲۵۲

۷۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ النوائط، ص ۲۵۲

۷۳۔ بارھویں صدی کے آخر میں انتقال ہوا۔ (نتائج الافکار، ص ۳۱۹)

۷۴۔ عزت کے باپ کا نام سہا صاحب دائے تھا۔ ویلور میں پیدا ہوئے۔ والد کے مرنے کے بعد سرکاری ملازم ہوئے۔ دروازۂ کتب خانے سے ترقی کر کے منشی کے عہدے پر پہنچے۔ ۱۲۳۶ھ میں فوت ہوئے۔ (تذکرہ گلزارِ اعظم، ص ۲۵۶)

۷۵۔ ناتق ۱۲۳۱ھ میں مدراس سے حیدرآباد دکن آ گئے اور راجا چندو لال شاداں کے ملازم ہوئے اور ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی (گلزارِ اعظم، ص ۲۶۸)

۷۶۔ اُردو میں زیادہ شعر کہتے تھے (صبحِ وطن، ص ۱۳۹)

۷۷۔ ۱۱۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ بنارس وطن ہے۔ اساتذۂ لکھنؤ سے فارسی، سنسکرت و باگری پڑھی۔ ۱۱۹۳ھ میں مدراس آئے۔ مہربان سے تلمذ تھا۔ اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ رائے کا خطاب پایا۔ پیشکاری و صدارت کے منصب پر فائز تھے۔ ۱۲۳۸ھ میں انتقال ہوا۔ (گلزارِ اعظم، ص ۲۷۰)

۷۸۔ جان عالم جان فاروقی کے اشعار حاشیے پر درج تھے مؤلف تذکرہ نے ان کے جو حالات لکھے تھے، پڑھے نہیں جا سکے۔

۲۶ ربیع الاول ۱۲۰۷ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد جان جہاں خان ابن خیر الدین خان ہیں۔ فاروقی خاندان سے ہیں۔ حسِ شعور کو پہنچے تو ہر فن کے علما سے استفادہ کیا۔ شعر و شاعری، فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث، علم معانی، تصوف، حساب، ہیئت، ہندسہ، حکمت، طب، نجوم و رمل، فن تکسیر، عروض، قافیہ اور لغاتِ عربی میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ فنِ موسیقی، بہ خوبی اور دوسرے دیا میں بھی جانتے ہیں۔ فاروقی کے صاحب زادے اپنی تالیف "ذکر جلی فی کرامات محمد علی" میں لکھتے ہیں کہ فاروقی کو موسیقی میں

بڑا کمال حاصل تھا۔ اُنھوں نے فرنگی راگوں کے تمر پر ہندی تمر ایجاد کیے تھے۔ ان کے آلات موسیقی کا مکان عجوبہ تھا۔ چالیس سال عیش و عشرت میں گزارے۔ سیّد احمد شہید کے خلیفہ سیّد محمد علی رام پوری ۱۲۴۵ھ میں مدراس آئے۔ اُنھوں نے مولانا کر العلوم کے فرزند مولانا عبدالوہاب کے مدرسہ میں قیام فرمایا۔ ان کے وعظ کی بہت شہرت ہوئی۔ فاروق نے پہلی ہی ملاقات میں بیعت کر لی۔ اور سارا ساز و سامان اور آلاتِ موسیقی توڑ ڈالے۔ فاروق ایک بہترین مناظر تھے۔ عیسائیوں اور شیعوں سے مناظرہ رہتا تھا۔ راقم۔ کے تذکرہ کی تدوین کے وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔ ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا۔ بعض رسائل طریقت طبع ہو چکے ہیں۔ دیوان بھی (مثنیٰ ؟) پر حاشیہ لکھا ہے اُردو میں اشعار کہتے تھے۔ اُردو میں مرزا ظفری کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام اُردو۔

تیری آنکھوں کے تئیں غزال کہا کیں ان وحشیوں نے باکی بات
اس کے چاہ ذقن سے ہو ویں خنک تشنگان حجاز کی آنکھیں
دیکھ سے میری مست ہوئیں لیرے پاک ہیں راست باز کی آنکھیں

(ملاحظہ ہو صبح وطن)

۷۹۔ مولف گلزار اعظم نے سال وفات ۱۲۱۰ھ اور مولف نتائج الافکار نے ۱۲۱۲ھ لکھا ہے۔ آخر الذکر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ صحن مسجد آغا مقیم میلاپور (مدراس) میں دفن ہوئے۔ دیوان کوہر (قلمی) مکتوبہ ۱۱۵۷ھ اورینٹل لائبریری مدراس میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو (۱) تاریخ النوائط، ص ۲۳۵ (۲) گلزار اعظم، ص ۳۰۱ (۳) نتائج الافکار، ص ۳۷۲

۸۰۔ مرزا محمد صادق کوکب شیعہ مذہب تھے۔

۸۱۔ اسہال کبدی میں ۱۲۱۹ھ میں انتقال ہوا۔ (گلزار اعظم، ص ۳۰۹)

۸۲۔ قدیم امرائے دہلی سے تھے۔ نواب سعادت اللہ خان کے عہد (۱۱۲۶ھ۔ ۱۱۴۴ھ) میں مدراس آئے۔ (گلزار اعظم، ص ۳۰۳)

۸۳۔ قصہ چندر بدن کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

۸۴۔ ان کا نام شاہ صبغت اللہ عرف میر عبدالقادر نقوی سادات تھے۔ (رسالہ سب رس، حیدرآباد دکن اپریل ۱۹۵۷ء)

۸۵۔ ۱۱۴۳ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ (نتائج الافکار)

۸۶۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اصل الاصول (ضخیم تصنیف) دس بارہ سال ہوئے کہ مدراس یونیورسٹی نے اس کو شائع کر دیا ہے (۲) کحل الجواہر (۳) مفتاح المعارف (۳) دیوان فارسی (۴) رسالہ فیض معنوی (۵) دیوان ایکا جید (کبت کا مجموعہ) (۷) رسالہ وحدۃ الوجود و الشہود (۸) مراۃ الشہود (سات ہزار اشعار) (۹) عدیم المثال فی تجرید امثال (دو ہزار اشعار)

۸۷۔ ان کی اولاد اس وقت بھی مدراس میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو "سب رس" (حیدرآباد دکن، اپریل ۱۹۵۷ء)

۸۸۔ امیر الملک ذوالفقار الدولہ محمد علی حسین خاں ظفر جنگ ۱۵ شعبان ۱۱۹۸ھ کو بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ ۹ سال کی عمر میں مختصرات فارسی اور قرآن کریم مولوی آدم سے پڑھا۔ فارسی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ چار ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ تخم

عقائد وفقہ میں شیخ بہاء الدین آملی اور طب میں حکیم احمد اللہ خاں کے شاگرد تھے۔ خط نسخ کی مشق میر مہدی اور شاہ فضل اللہ سے کی۔ ۱۲۱۸ھ میں مدراس میں چنا پٹن کا انتقال ہوا۔ نصرنگر میں دفن ہوئے۔ مختصر سا دیوان ان سے یادگار ہے۔ ملاحظہ ہو گلزار اعظم، ص ۲۲۲۔۲۲۳، نتائج الافکار، ص ۴۱۷)

۹۷۔ امیر الدین علی اور گیر میں فارسی کے جگت استاد تھے۔ (گلزار اعظم، ص ۲۵۲)

۹۸۔ حافظ احمد خاں کا خطاب اعظم الملک تھا۔ انھوں نے "تیسیر المطلوب فی اعمال المجبوب" (فارسی نثر، تالیف ۱۲۳۹ھ) اور "زبدۃ الحساب" بھی لکھیں۔ "زبدۃ الحساب" کا خطی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ انھوں نے عقائد و فقہ میں ۱۲۱۵ھ میں ایک کتاب اُردو نثر میں "سراج الایمان" لکھی ہے جس کا ایک مطبوعہ نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہے۔

۹۹۔ ان کا صحیح نام معز الدین تھا۔ (ملاحظہ ہو عبادت مرزا کا مضمون نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۷ء)

۱۰۰۔ مندرجہ ذیل تصانیف ان سے یادگار ہیں:

(۱) مثنوی نو بہار عشق (اُردو مطبوعہ) (۲) گنج قدرت (حالات قادر ولی ناگوری، قلمی انجمن ترقی اُردو کراچی) (۳) قصہ بہار (۴) بیاض کیفیت (ساقی نامہ) (۵) خسرو شیریں، قلمی مجلس (اُردو) (۶) وفات نامہ

۱۰۱۔ حاشیہ پر تحریر ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے بعد ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۰ھ کو معز الدین خاں نامی کا انتقال ہو گیا۔

۱۰۲۔ ناصر کا ۱۲۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ (صبح وطن، ص ۱۷۸) اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ظلمت زلفیں سے روشن ہے اس عارض کی تاب ماہ جس رشک سے اوڑھے ہے بادل کا نقاب
شیشۂ دل کا دُردِ عشق سے نا خالی ہووے کاسہ و جام میں ٹھیرے کب ہے ایسا اِداب

۱۰۳۔ مولوی قطب الدین دہلوی سے طب و درسی کتابیں علامہ شرف الملک سے پڑھیں۔ ان کی ایک تصنیف "احسن القصص" مطبع احمدی مدراس میں چھپی۔

۱۰۴۔ والہ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

(۱)۔ مثنوی نجم الہدیٰ (تصوف) تصنیف ۱۱۳۹ھ (اسپرنگر ورتھ نے اس کو والہ داغستانی کی تصنیف بتایا ہے) (۲) انتقام نامہ (شہادت امام حسینؑ) (۳) دیوان والہ فارسی (۴) دستور اعظم (نثر) علم عروض (۵) قانونچۂ انشاء (قواعد انشا پردازی) (۶) کشف المستور (۷) درمکتوم (شرح قطعہ نعمت خاں عالی) (۸) کبوتر نامہ (۹) مرغ نامہ

اُردو تصانیف

(۱۰) قصہ طالب و موہنی (بجواب بھولین ابن نشاطی) (۱۱) رازق باری (بجواب خالق باری) (۱۲) مرد نامہ (مزاحیہ نظم)

۱۰۵۔ ابو سعید والا میں وحشت آباد (ویلور) میں پیدا ہوئے۔ عربی مختصرات شاہ شمس الدین علی سے اور کتب متداولہ فارسی، میر مدیح

علی سے پڑھیں۔ خطاطی میں بھی ماہر تھے۔ (دیکھیے تذکرہ صبح وطن)

۰۶۔ والا تخلص استاد آگاہ کا عطیہ ہے (حاشیہ مولف)

۰۷۔ ۱۲۶۴ھ میں والا کا انتقال ہوا۔ "الحاقیۃ للمتقین" مادۂ تاریخ وفات ہے (گلزار اعظم ص ۲۷۱) اعظم نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

نکتہ سنج و موزوں سخن رفت بر بست چوں سوئے جنت
بے دل شاد گفت ہاتف غیب رفت بہات زیں جہاں والا

۱-۱۲۶۵ھ=۱۲۶۴ھ

(۱) نتائج الافکار ص ۷۶۱، ۷۶۰ (۲) گلزار اعظم ص ۳۶۹

۰۸۔ والا کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

(۱) آیت رحمت (۲) بحر رحمت (نثر فارسی) (۳) بزم (مثنوی) (۴) دیوان والا (قصائد و غزلیات) (۵) شرح قصائد عرفی (بحض) (۶) رسائل طرز بر طرز ملا ظہوری (۷) سہ نثر والا (قلمی)

۰۹۔ یکہ آپ نے عربی و فارسی اپنے والد سے پڑھی۔ حیدر علی کی حکومت کے زمانے میں ارکاٹ چلے گئے تھے۔ چوں کہ یکہ نواب والا جاہ کی بیگم کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا نواب کے حضور میں باریاب ہوئے۔ سیف الملک مختار کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۲۰۶ھ میں بمقام مدراس انتقال ہوا۔ (گلزار اعظم، ص ۳۳۲)

۱۰۔ والد کا نام خواجہ عالم تھا (صبح وطن، ص ۲۳۳) حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ (گلزار اعظم، ص ۳۳۱)

۱۱۔ خواجہ رحمت اللہ کے خلیفہ شاہ عنایت اللہ (امیین) سے بیعت تھے۔ اور انھیں سے سلوک و طریقت میں مستفیض ہوئے۔ (حاشیہ مؤلف)

Abstract

Guldasta-e- Karnatak is a rare, famous and unpublished Biographical Dictionary of Persian poets mostly residing in Madras, South India by Hakeem Ghulam Musa Raza Khan Raiq 1764-1832) It includes biographies of seventy Persian poets of the age All these poets were contemporary of the author and it was written between 1794-1832

A manuscript of this Biographical Dictionary is possessed by Kutab khana-e- Mufeed-e- Aam, Ehl-e-Islam in Madras. It was copied by Molana Muhammad Umar Yafai of Haiderabad and the last date of copying was May 31, 1935. A highly reputed and distinguished Scholar Dr. Mohammad Ayub Qadri (d. 1983), using this copied text as a primary source, summarized and translated it in Urdu. Here this unpublished and precised translated text with necessary annotations is given as a rare piece of literary archival significance.

بسم الله الرحمن الرحیم و به نستعین

ساز و نوای پرده شناسان مقام نازک خیالی و ارغنون نوازان قانون جاه معانی به پیش آهنگی زمزمهٔ حمد
صانعی است که تارهای انفاس رنگین اساس شان بر حرکت زبان معنی سنجان تنیده و مضمار گلو را صوت رنگین
و نغمات شیرین بلند آوازه گردانیده از نشهٔ محبت سپهر دگان نحل نشه در گوهرین طبایع حضرات انبیا و اولیا
دوانیده و گلبانگ الشعراء تلامیذ الرحمن را بگوش اسرار نیوش ارباب وجد و عرفان رسانیده کاسه
طنبور سه رنگ کاسه سر مقصد را انواع ترانهای رنگین ساخته و تار قلم سود نواهای دلکش شیرین نواخته اگر به
پیش و پس مصراعین بیت الله و طیبه طیبه مطلع برجسته که احسن المطالع دیوان کائنات است نظر بر دوخت
این همه صور مستحسنات معانی و انشعاب شعبات دنیوی و دینی با شعه لطف پرتو انداخت خمسه بدایع نگاران
خمسهٔ متحیره برای نظام جهانیان و اوج آگاهی عالمیان طرح کرده و مقصور رنگ را چون جام جهان نما سبب بینائی
موجب دیده وری پریان و دیگران گردانیده مثنوی بعیه روزگار را از لیف بنا و صنعت سلک آراسته
و مسمط موالد ثلثه را ترکیب چهار عنصر پیراسته کار و بار فرعون طلیسان مصر و غبته را که از معلقات سبعه حلقه
در دعوی انا و لا غیری می سر دند بعوا اسلسترانی در آیات فرقانی زیر و زبر نموده و غرور یکه تازان میدان فصاحت
میدان [illegible] از سر متر این مغروران بدر کرده دست [illegible]

معیار۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد [illegible]، شمارہ [illegible]، جنوری۔جون [illegible]

خازن الشعراء: اٹھارہویں۔ انیسویں صدی میں ہندوستانی و ایرانی علماء و شعراء کا ایک تذکرہ

عارف نوشاہی*

جنوبی ایشیا میں تذکرہ نویسی کی شاندار روایت چلی آ رہی ہے۔ اولیاء، صوفیہ، علماء، امراء، حکماء اور خوشنویسوں کے تذکروں کے ساتھ ساتھ شعراء کے تذکروں کا ایک بھرپور ذخیرہ یہاں تخلیق ہوا ہے۔ تذکرہ نگاری کی قدیم ترین روایت کے نمونے بھی اسی خطے میں ملتے ہیں۔ صوفیہ کا تذکرہ ''کشف المحجوب'' ہو یا شعراء کا تذکرہ ''لباب الالباب''، جنوبی ایشیا کے ان علاقوں میں لکھے گئے ہیں جو اب پنجاب (پاکستان) میں شامل ہیں، خواہ ان کے مصنفین باہر سے آئے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے عمومی انداز سے ہٹ کر کئی اور تجربات بھی کیے۔ کسی نے علاقے اور خطے کو بنیاد بنا کر افراد کے حالات لکھے، کسی نے معاشرتی طبقات کو پیش نظر رکھا۔ بعض نے اپنے ہم عصر شاعروں کے حالات کی تخصیص قائم کی۔ ایسے تذکروں کی اہمیت دو چند اس ہے، ایک معلومات کی تازگی کے اعتبار سے، دوسرے مؤلف کے عہد کی ادبی تاریخ کو سمجھنے کے لیے۔ برصغیر میں فارسی کے دورِ زوال میں معاصرین کے ایسے کئی تذکرے لکھے گئے، جیسے حاکم کا ''مردم دیدہ''، بندرابن داس خوشگو کا ''سفینۂ خوشگو'' (دفتر ثالث)، بھگوان داس ہندی کا ''سفینۂ ہندی''۔ یہ تینوں تذکرے شائع ہو کر سب کی دسترس میں ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور فارسی تذکرہ ''خازن الشعراء'' جو بہت اہم ہے، غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے عام نہیں تھا، لیکن اب شائع ہو کر سب کے لیے قابل استفادہ ہے۔

مصنف

اس تذکرہ کے مصنف سید علی کبیر عرف محمد میرن جان الہ آبادی ہیں، جن کے دو تخلص تھے۔ شروع شروع میں اپنے جد مادری شاہ محمد جمیل الہ آبادی کی نسبت سے ''اجملی'' تخلص کرتے رہے، بعد میں اسے موقوف کر کے ''سید'' تخلص رکھ لیا۔[1] مصنف نے اپنے مفصل حالات اسی تذکرے کے خاتمہ میں درج کیے ہیں۔ ان کی ولادت ۲۸ محرم ۱۲۱۴ھ/۲۲ جولائی ۱۷۹۹ء کو ہوئی۔ وہ والد کی طرف سے حسینی اور والدہ کی طرف سے عباسی سید تھے۔ ان کے والد سید علی جعفر الہ آبادی (م ۲۱ ربیع الثانی ۹۳ ... ۵ جون لاولی ۱۲۴۹ھ/۱۷ ... ۱۸۳۳ء) ہو والدہ کی جانب سے شیخ غلام قطب الدین مصیب الہ آبادی کے دختر زادہ تھے اور یہ شیخ مصیب، محمۃ

* پروفیسر شعبۂ فارسی، گورڈن کالج، راولپنڈی؛ ساکن ۷۰۱، اقبال ٹاؤن، ... اسلام آباد

امجد تھیں شیخ محمد فاخر زایر الہ آبادی بن شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے بیٹے تھے۔ مصنف کے مادری اور پدری اجداد میں بہ آبا بڑے اولیا و مشائخ اور علما بھی شامل ہیں، جیسے شیخ محمد ناصر افضلی (۱۱۲۳ـ۱۱۶۳ھ/۱۷۱۰ـ۱۷۵۰ء)، شاہ محمد اجمل (م شوال ۱۲۰۱ـ عمرہ و فات ۱۲۳۶ھ/۱۷۸۶ـ۱۸۲۱ء)، شیخ محمد افضل "محقر" (۱۰ ربیع الاول ۱۰۳۸ـ ۱۵ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۶۲۸ـ۱۷۱۲ء) وغیرہ۔ یہ پورا خاندان علما و صلحا و مشائخ کی ایک کہکشاں ہے۔ الہ آباد میں دائرہ حمیلیہ اسی خاندان کے فرد فرید شاہ محمد اجمل الہ آبادی سے منسوب ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ طبیعت کی موزونی انھیں وراثت میں ملی تھی۔ شروع شروع میں اپنا کلام اپنے نانا شاہ محمد اجمل کو دکھاتے رہے، پھر اپنے والد سے بھی مشورہ لیتے رہے۔ اپنے دو خالوں، محمد اکمل نجف اور شاہ ابو المعالی اور چچا زین الدین "بیمار" اور شاہ محمود سے بھی اصلاح لی۔ چار مرتبہ مولوی برہان الدین محمد اعظمی ساکن دیوہ سے مشورہ لیا لیکن زیادہ تر مولانا روح العیاض فایز (م ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۶ء) ساکن قصبہ مئو کو کلام دکھایا کرتے۔ مصنف کے دیگر اساتذہ میں جن سے انھوں نے نقلی اور عقلی علوم پڑھے، مولانا نور الحسن (والد کے چچا)، مولانا رضی الدین احمد الہ آبادی اور ان کے بیٹے مولانا نصیر الدین حیدر، مولوی محمد حنیف دستوری ولایتی شامل ہیں۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ میں اپنے والد کے مرید ہوئے اور انھی سے دیگر سلاسل قادریہ سہروردیہ مداریہ اور نقشبندیہ کی اجازتیں لیں۔ حدیث کی سند اپنے والد اور سید محمد ادریس اطرابلسی سے لی تھی۔

مصنف کو ایک خاص لگاؤ تاریخ گوئی سے تھا۔ انھوں نے قطعات تاریخ کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ خود ان کا پورا خاندان اور قریبی رشتہ دار تاریخ گوئی کے تمام طریقوں میں ماہر تھے۔ جس کے کئی نمونے اس تذکرے میں مل جاتے ہیں۔

مصنف نے متنوع موضوعات پر تصانیف تیار کیں تھیں۔ خود کہتے ہیں کہ جب تعلیم و تعلم سے ان کا دل بھر گیا تو "بہ تالیف رسایل جدیدہ در عقاید و فقہ و سیر و اخبار و آثار و قصص انبیا علیہم السلام پرداختم"۔[۲] یعنی عقاید، فقہ، سیرت، تذکرہ کے موضوعات پر، اور انبیا کے قصوں پر جدید رسائل لکھے۔ خود نوشت حالات میں اپنی ۲۳ مذہبی تصانیف کے اسما لکھ کر اس جملے کا اضافہ کیا ہے "این ہمہ تالیفات تمام و کامل اند و اکثری از آن متداول اند"۔[۳] یعنی یہ سب تصانیف مکمل اور پوری ہو چکی ہیں اور ان میں اکثر متداول اور رائج ہیں۔ مصنف نے اپنی چھ شعری تصانیف کا ذکر الگ کیا ہے اور ان کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ "ہمہ مثنویات تمام و کامل اند"۔[۴] تذکرہ خازن الشعراء میں دیگر افراد کے تذکرے کے ضمن میں مصنف نے اپنی کچھ اور کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کل ملا کر انتالیس (۳۹) نام بنتے ہیں۔ یہاں سب تصانیف کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ تحائف ارباب الحیات الی ارواح الاموات

۲۔ ثبات خلافت ابی بکر صدیق" تصنیف شیخ محمد طاہر بن شاہ خوب اللہ الہ آبادی کا عربی سے فارسی ترجمہ[۵]

۳۔ "حمیلیہ" مثنوی در احوال وفات شاہ محمد اجمل الہ آبادی[۶]

۴۔ "حیدو جمال"

۵۔ اربعین فی مناقب خلفاء الراشدین"، جس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

۶۔ اظہار فضل عبادۃ" بشرح رسالہ اسرار العبادۃ شاہ عبد العزیز دہلوی

۷۔ "انتخاب العقیدۃ"

۸۔ "بستان العاشقین" (فارسی مثنوی)، دو دفتر ہجائی کی سلسلہ الذہب کی طرز پر۔

۹۔ "رسالہ مہابی فضائل شہر ذی الحجہ الحرام"

۱۰۔ "تحفۃ الکبیر فی مناقب خلفاء الراشدین و اصحاب الکبیر"، ضخیم کتاب ہے۔

۱۱۔ ترجمہ رجال شمائل ترمذی"، دس سے زیادہ اجزا پر مشتمل ہے۔

۱۲۔ "تشحیذ الایمان فی فضائل شہر رمضان"

۱۳۔ "تکملہ وفیات الاعلام" شاہ محب اللہ الہ آبادی کی تصنیف "رسالۃ الکلام فی وفیات الاعلام" کا تکملہ ہے۔ (۷)

۱۴۔ "خازن الشعراء و اوقات النادرات"، زیر بحث تذکرہ

۱۵۔ "خلاصۃ الانساب"، منظوم فارسی شجرہ نامہ جو خازن الشعراء میں نقل ہوا ہے۔ (۸)

۱۶۔ "خلاصۃ المناقب فی فضائل اہل البیت و اصحاب سید آل غالب"

۱۷۔ دیوان دختر شاہ غلام اعظم افضل" کی ترتیب و تدوین (۹)، تذکرہ خازن الشعراء کی تصنیف کے وقت مصنف شاہ غلام اعظم کے دوسرے دیوان کی ترتیب میں مصروف تھے۔

۱۸۔ "دیوان شاہ محب اللہ "یکتی" الہ آبادی کی ترتیب و تدوین۔ (۱۰)

۱۹۔ "دیوان قصاید، غزلیات، رباعیات، مقطعات (فارسی)"۔

۲۰۔ "سلک جواہر" (فارسی مثنوی)، جامی کی یوسف و زلیخا کے وزن پر۔ اسے مصنف نے تذکرہ خازن الشعراء میں شامل کیا ہے۔

۲۱۔ "صحیفۃ العلویہ فی ذکر وفاۃ الوالد"

۲۲۔ "صمصیۃ فی ابطال التقیۃ"

۲۳۔ "ضیاء القلوب فی سیر المحبوب"

۲۴۔ "عشرۃ البشر فی فضائل العشرۃ"

۲۵۔ "عقیدۃ الاصحاب فی حدیث الباب"، حدیث "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" مراد ہے۔

۲۶۔ "غایۃ البیان فی دمہ دن اہل فسق و عصیان"

۲۷۔ "غایۃ التوضیح فی شرح صیغہ تسبیح"

۲۸۔ "غایۃ المطالب فی بحث ایمان ابیطالب (عربی)"

۲۹۔ "غرۃ الکمال فی فضائل شہر شوال"

۳۰۔ "فتح حسین" (فارسی مثنوی)، جس میں الہ آباد میں محرم میں ہونے والے ایک ہندو مسلمان تنازعہ کی روداد ہے۔

۳۱۔ "فوائد جعفریہ"

۳۲۔ "لوح محفوظ"، خلفائے راشدین، اصحاب، مہاجرین، اہل بیت کے مناقب میں چالیس احادیث کا منظوم ترجمہ ہے اس کے آخر میں مؤلف نے اپنا تمام مہاجرت ناموں کو بھی جمع کر دیا ہے۔(۱۱)

۳۳۔ "محاسن الاولیا" مشائخ کا تذکرہ۔(۱۲)

۳۴۔ "مطلوب الطالبین فی ذکر اسماء رجال الاربعین"، رسالہ "نجوم الاہتداء" کے خاتمہ میں جن چالیس احادیث کا بیان ہوا ہے اس رسالہ میں صحاح ستہ کے مصنفین اور ائمہ مذاہب اربعہ کے حالات لکھے ہیں۔

۳۵۔ "نان و کباب" (فارسی مثنوی)، شیخ بہائی کی نان و حلوا کے تتبع میں۔

۳۶۔ "نجم ثاقب" (فارسی مثنوی)، جامی کی لیلیٰ و مجنون کے وزن پر۔

۳۷۔ "نجوم الاہتداء لطالب الاقتداء فی الاربعین من الخلفاء"

۳۸۔ "وسیلۃ القبول فی تعیین مولد الرسول المقبول"

۳۹۔ "ہدایۃ الاحباب فی الاکتفاء بالتحریر بین اہل البیت والاصحاب"(۱۳)

مؤلف نے صرف "نہایۃ المطالب فی بحث ایمان ابی طالب" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے باقی کسی تصنیف کی زبان کی تصریح نہیں کی۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ بقیہ تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔ بعض کتابوں کے بارے میں یقین ہے کہ فارسی ہی میں ہیں اور وہ میں نے لکھ دیا ہے۔

مؤلف کے ایک بیٹے سید محمد بشیر ملقب بہ ابو القاسم محمد تھے جن کے لیے انھوں نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۷۰ھ کو "خازن الشعراء" کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے کتابت کیا۔(۱۴)

افسوس کہ جس شخص نے دوسروں کی تواریخ وفات لکھنے کا بے حد اہتمام کیا، ہمیں اس کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

تذکرۂ خازن الشعراء:

یہ تذکرہ انھوں نے سید محسن علی کان پوری کے کہنے پر سودے سے بیاض میں تبدیل کیا۔(۱۵) اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق ایک عرصے سے شعرا کے بارے میں یادداشتیں لکھ رہے تھے۔ اس کا آغاز ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں اور اختتام ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں ہوا اور اسی مناسبت سے اس کے دو تاریخی نام مقرر کیے۔ خود لکھتے ہیں:

"این تذکرہ کہ واقعات شعرا دارد کہ تاریخ ختم آن از این الفاظ برمی آید و موسوم بہم این اسم است، و مشہور بہ تذکرہ خازن الشعراء است کہ تاریخ افتتاح آن از این الفاظ برمی آید۔"(۱۶)

چون ورود و شد خزانہ دل
یعنی این گنج یافت گوہر سا
سیدم ہاتف بہ تحت بدل

نام تاریخ ''خازن الشعراء''(۱۷)

لیکن وہ اس کے بعد بھی اس پر اضافات کرتے رہے جیسا کہ اپنے بھائی سید احمد کبیر شاہ عرف احمد جاں کی وفات ۱۸ شعبان ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) کا واقعہ یہ کہہ کر لکھا ہے ''بعد جمع این اوراق''۔(۱۸)

برصغیر میں مصنف کے معاصرین کا تذکرہ ہے۔ بعد میں مصنف نے اس میں خاندان محمدیہ خلفیہ ''کیا کیہ رالہ آباد) کے متوسلین کے حالات شامل کر کے اس کی افادیت دوچند اس کردی ہے اس طرح اب یہ محض شعرا کا تذکرہ نہیں رہا بلکہ پیسے مشائخ اور علما کا تذکرہ بن گیا ہے جو شعر بھی کہتے تھے۔ مصنف نے ہر شاعر کے تخلص کو بنیاد بنا کر حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق، ان کے حالات لکھے ہیں۔ خاتمہ میں اپنے حالات بھی لائے ہیں۔ حالات نگاری میں یہ التزام دیکھنے میں آیا ہے

تاریخ پیدائش و وفات دی ہے۔

شجرۂ نسب اور وطن / مسکن بتایا ہے۔

گر اپنے خاندان کا فرد ہے تو اس سے اپنی رشتہ داری کی نوعیت بتائی ہے اگر صاحب ترجمہ کا خاندان کے بزرگوں سے عقیدت کا رشتہ تھا تو اس کا اظہار کیا ہے۔

صاحب ترجمہ کی علمی تصانیف کے نام لکھے ہیں۔

مختلف مناسبتوں سے قطعات تاریخ درج کیے ہیں۔

اپنے مآخذ کا ذکر کیا ہے۔

اس میں مجموعی طور پر ایک سو نواسی (۱۸۹) شعراء کے حالات درج ہوئے ہیں۔(۱۹)

فہرست شعراء:

خود مصنف نے شعراء کے ناموں کی فہرست بر حسب تخلص تیار کی تھی اور ۶ رجب ۱۲۷۱ھ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تذکرے کے ساتھ لگائی۔ یہاں مصنف کے الفاظ ہی میں لکھی گئی فہرست دی جا رہی ہے البتہ اس میں تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ مصنف نے ابجائی ترتیب میں صرف پہلے حرف کی رعایت رکھی تھی، جب کہ میں نے تمام حروف کو مدنظر رکھ کر اس فہرست کی ترتیب نو کی ہے تا کہ شاعر تلاش کرنے میں سہولت ہو۔ نیز ہر نام کے آگے مطبوعہ تذکرے کے صفحہ کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔

فہرست اسامی مندرج در خازن الشعراء

الف

ب

ز

س

ش

ص

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

و

تذکرے کی خوبیاں:

تذکرے کے کچھ اور محاسن بھی ہیں، جیسے

بعض صاحبان سوانح کے خطوط نقل کیے ہیں، جیسے شاہ عبدالعزیز دہلوی کا خط بنام شاہ محمد اجمل الہ آبادی، میر رامرتضیٰ بلگرامی کا خط بنام شاہ صاحب، نواب حسن قلی خان بہادر وارستہ کے چار رقعات بنام شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی۔ [۴۰]

مصنف کا اسلوب عموماً طور پر سہل ہے۔ خود کہتے ہیں چونکہ یہ تذکرہ فارسی میں ہے لہٰذا اس میں عربی عبارت لانے کے روادار نہیں ہیں [۴۱] اور ریختہ کو بھی نظر انداز کیا ہے [۴۲] اس کے باوجود چند شعراء کے اردو اشعار محفوظ ہو گئے ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

سر ہے پیچھے سو لا جانے کون پاپی، کون ہی ہے
عشق اللہ ولی ہو کی جانیں، جن کو علم لدنی ہے
خوب دیکھا تو یہ دونوں بہتر، یہ بیراہ وہ پنتھی ہے
سچ کہو تو گردن مار یہ تن شیشہ تن [کذا: سن] سی ہے

(محمد یحییٰ تنہا)

یوں ہی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہے
ایک قاتل اسے ہر آن میں مل رہتا ہے

(امانت اللہ خان امان)

دستِ دستہ میں پر مجھے آرام نہیں ہے
میں نقش کف پا ہوں، میرا کام یہی ہے

(غلام حسین شہید نارہپوری)(۳۳)

شیخ محمد علی حزیں لاہیجی کا اہلِ ہند کے ساتھ جو معارضہ اور معرکہ رہا ہے یہ تذکرہ اس کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مثلاً شاہ محمد اجمل نے حزیں کی ان رباعیات کا رباعی میں جواب دیا ہے جو اس نے ہندوستان کی ہجو میں کہیں تھیں۔ یہ رباعیات اس تذکرے میں نقل ہوئی ہیں۔(۳۴) میر سراج الدین علی آرزو(۳۵) علی عظیم ثبات(۳۶) حزیں(۳۷) شمس الدین فقیر(۳۸) اور نور العین واقف(۳۹) کے تراجم میں اس معارضے کے اشارات موجود ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف کے ایک جد شیخ غلام قطب الدین مصیب خاص طور پر حزیں سے ایک علمی مشکل حل کروانے الٰہ آباد سے بنارس گئے تھے اور حزیں ان سے بڑے احترام سے پیش آئے تھے۔ اس ملاقات کا دلچسپ احوال اس تذکرے میں موجود ہے۔(۴۰)

میر فاخر مکین کی بھی اپنے ہم عصروں سے چشمک رہتی تھی۔ ان کی حمایت اور مخالفت کرنے والے دو گروہ موجود تھے۔ مومن لال انیس کا تذکرہ انیس الاحبا صرف مکین کے شاگردوں کا تذکرہ ہے۔(۴۱) خازن الشعراء میں مکین کا مصنف کے جد مصیب کے ساتھ معارضہ کا ایک طویل واقعہ درج ہوا ہے۔(۴۲)

بعض معاصر تذکروں اور تذکرہ نویسوں کے بارے میں مصنف نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ریاض الشعراء کے حوالے سے علی قلی خان والہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "تطویل محل عادت اوست"(۴۳) یعنی بات کو طول دینا اس کی عادت ہے اور میر شمس الدین فقیر کے حالات کے اندراج کی مثال دی ہے۔ مصنف نے یہ اعتراض اس لیے کیا ہے کہ والہ نے اپنے تذکرے میں میر فقیر دہلوی کے دو رسائل وغیرہ فی علم القافیہ اور خلاصۃ البدیع تمام و کمال اور مثنوی والہ و سلطان کا بیشتر حصہ نقل کر دیا ہے۔(۴۴) میر نقش علی لکھنوی کے تذکرہ موضح معانی کے بارے میں مصنف نے شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی کی رائے نقل کی ہے جنھوں نے مصنف سے اس کا مسودہ لے کر دیکھا تھا، کہتے ہیں: "الحق کہ تذکرہ متین بہ ادای تمام تالیف نمودہ کہ بہ این شناعت و تطویل، بہ متانت او کمتر دیدہ شدہ"(۴۵) یعنی بے شک، یک سنجیدہ تذکرہ اتنی تیاری کے ساتھ تصنیف کیا ہے۔ اتنا ضخیم اور طویل تذکرہ ایسی نزاکت کے ساتھ کم دیکھنے کو ملا ہے۔(۴۶)

راقم السطور کے لیے اس تذکرے میں درج بعض معلومات نادر ہیں یا اپنی نوعیت سے منفرد ہیں۔ مثال کے طور پر سراج الدین علی خان آرزو کے بارے میں لکھا ہے کہ شب و روز عیاشی اور شراب نوشی میں مشغول رہتے تھے، اور اپنے جد شیخ غلام قطب الدین مصیب سے یہ بات نقل کی ہے کہ میر مظہر جان جاناں، جو آرزو کے دوست تھے، کہا کرتے تھے کہ میں حیران ہوں کہ دن رات کی اس عیاشی کے باوجود آرزو نے اس کثرت سے تصانیف کے لیے وقت کہاں سے نکالا! قابلیت اور عمدگی کے باعث آرزو کے مزاج پر بھی کاوش غالب تھا۔ کہتے ہیں اپنی موت سے چند ماہ قبل شراب نوشی اور بربط کاسوں سے توبہ کر لی تھی۔(۴۷)

بلگرام کے علمی خانوادہ کے گل سر سبد میر غلام علی آزاد ہیں۔ میر آزاد کے مصنف کے خانوادہ سے تعلقات تھے۔ اس لیے اس تذکرے میں بلگرام کے کئی معاصر افاضل کے بارے میں قیمتی معلومات جمع ہو گئی ہیں۔ "واضح باد کہ ذکر شعرای بلگرام، درین تذکرہ بسیار چند است، خصوصاً این سبب کہ سلسلۂ خاندان ما ایشان بہ خاندان حضرت کالپی ملحق است و از ادراک صحبت مسعود میر آزاد جمع اجداد الاحقر ...

با شیوخ کرام الٰہ آباد با حسن وجوہ تذکرہ بر معرض آوردہ"(۳۸)

جیسا کہ سطور بالا میں بتایا گیا ہے کہ مصنف کو تاریخ گوئی سے بے حد دلچسپی رہی ہے اور اس تذکرے میں متعدد قطعات تاریخ مختلف مناسبتوں سے درج ہوئے ہیں۔ دو مقامات پر مصنف نے اس ضمن میں خصوصی التزام کیا ہے۔ ایک، شیخ غلام قطب الدین مصیب کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی تاریخ وفات (۱۲۸۷ھ) قاضی محمد عمر بن علی خان کاکوروی نے آیت "و من یخرج من بیتہ مهاجرا الی اللّٰه و رسوله" سے نکالی اور اس میں ایسی صنعت رکھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ قاضی کاکوروی نے اس ضمن میں عربی میں ایک مختصر تاریخی رسالہ لکھا جسے مصنف نے نقل کر دیا ہے۔(۳۹) خود مصنف نے تذکرہ کے خاتمہ میں اپنی کہی ہوئی تاریخیں جمع کر دی ہیں۔(۴۰)

اہل علم کی علمی ضروریات پورا کرنے کے لیے انھیں کتب مہیا کرنا، ان سے کتابیں نقل کرنا، خوب سے خوب تر کی جستجو میں اپنی پرانی تصانیف ضائع کر دینا، اخلاف کی نااہلی کی وجہ سے اسلاف کی کتب ضائع ہو جانا، یہ کچھ ہمارے معاشرے میں ہوتا رہا ہے۔ اس کی ایک جھلک اس تذکرے میں بھی ملتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کا ایک خط شاہ محمد اجمل الہ آبادی کے نام نقل ہوا ہے۔ غالباً شاہ محمد اجمل نے شاہ صاحب سے تحفۂ اثنا عشریہ کا نسخہ مانگا تھا، اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ان کے پاس تحفہ کا ایک ہی نسخہ تھا وہ بھی نقل نویسوں کی دست مالی سے فرسودہ اور خستہ ہو چکا ہے، بہتر، انھوں نے دیا ہے کہ کاتبوں سے لکھوایا جائے، ایک نقل پر دس بارہ روپے صرف ہوتے ہیں جو کتابت اور کاغذ کی اجرت ہے۔(۴۱)

میر محمد افضل ثابت الہ آبادی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہر سال اپنا مدون شدہ دیوان یہ کہہ کر دھو دیتے تھے کہ اگلے برس اس سے بہتر لکھیں گے۔(۴۲)

خواجہ ابوالفتح خان جنون کا دیوان مصنف کے خاندانی کتب خانے سے اس لیے ضائع ہو گیا کہ مصنف کے بعض رشتہ دار یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد یہ کتابیں مصنف کو منتقل ہو جائیں گی، لہٰذا انھوں نے دوسروں کو دے دیں۔ مصنف افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کثیر بزرگوں اور بالخصوص عظیم آباد کے ان خواجگان کے دواوین، جن میں خواجہ عبداللطیف خان عبرت کا کلیات بھی شامل ہے، نا اہل افراد کو منتقل ہو گئے۔(۴۳)

شاہ مرتضیٰ جنون الہ آبادی کی کتب محض اس وجہ سے ضائع ہو گئیں کہ ان کی اولاد سے کوئی صاحب لیاقت نہ تھا۔(۴۴)

مولانا کمال الدین محمد حقیر الہ آبادی اور ان کے بھائی مولانا جمال الدین احمد الہ آبادی دونوں صاحب کثیر التصانیف تھے۔ ان کی کتابیں ان کے نواسوں کے پاس تھیں۔ یہ نواسے اس قدر ممسک تھے کہ کتاب کا ایک ورق بھی کسی کو نہ دیتے تھے، نہ دکھاتے تھے، حالاں کہ وہ خود بھی ان کتابوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ "حیف علم خوش کہ کتاب از من است" کے مصداق حتی الوسع کتابیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔(۴۵)

یہ تذکرہ جیسا کہ کہا گیا، زیادہ تر الہ آباد کے علمی رجال کے گرد گھومتا ہے اور وہاں کی علمی فضا کو بیان کرتا ہے، بالخصوص دائرۂ اجمیلہ کا جو علمی ماحول تھا، اس کو بیان کرتا ہے۔ مصنف نے شیخ غلام قطب الدین مصیب کا ایک بیان ان کی تصنیف تحفۃ الامراء سے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانے میں الہ آباد شہر میں عجیب رونق تھی، بالخصوص شیخ مصیب کے مدرسے میں شب و روز سوائے علم، حدیث، فقہ کے ذکر کے اور کوئی کام نہ تھا۔ شاعروں کی اس قدر نشستیں ہوتی تھیں کہ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے۔ (۴۶)

تذکرے کی خامیاں:

تذکرہ میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔

مصنف نے شعراء کے کلام پر بہت کم تبصرہ کیا ہے اور جاندار تنقید کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ تنقید کے نمونے اس طرح کے ہیں، مثلاً واقف بٹالوی کے بارے میں لکھا ہے کہ خوب شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں درد اور سوز و گداز بہت ہے اور ان کا اسلوب جداگانہ ہے [سخن او علیحدہ است]۔ غزل کے عاشق ہیں۔ ان کا کلام دل کے تار چھیڑتا ہے اور دوئی سے عاری نہیں ہے۔ کلام میں پختگی ان کی وقت سے ظاہر ہے۔ میں نے اپنے بعض ہم عصر شعراء سے یہ بات سنی کہ واقف کہا کرتے تھے کہ مولوی [روم] کے قول سے سند نہیں لینی چاہیے بلکہ شیخ علی حزیں کا قول مستند ہے! معلوم نہیں واقف نے یہ بات کیوں کہی؟ (۴۷)

انتخاب کلام کے لیے مصنف نے اگرچہ طے یہ کیا ہے کہ براہ راست دواوین سے انتخاب کیا جائے، لیکن اس میں انھیں کہیں کہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اور انھیں بیاضوں اور تذکروں پر زیادہ انحصار کرنا پڑا۔ ناصر علی سرہندی کے انتخاب کلام میں لکھا ہے: "دیوان علی بہ نظر فقیر نگذشتہ، از سفاین و تذکرہ باچیدہ شد" (۴۸) حیرت ہے ناصر علی جیسے شاعر کا دیوان، جو ہندوستان میں متداول تھا، مصنف کو نہیں ملا۔ یہی حال میر رضا فخر مکین دہلوی کے انتخاب کا ہے: "دیوانش بدست تحریر این تذکرہ بدست نیامد، چند ابیات از سفینہ ہا برآوردہ نوشتہ شد" (۴۹) دوسروں کی بیاضوں سے نمونہ کلام دینے سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ خود مصنف کا ذوق اور پسند کیا تھی؟

تذکرہ کے مآخذ:

مصنف نے اپنے مآخذ کا کہیں یکجا ذکر نہیں کیا، لیکن یہ التزام ضرور رکھا ہے کہ جو چیز، جس جگہ، جہاں سے نقل کی ہے اس کا حوالہ دے دیا ہے بلکہ اس حد تک امانت داری برتی ہے کہ منقولہ عبارت کے بعد لفظ "انتہی" لکھا ہے تا کہ منقول عنہ اور خود مصنف کی اپنی عبارت کے درمیان امتیاز قائم رہے۔ میں نے تذکرے کا مطالعہ کر کے اس سے مصنف کے مآخذ اخذ کیے ہیں۔ یہ دو نوعیت کے ہیں، ایک ملفوظی یا سماعی یعنی جو کچھ سنا اور دوسرے مکتوبی یعنی جو کچھ لکھا ہوا استعمال کیا۔ ملفوظی یا سماعی مآخذ میں اس طرح لکھتے ہیں:

"از زبان بزرگان خویش شنیدہ ایم" (۵۰) یعنی ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے؛

"از والد ماجد علیہ الرحمہ یاد دارم" (۵۱) مجھے اپنے والد ماجد سے سنی ہوئی بات یاد ہے؛

شاہ محمد اجمل سے سنی روایت (۵۲)

مکتوبی مآخذ میں مصنف کا زیادہ تر انحصار اپنے اجداد کی تصانیف، بیاضوں اور تحریروں پر رہا ہے اور انھوں نے [illegible]

خانے کا خوب استعمال کیا ہے۔ بعض معاصرین کے حالات، ان سے بطور خاص لکھوا کر شامل کتاب کیے، جیسے مولوی محمد ہادی بن شیخ محمد پناہ عثمانی کے حالات (۵۳)۔ بہر حال کتابی اور تحریری مآخذ کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ہر نام کے آگے تذکرہ خازن الشعراء کے اس صفحے کا حوالہ دیا گیا جہاں اس کا بطور مآخذ نام آیا ہے:

آتش کدہ آذر (۹۷)
ید بیضا، آزاد بلگرامی (ص ۱۶)
اوراق نوشتہ میر غیاث الدین الحسنی (ص ۵۵)
بیاض حضرات محمود (ص ۱۸۱)
بیاض شاہ محمد اجمل الہ آبادی (ص ۳۷، ۵۵)
بیاض محمد فاخر، میر الہ آبادی (ص ۳۱۰)
تاریخ فرخ آباد، سید ولی اللہ فرخ آبادی (ص ۸۴)
تحفۃ الابرار المعروف بہ سوانح الحرمین، شیخ غلام قطب الدین مصیب (۲۱، ۱۹۷)
تذکرۃ الافضل، تذکرہ شیخ محمد ناصر افضلی (ص ۲۸، ۱۱۹)
تذکرۂ بے نظیر، میر عبد الوہاب افتخار (ص ۶۴)
تذکرۂ تصنیف نواب علی ابراہیم خان (شاید صحف ابراہیم؟)
تکملۂ ولایت، الاعلام (۱۷۷)
ثمرات، شاہ خوب اللہ الہ آبادی (ص ۲۴۴)
رسالہ وصایای شیخ محمد افضل الہ آبادی (ص ۱۱۳)
ریاض الشعراء، علی قلی خان والہ (ص ۹۷)
سرو آزاد، آزاد بلگرامی (ص ۹۴)
سفینہ ہای مصیب (ص ۶۱، ۲۲۷) یعنی شیخ غلام قطب الدین کی بیاضیں
مرآت محمدی (ص ۱۵)
(تذکرۂ) مردم دیدہ، حکیم بیگ خان حاکم (ص ۶۵)
مکتوبات شاہ خوب اللہ الہ آبادی (ص ۹۵)

خازن الشعراء کے مخطوطات اور اشاعت:

اس تذکرے کا واحد نسخہ انڈیا آفس، لندن (نمبر ۳۸۸۹) میں موجود ہے۔ اس کے مسودہ ہونا بظاہر مصنف [illegible] و ق
اس پر بہت کاٹ چھانٹ ہوئی ہے کتب خانہ شاہ اجمل، الہ آباد میں بھی مخطوطہ ہیں۔ جو میر فضل [illegible] دہلی سے [illegible] ڈاکٹر
مہدی رضوی نے نسخۂ لندن کو اوراق الہ آباد کی مدد سے مدون کیا ہے اور انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران نے ۱۳۸۶ شمسی/۲۰۰۷ء میں شائع

ص ۳۰، س: سلسلہ قصب، سلسلہ نسب درست ہے۔

حواشی

۱۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۷۶۔۷۷
۲۔ ایضاً، ۲
۳۔ ایضاً، ۳۳۶
۴۔ ایضاً، ۳۳۷
۵۔ ایضاً، ۱۷۹
۶۔ ایضاً، ۳۴، ۳۸
۷۔ ایضاً، ۱۰
۸۔ ایضاً، ۳۳۶۔۳۳۹
۹۔ ایضاً، ۷۳
۱۰۔ ایضاً، ۳۳۹
۱۱۔ ایضاً، ۳۳۵
۱۲۔ ایضاً، ۴۶۸
۱۳۔ مصنف نے خود نوشت حالات میں اپنی تصانیف کی فہرست صفحات ۳۳۵ سے ۳۳۷ پر یکجا دی ہے بقیہ ما مختلف مقامات پر آئے ہیں۔
۱۴۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۳۸۲
۱۵۔ ایضاً، ۳،۲
۱۶۔ ایضاً، ۳۸۲
۱۷۔ ایضاً، ۵
۱۸۔ ایضاً، ۳۳۰
۱۹۔ سفوری، ۱۹۷۲ء، ۳ء، ۹۰؛ تقوی، ۱۹۶۲ء، ۵۱۳؛ گلچین معانی، ۱۳۴۸ش، ج۲، ص ۶۹۵ اور رضوی، ۲۰۰۷ء، شمارہ ۵ نے یہ تعداد ۱۹۰ بتائی ہے چونکہ مصنف نے اپنا تذکرہ دو مقام پر کیا ہے ایک ''احملی'' تخلص کے تحت اور دوسرا ...، اس لیے شاید شعرا کی گنتی میں ایک عدد کا اضافہ ہوگیا ہے۔ صحیح تعداد ۱۸۹ ہی ہے۔
۲۰۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۳۱۲، ۳۱۲، ۳۱۱

۲۱۔ ایضاً، ۱۷۹

۲۲۔ ایضاً، ۱۹۳

۲۳۔ ایضاً، ۶۶، ۶۸، ۱۷۰

۲۴۔ ایضاً، ۳۱

۲۵۔ ایضاً، ۶۳

۲۶۔ ایضاً، ۹۹

۲۷۔ ایضاً، ۱۳۱–۱۳۳

۲۸۔ ایضاً، ۲۱۵

۲۹۔ ایضاً، ۳۱۶

۳۰۔ ایضاً، ۱۲۵

۳۱۔ انیس الاحباب، باہتمام محمد انصار، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۶ء سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۲۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۲۸۶–۲۹۲

۳۳۔ ایضاً، ۲۱۸

۳۴۔ والہ، ۱۳۸۴ش، ۱۸۶؛ ۱۷۷۸–۱۷۷۷؛ ابوالہ ۲۰۰۱ء، ج۱، صفحات ۵۰۹–۵۱۲

۳۵۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۳۰۰

۳۶۔ باغ معانی، ذخیرہ سوائی محل لکھنو کے نسخے کا ذکر اشپرنگر نے کیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۳۸ ورق اور ہر ورق ۲۰ سطور پر مشتمل تھا لیکن اب ناپید ہے۔ اس تذکرے کا کچھ حصہ (حرف الف تا ظا) عابد الشرقی لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اسی نسخے کی بنیاد پر ۵۹ معاصر شعراء کے حالات پر مشتمل ایک تلخیص، عابد رضا بیدار کے اہتمام سے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۹۲ء میں خدا بخش لائبریری کی طرف سے مکرر شائع ہو چکی ہے۔ نقش کے حالات بیدار صاحب کو نہیں ملے تھے۔ خازن الشعراء سے بھی کوئی خاص معلومات نہیں ملتیں، سوائے اس کے کہ شاہ محمد اجمل الہ آبادی (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء یا ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۳ء) میں جب لکھنو گئے تو نقش سے ملے اور دونوں حضرات میں ایک دیرینہ مودت قائم ہو گیا۔ شاہ صاحب نے نقش سے ان کا تذکرہ مانگا جو انھوں نے مرتب کر دیا۔ شاہ صاحب نے اول تا آخر اسے بڑے غور سے دیکھا اور اپنی بیاض میں اس کے بارے میں یہ رائے درج کی: سپاہی پیشہ ہوتے ہوئے، دنیاوی مشاغل کی کثرت رکھنے اور عدیم الفرصت ہونے کے باوجود یہ ضخیم تذکرہ لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی صفات پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ ہیں۔ شعر و شاعری میں بھی اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۳۰۰

۳۷۔ میرن جان، ۲۰۰۷ء، ۶۳

۳۸۔ ایضاً، ۲۱۲

۳۹۔ ایضاً، ۲۶۰–۲۶۱

۴۰۔ ایضاً، ۲۷۵–۲۸۰۔ اور خود تذکرہ خازن الشعراء کی تصنیف پر معاصر شعراء نے جو قطعات تاریخ کہے وہ بھی مصنف نے یہیں درج

کیے ہیں۔

۴۱۔ ایضاً، ۳۶-۳۷

۴۲۔ ایضاً، ۹۷

۴۳۔ ایضاً، ۱۰۱، ۱۸۶

۴۴۔ ایضاً، ۱۰۱

۴۵۔ ایضاً، ۱۱۳

۴۶۔ ایضاً، ۱۹۸-۱۹۹

۴۷۔ ایضاً، ۲۱۶

۴۸۔ ایضاً، ۱۹۷

۴۹۔ ایضاً، ۴۹۱

۵۰۔ ایضاً، ۹۷

۵۔ ایضاً، ۴۸

۵۲۔ ایضاً، ۵۲

۵۳۔ ایضاً، ۳۳۰

فہرست اسناد حوالہ

رضوی، اختر مہدی، ۲۰۰۷ء، مقدمہ تذکرہ خازن الشعراء، تہران، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی

سٹوری، سی اے (C A Storey)، ۱۹۷۲ء، **Persian Literature: A Bio-Bibliographical Survey**، لندن

گلچین معانی، احمد، ۱۳۴۸ش، تاریخ تذکرہ ہای فارسی، جلد اول، تہران، دانشگاہ تہران

میرن جان، شاہ علی کبیر محمد محمد اللہ آبادی، ۲۰۰۷ء، تذکرہ خازن الشعراء، بہ تصحیح دکتر اختر مہدی رضوی، تہران، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی

نقوی، علی رضا، ۱۹۶۴ء، تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، تہران، موسسہ مطبوعاتی علمی

والہ، علی قلی خان، ۲۰۰۱ء، ریاض الشعراء، جلد اول، بہ اہتمام شریف حسین قاسمی، رام پور، رضا لائبریری

والہ، علی قلی خان، ۱۳۸۴ شمسی [۲۰۰۵ء]، ریاض الشعراء، بہ اہتمام سید محسن ناجی نصر آبادی، تہران، انتشارات اساطیر

Abstract

Khazin-Al-Shu'ra is a Biographical Dictionary of Indian and Persian intellectual personalities and poets of 18th and 19th Century. It has been compiled by Syed Ali Kabeer alias Muhammad Meran Jan of Allahbad, born in 1797/1212. He has claimed to be an author of 39 books on various subjects. He started to write Khazin-Al-Shu'ra in 1844/1260 and completed in 18749/1265, but he kept on making additions afterwards. In this Biographical Dictionary, he has given an account of his 189 contemporary Sufis, Saints and Ulama, who used to write poetry as well, in alphabetic order.

تذکرهٔ خازن الشّعراء

تألیف

شاه علی کبیر محمّد میرنجان محمّدی اله آبادی

تصحیح

دکتر اختر مهدی رضوی

انجمن آثار و مفاخر فرهنگی

تهران ۱۳۸۶

معیار۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مثنوی 'نامۂ شوق'

سید حسن عباس*

استاد شیخ ابراہیم ذوق دہلوی (۱۲۰۴ تا ۱۲۷۱ھ) کے شاگردوں میں ایک نام حکیم سلطان رام پوری کا بھی ملتا ہے لیکن بدقسمتی سے سلطان کے بارے میں اکثر تاریخ و تذکرے خاموش ہیں۔ علی گڑھ مزمل لائبریری میں نواب رحمت اللہ خاں شروانی کی عنایت سے حکیم سلطان کے دیوان کا نادر مخطوطہ دیکھنے کا موقع ملا۔ دیوان سلطان کا یہ مخطوطہ جس کا نمبر ۸۵۹ – ۸۱۰ ہے بلاشبہ نوادر روزگار سے ہے۔ اس سے استاد ذوق دہلوی کے شاگردوں کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ ہوتا ہے۔ دیوان ردیف وار مرتب ہے۔ یہ نسخہ خط نستعلیق میں اور غالباً بخط شاعر ہے۔ نسخہ آب دیدہ ہے لیکن مجلد اور مکمل ہے۔ دیوان کی ترتیب کا سال ۱۲۸۵ھ/۶۹-۱۸۶۸ء ہے۔ دیوان میں ترجیعہ اور قطعات تاریخ ترتیب بھی ہیں۔

"تمت بالخیر الحمد للہ کہ نسخہ ہذا بتاریخ ۶ شہر ذی الحجہ یوم یکشنبہ ۱۲۸۵ ہجری قدسی در قصبہ مجگوں صورت اختتام یافت۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم

زاں کہ من بندۂ گنہگارم" (ص ۲۳۹)

صفحہ ۲۴۱-۲۴۰ پر مولوی حیات حسین صاحب قبول کے قطعات ترتیب دیوان ملتے ہیں۔ قطعات سے پہلے ذیل کی تعارفی عبارت سلطانؔ نے لکھی ہے۔

'جناب مولوی حیات حسین صاحب قبول تخلص ساکن ماڈول مدرس خاص مجگوں کہ یکی از عنایت فرمایان حال این خاکسار است، از نتائج طبع آن گرامی است۔"

فکرِ سلطاںؔ سے مرتب ہوا جب یہ دیوان	اور گلزار سخن کا ہوا اوس سے عیاں
یہ زبانِ شعرا ہے جو کلید اسرار	آشکار ہوئے ہر ایک پہ سب راز نہاں
سن کے لکھنے کا قبولؔ اوس کے ہوا شوق مجھے	اور طبیعت ہوئی اس بات کی از بس خواہاں
واہ واہ سوجھ سے وہیں نکلی ہر اک بلبل کے	لکھی تاریخ جو 'بستانِ خیالِ سلطاںؔ"

* پروفیسر، شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، بھارت

’’بستان خیال سلطان‘‘ سے ۱۳۰۴ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں لیکن جب ’’والدہ‘‘ کے ۱۹ اعداد نکال دیے جائیں تو دیوان کی ترتیب کا سال ۱۲۸۵ھ برآمد ہو جاتا ہے۔

غزل کی ایک اور تاریخ ہے جو دراصل تاریخ اتمام دیوان ہے

حکیم شہی سنج حکمت مآب 	کہ ہر خاص و عام است ازو فیض یاب

برآوردہ از بحر طبع بلند 	گہر ہائے روشن تر از آفتاب

پے ہنگام تکمیل دیوان او 	پے سال آں آمدم در حساب

ندا زد درو مطلعے ہائے حیب 	بہر باش ظاہر بہ ہر شیخ و شاب

بگفتم سنی الفاش قول

کہ دیوان سلطان بگو انتخاب

۱۲۹۲ھ

بقول شاعر مذکورہ تاریخ میں سے لفظ ’’عیب‘‘ کے ’’ب‘‘ کے دو اعداد نکال دیے سے سال اتمام دیوان ۱۲۹۰ھ برآمد ہو جاتا ہے اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس دیوان کی ترتیب سے تکمیل تک پانچ برس کی مدت صرف ہوئی۔

حکیم سلطانؔ رام پوری کے بارے میں اطلاعات کا فقدان ہے البتہ دیوان سلطانؔ کے آخر میں ۹۵ اشعار کی یک مثنوی ’’نامۂ شوق بہ دوست بہ اظہار محبت بہ طرز عاشقانہ‘‘ ملحق ہے جس کے مطالعے سے چند باتیں ضرور معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ سلطانؔ کا پیشہ طبابت تھا۔ یہ اُن کے نام یا تخلص کے ساتھ لفظ ’’حکیم‘‘ کے ساتھ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ وہ محلوں میں رہتے تھے اور لوگوں کے حکیم کے نام سے جانے جاتے تھے۔

۳۔ ثروت مند نہیں تھے مگر طبابت کے پیشے کے سبب مشہور ضرور تھے۔

۴۔ غالباً طبابت عثمان خاں کے والد سے سیکھی تھی۔

۵۔ سید عثمان، سلطان کے دوست کے فرزند تھے۔

۶۔ سید عالمؔ کو سلطانؔ نے اپنا استاد کہا ہے۔

۷۔ مولوی محمد یار جو شاعر تھے، سلطان کے استاد زادہ تھے۔

۸۔ سلطان کو شاعری میں ذوقؔ دہلوی (؟) سے تلمذ تھا۔

آخر الذکر بات ان کی غزلوں کے مقطعے سے معلوم ہوتی ہے۔ دیوان میں ایسی کئی غزلیں ہیں جن کے مقطعوں میں سلطانؔ نے استاد ذوقؔ کا نام اور ان سے اکتساب کا صراحتاً اعلان کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

اک غزل سلطانؔ ہم لکھتے ہیں اس میں اور بھی

ذوقؔ سے ذوقِ سخن دیکھیں تو کیا ہو گیا 	(ص ۶)

شاعری سے تجھ کو کیا نسبت تھی سلطانؔ ہے تو یہ

ذوقؔ کی خدمت میں کیا آیا سخن ور ہو گیا 	(ص ۱۰)

سلطاں تو شعر اور بھی پڑھ اس میں دیکھ تو
اللہ نے ذوقؔ کو ترا استاد کر دیا (ص۶۸)

سلطاںؔ اگر نہ یہ مدد شاہ ذوقؔ ہو
لذت سخن میں کس کی ہو ، کس کا بیاں لذیذ (ص۸۲)

ذوقؔ سا ہی جب سخن ور اٹھ گیا سلطاں تو اب
کون ہے جس سے کہ چاہیں پھر سخن کی داد ہم (ص۱۲۹-۱۳۰)

سلطاںؔ ہے فکر شعر میں کاوش ضرور کیا
اک ذوقؔ تھا سو وہ ہی اب اے مہرباں نہیں (ص۱۳۲)

ذوقؔ کے فیض سے سلطاںؔ تو غزل اور بھی
کر یہ تبدیل قوافی ، وہ رقم دیکھیں تو (ص۱۷۸)

سلطاںؔ وہ نہیں ذوقؔ سے ہے طبع کچھ رسا
اپنا تو آج شعر میں ہم سر نہ ہو نہ ہو (ص۱۹۲)

گرم کیوں طبع سے سلطاںؔ نہ مضامین نکلیں
روح ذوقؔ آ کے سدا دیتی ہے امداد مجھے (ص۲۲۳)

اک غزل اور بھی لکھ اے سلطاںؔ
ذوقؔ مرحوم کی حمایت ہے (ص۲۲۸)

اب چند سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں کہ آخر سلطاںؔ نے ذوقؔ سے کب اور کیسے شرف تلمذ حاصل کیا۔ کتابت کی صورت کیا تھی۔ دہلی میں مقیم تھے یا کسی اور ذریعے سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ کس کے توسط سے ذوقؔ تک رسائی ہوئی۔ یہ ذوقؔ دہلوی ہی ہیں یا کوئی اور ذوقؔ لیکن دیوان سلطاںؔ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کا زمانہ ایک ہی رہا اور پھر مذکورہ بالا مقطعوں میں ذوقؔ کو مرحوم بھی لکھا گیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ذوقؔ کا جس زمانے میں انتقال ہوا یعنی ۱۲۷۱ھ میں، سلطاںؔ رام پوری حیات تھے۔ اس سے قرین قیاس ہے کہ یہ ذوقؔ دہلوی ہی ہوں گے۔

میں نے دیوان کے سرسری مطالعہ کے دوران شاعر کی کچھ غزلیں اور متفرق اشعار کے ساتھ مثنوی "نامۂ شوق" نقل کی تھی اور یہ اس امید پر ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے کہ شاید سلطاںؔ رام پوری کے بارے میں کچھ اور اطلاعات دستیاب ہو جائیں۔

دیوان کے صفحہ اول پر نعت شریف سید المرسلینؐ ہے جس کا ایک مصرع یہ ہے

مرحبا مرحبا رسولؐ اللہ

ص ۱۳ پر منقبت علی ہے جو مخمس میں ہے اس کا ایک بند یہ ہے

مشکل کو میری حل شہ مرداں مجھے
مشکل جو کام ہیں مرے آساں مجھے

کسی منہ سے یہ تو میں کہوں احساں مجھے
ہیں ہر خدا ضرور ہے ہر آن مجھے

مشکل کشا ہو تم ہی تو مشکل کشا علیؑ

حمدیہ غزل" کے عنوان سے یہ نعت ملتی ہے

بندہ ہوں میں تو ایک خدائے کریم کا　　　میں اک گدا ہوں اپنے کریم و رحیم کا
میں ہم زباں ہوں طائرِ عرشِ عظیم کا　　　بلبل ہوں ایک باغ قدم کے قدیم کا
میرا شفیع احمدؐ مختار ہا وفا　　　دل بستہ اس کے گیسوئے عنبر شمیم کا
دریائے معرفت کا وہی ہے دُر یتیم　　　یگانہ خلق ہے اسی دُرِ یتیم کا
جتنے نبی ہیں رتبۂ عالی سے پست ہیں　　　پہنچا نہ اس کے رتبے کو رتبہ کلیم کا
جلوہ خدا خود اپنا دکھا آپ چھپ گیا　　　پردہ وہ لے کے منہ پہ محمدؐ کی میم کا
کیا مدح اس کے خُلق کی ہووے بھلا کہ ہے　　　مداح خود خدا ہے جو خلقِ عظیم کا
وہ تو کبھی یہاں کا نہ واں کا کہیں کا ہو　　　جو معتقد نہ اس کے ہو چاروں ندیم کا
کاہیدہ جسم ہے یہ ہوائے مدینہ کا　　　لا رب اڑا کے لے چلے جھونکا نسیم کا
میرا علاج قلب و مدینے کی ہے ہوا　　　قلبی مکان علاج ہے ایسے سقیم کا
اللہ آرزو ہے مری قبر میں میرا　　　دل سہم ناک ہووے نہ شکل سہیم کا
یارب بہ حق حسنی و حسینی اور بتولؑ کے　　　ہو جادہ یک تار رہِ مستقیم کا

کیوں آفتابِ حشر پہ چشمک نہ میں کروں
سلطاںؔ جو سر پہ سایہ ہو کوثر تسنیم کا

یک نعت اور ملاحظہ ہو

نہ گر عالم میں نورِ احمدی جلوہ کناں ہوتا　　　تو میں ہوتا نہ تو ہوتا نہ یہ کون و مکاں ہوتا
نہیں گر شان میں احمد کے احدیت نشاں دیتی　　　نشانِ بے نشاں اپنا بھلا کیوں کر عیاں ہوتا
نہ مسجد تھی نہ بُت خانہ نہ کعبہ تھا نہ میخانہ　　　یہ جلوہ سب اسی کا ہے نہیں یہ کچھ کہاں ہوتا
خدا کے لطف سے یہ ہی ہوا ہے دست گیر اپنا　　　نہیں پھر کون تھا اپنا شفیع عاصیاں ہوتا
حقیقت تیرے کینہ کی سبھی پھر فلک کھلتی　　　مقابل میں اگر ہم سا کوئی آتش زباں ہوتا
احد احمد میں کیا دوری تھی مثل بو و گل سلطاںؔ　　　نہیں گر میم ہی کا فرق آئینہ میں عیاں ہوتا (ص ۱۰۳)

ردیف وار دیوان کی پہلی غزل یہ ہے

جلوۂ حسنِ خود نما دیکھا　　　مست تھی جب خودی خدا دیکھا
نقشۂ غیر جب مٹا دیکھا　　　ہم نے پھر کچھ نہ ماسوا دیکھا
آپ میں کیا کہ ہم (سے) سب شے میں　　　جلوۂ اُس کا ہی جا بہ جا دیکھا
دل (ہے) قطرہ (تو) عین کثرت میں　　　بحر وحدت کا برملا دیکھا

بند جب آنکھ ہم نے کی اپنی　　تھا جو مخفی کھلا کھلا دیکھا
وہ نظر میں ہے اور نظر سے دور　　دل کیا آنکھوں سے بارہا دیکھا
وائے رسوائی اور ناکامی　　لذت عشق کا مزا دیکھا
جلوۂ ذات حق ظہور خاص　　احمد پاک مصطفاؐ دیکھا
احد (اور) احمد ایک ہیں دونوں　　فرق اک میم کا ذرا دیکھا
چار عنصر ہیں اس کے چاروں یار　　ایک سے ایک کو سوا دیکھا
مردم چشم و نور دیدۂ خاص　　شہ حسینی و حسنی سوا دیکھا
خاکساروں کا بعد مرگ غبار　　چشم اختر میں توتیا دیکھا

چند اور غزلیں اور غزلوں سے منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

یہ کس زلف کا دھیان آنے لگا　　کہ اک ابر غم دل پہ چھانے لگا
اُسے زندہ در گور کرکے رہا　　جسے عشق الفت جتانے لگا
مری خاک آئے جہاں جس کے ہاتھ　　وہ غم کا ہی پتلا بنانے لگا
ہو ضبط فغاں عشق میں کب تلک　　کلیجا ہی جب منہ کو آنے لگا
دلِ زار خوں ہو کے مژگاں پہ آ　　غم یار آنکھیں دکھانے لگا
لے اب تو ہوا شاد خوش باش قاتل　　ترا خنجر غم ٹھکانے لگا
مرے ساتھ کینہ ہے کچھ چرخ کو　　کہ بیٹھے بٹھائے ستانے لگا
بڑھانے لگا ہجر کے زور کو　　شب وصل کا غم گھٹانے لگا
ہنسی مجھ کو آتی ہے اس پہ کہ سلطاںؔ
میں رویا تو وہ مسکرانے لگا (ص۴۳)

وہ کبھی آشنا نہیں ہوتا　　ہے وفا یا وفا نہیں ہوتا
سر جو تیرا پھرا نہیں ہوتا　　دل تو یوں ہی جلا نہیں ہوتا
کون سی جا ہے جس جگہ پیارے　　ذکر میرا ترا نہیں ہوتا
خون عاشق سے ہاتھ رنگیے گا　　ایسا رنگ حنا نہیں ہوتا
کون سی جا تخت پہ سلطاںؔ کے
مرحبا مرحبا نہیں ہوتا (ص۵۰)

سب سے ملتے ہو بر ملا صاحب　　کیا سبب ہم سے کیوں جدا صاحب

دے جو دل تم سے بے مروت کو — کون ہے کس کا سر پھرا صاحب
بیٹھے بیٹھے یہ جی میں کیا آئی — اٹھ چلے ہو کے جو خفا صاحب
دل لیا اور لے کے قدر نہ کی — آفریں تم کو مرحبا صاحب

(ص۵۱۔۵۲)

خزاں سے جائے چمن میں اگر بہار الٹ — تو کیوں نہ جائے دل عندلیب زار الٹ
چمن میں آئے کہیں موسم بہار الٹ — الٰہی جائے خزاں سیاہ کار الٹ
خلش سے خار کی بلبل کا ناک میں دم ہے — الٰہی آئے کہیں موسم بہار الٹ
وہ ایک بار بھی سیدھا ہوا نہ سلطاں حیف — دلا ہے جس نے مرے دل کو بار بار الٹ

(ص۶۵۔۶۶)

ہے وہ سلطانِ سخن بے شک ہے جس کا یہ کلام — سب یہ کہتے ہیں سخن داں اپنا دیوان دیکھ کر

(ص۸۸)

چشمِ تر کی بدولت اے سلطاںؔ — موتیوں کا میں ہار رکھتا ہوں

(ص۳۵)

خاص دل سے ہوں میں سلطاںؔ معتقد شبیرؑ کا — کیا عجب دیں حشر کے دن جامِ کوثر ہاتھ میں

(ص۸۸)

ہے یہی دعا ہووے کر سلطاںؔ ہو قبول — حشر کے روز ہمیں سایۂ شبیرؑ کے بیچ

(ص۸۸)

سلطاںؔ یہی ہے اپنی دعا ہے یہ مدعا — ہوں روزِ حشر ساقیٔ کوثر کے آس پاس

(ص۹۹)

مذکورہ اشعار اور مثنوی "نامۂ شوق" کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سلطان رام پوری بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری قدیم طرز کی ہے جس میں گل و بلبل اور حسن و عشق کے ساتھ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ دیوان میں ۹، ق ۲۴ سے ۹، ق ۳۲۸

ا۔ "پاس" کی ردیف میں ذوقؔ کی بھی ایک غزل ہے
تیر و کماں ہے گر بتِ ناوک فگن کے پاس — آہ و قدِ خمیدہ ہے اس خستہ تن کے پاس

ہے۔ یہ مثنوی بلکہ ہے۔ یہ ایک عاشقانہ مثنوی ہے جو بطور نامہ لکھی گئی ہے۔ آغاز کلام میں شاعر اپنے کسی مشفق کو اپنی خیریت لکھتا ہے اور شوق ملاقات میں بے حال نظر آتا ہے۔ جب اسے عثمان خاں سے پتا چلتا ہے کہ وہ جس کے شوقِ دید کا مشتاق اور خواہاں ہے وہ یہاں آئی اور چلی گئی تو شاعر پر بے قراری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مثنوی کے پہلے حصے میں سلطان نے معشوق کا سراپا بھی بیان کیا ہے۔ مثنوی بہت رواں اور سادگی کی حامل ہے۔ صفحہ بوسیدہ ہونے کے سبب دو ایک جگہوں پر الفاظ پڑھنے میں نہیں آ سکے۔ اسی طرح کتابت میں کہیں کہیں کسی کسی مصرعے میں کوئی لفظ لکھنے سے چھوٹ بھی گیا ہے جس سے مصرعہ ناموزوں ہو گیا ہے اور اگر موزوں ہے تو لفظ مطلب میں دشواری ہوتی ہے۔ ایسے مصرعوں کی نشاندہی (کذا) اور جو الفاظ پڑھنے میں نہیں آ سکے وہاں تین نقطوں سے کر دی گئی ہے۔ چوں کہ اب تک اس مخطوطے کا کوئی اور نسخہ معلوم نہیں ہو سکا ہے اس لیے مذکورہ جگہوں کی تصحیح ممکن نہیں ہو سکی۔ املا قدیم ہے۔ ایک اور اک ہوئے اور ہوتی رہے اور اسی رنگ اور گئی ایسے الفاظ موقع کی مناسبت کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح یہاں کی جگہ یاں یا برعکس اور وہاں کی جگہ واں یا برعکس کا استعمال بھی ملتا ہے جب کہ وزن میں یاں یا واں ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سلطان کے اشعار اور مثنوی کی نقل و اشاعت کی اجازت دے کر نواب رحمت اللہ خاں شروانی صاحب نے علم دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی اس عنایت کے لیے میں ہمیشہ ان کا احسان مند رہوں گا۔ ولی نظر سلطان رام پوری کے بارے میں شاید کچھ معلومات بہم پہنچ سکیں اس طرح اردو کے شعری ادب میں سلطان جیسے قادر الکلام شاعر کا سرمایہ اضافہ محسوب ہوگا۔ لیجیے اب مثنوی **نامۂ شوق** ملاحظہ کیجیے۔

مثنوی نامۂ شوق

مہرباں میرے ا میرے مشفق حال ‖ تم رہو فضل حق سے مالا مال
بعد از شوق و اشتیاق تمام ‖ ہی دعائم سلام خیر انجام
اے مرے مہرباں میرے مشفق ‖ دور ہوں دور تجھ سے ہے یہ قلق
کیا لکھوں خیریت کا اپنے حال ‖ نام ہے خیریت تو خیر محال
شوق نے تیرے کر دیا ہے چین ‖ چین ہے ہجر میں کسے ... ؟
غم میں تیرے پڑا تڑپتا ہوں ‖ دم بہ دم آہ دم ہی تیرا بھرتا ہوں
میں کر دل سے ہوں شیفتہ تیرا ‖ چاہیے تجھ کو بھی خیال مرا
دل کے ہاتھوں سے اپنے ہم تو مرے ‖ ہائے رے ہائے رے، ارے رے رے
کبھی بے تاب جب بھی ہوتا ہوں ‖ شعر سلطاںؔ یہ پڑھ کے روتا ہوں
طپش دل ہے کیا خدا جانے ‖ کوئی آفت ہے یا بلا جانے

[ص ۲۴۴ الف]

دل یہ خانہ خراب کیا جانے ‖ کیا کرے گا یہ کیا خدا جانے

ہو گئی تجھ سے کیا جدائی ہے ایک آفت ہے اور تو آئی ہے
تازہ صدمہ ہوا یہ کیسا اور مجھ کو بے تاب کر دیا فی الفور
بولے عثمان خاں کہ اے سلطان وہ تو آئی بھی اور رہی ہے یہاں
اور کئی بار تجھ کو یاد کیا پوچھا ہم سے مکان کا بھی پتا
ہم نہ تیرے مکاں کو جانتے تھے تجھ سے ملنے سے رہ گئی ایسے
بس اٹھا شمع کے دل پہ شعلہ سا شوق شوق بسکہ کیا کیا (کذا)
دل کو ہاتھوں سے اپنے تھام لیا دیکھیے ورنہ اور ہوتا کیا
صدمہ ایسا ہوا کہ آہ رے آہ دل یہ بگڑا کہ بس خدا کی پناہ
بیقراری سی بے قراری ہوئی اشک باری سی اشک باری ہوئی
دل دھڑکنے لگا ہوا بے تاب تھا گماں یہ کہ بر میں ہے سیماب
بے خودی نے لیا کچھ ایسا دبا نہ رہا ایک ذرہ ہوش بجا
جب کہ ٹلوا چکا دلِ ناداں اور آئے گئے ہوئے اوساں
پھر شکایت فلک سے تھی ایسی دولت آئی ہوئی گئی کیسی
ہو فلک تیری خانہ بربادی یار ملتا تو ہوتی خوش حالی
تو نے کس کس کو مار ڈالا ہے کج ہے تو ایک ہی روہ (کذا) ہے
ہے تیری سب یہ کار پردازی فتنہ سازی ہے سب تیری یاری
پھر ملالت ہوئی گریباں گیر ایسا کھنچنے لگا دلِ دلگیر

[۳۴۴ب]

کہ جو شاید کبھی ملیں گے وہ یہ بتا تجھ کو کیا کہیں گے وہ
کس طرح آنکھ ان سے جوڑے گا یہ تو بتلا کہ تو کہے گا کیا؟
دل کو جب میں جواب دے نہ سکا تب یہ دل ہی نے مجھ کو سمجھایا
طور پکا ہے یہ ترا سلطاں تو یہ کہنا مجھے خبر تھی کہاں
میں وہی تھا کہ غیب داں کچھ تھا مجھ سے اس کا گلہ ہے بس بے جا
تم کو اتنی تو ہو گئی ہے خبر ہے وہ سلطان ہاں کہیں تو مگر
یہ گلہ تو تمھیں پہ عاید ہے مجھ پہ شاید ہے اور نہ زائد ہے
ذکر گر اور جا پہ کرتے جناب ایسا تم نام تو نہ تھا یہ خراب
کوئی تو تم کو ہاں نشاں دیتا میں تو ہرگز بچھا نہیں رہتا
کیوں کہ یہ پیشۂ طبابت ہے ہر کہ وعدہ کو اس سے حاجت ہے

نہیں دنیا کی گرچہ ثروت ہے — کہہ نہیں سکتا جیسی شہرت ہے

پوچھتے آپ اس طرح سے جو ہاں — ٹونک کے ہیں حکیم ہیں وہ کہاں

بس اسی وقت کوئی کہہ دیتا — کہ فلانی جگہ وہ ہے رہتا

اور عثمان خاں وہ ہیں سردار — اُن کو پروا کیا ہے کیا درکار

وہ بھلا کب مری خبر رکھتے — ہوتی بھی گر خبر تو کب کہتے؟

کیوں کہ مجھ سے انھوں کے نوکر ہیں — وہ امیر اور ایک کم تر ہمیں

بس تجاہل کو کام فرمایا — نہیں معلوم کیا خیال آیا

مجھ میں اور اُن میں کہیئے فرق ہے کیا — میں ہوں شاگرد اُن کے والد کا

یوں جو دیکھو تو ہیں مرے بھائی — ہاں مگر یہ انھیں نہیں بھائی

اور سیٹھ جو ہیں میاں عثمان — تھی ملاقات میری اُن کی کہاں

ایک دن گھر پہ خان والا کے — میں بھی بیٹھا تھا وہ بھی بیٹھے تھے

[۴۴۳الف]

بولا اک شخص نام لے کے مرا — ہے تو سلطان خاں مزاج اچھا

سید عثمان یہ سن کے چونک اٹھے — میری نسبت سے اُن سے کہنے لگے

کیوں جی سلطان خاں تو ہیں وہ یہی — جستجو تھی ، تلاش تھی جن کی

پھر کہا یہ انھوں نے ہیں وہ یہی — تھی نہ ان کی مکاں سے آگاہی

جس جگہ پر یہ پہلے رہتے تھے — بارہا واں تو ہم بھی جاتے رہے

اور اب جس جگہ میں رہتے ہیں — اُس سے اصلا نہیں ہوں واقف میں

پھر تو آپس میں ہم وہ ایک ہی تھے — ایسے ملتے ہیں ویسے مل بیٹھے

حق تعالیٰ انھیں رکھے خورسند — نکلے وہ دوست کے مرے فرزند

اقربا کا سب اُن کے ذکر آیا — اور والد کا ان کے نام لیا

میں کہا وہ مرے بڑے ہیں دوست — ایک جاں ہیں ، جو کیا ہیں دو ہیں پوست

کھل گیا حال پھر چھپا نہ رہا — آپ کی دل لگی کا حال کہا

اور غزل جس کی شان میں تھی لکھی — دیکھا اس کو بھی اور اس کو بھی

تم نے پایا جسے چھلاوا ہے — قد قیامت غضب کا مکھڑا ہے

بال اس کے وبالِ جاں کہیے — دل میں آتی ہے بس الجھ رہیے

آنکھ پر اس کے چشم قدرت ہے — پھر نظر کوئی دیکھیے قدرت ہے

ناک ہے اس کے منہ پہ یا کہ چھڑی — چشمۂ آفتاب پہ مچھلی

مسی مالیدہ لب اگر دیکھے — خضر بھی ہو تو راہ کو بھولے
سرو کو اس کے قد سے نسبت کیا — کہ نمونہ ہے اک قیامت کا
میری اور آپ کی حقیقت کیا — کام ہی ایک ہے نظارا کا

[۳۳ب]

ہے حقیقت میں نور کا ٹکڑا — ہے سراپا وہ نور کا پتلا
گر سراپا لکھیں تو دور نہیں — رشک ہو آپ کو ضرور نہیں
کیوں ہے دل کا معاملہ بے ڈھب — شبہہ آوے نہ آذری کو عجب
اور غزل جو لکھی سو کیا کہنا — ایسا شاعر تو دیکھا اور نہ سنا
شاعری ہے کہ ساحری کیا ہے — ہر سخن ایک ساحری زا ہے
خوشہ چیں آپ کا ہے خاقانی — کون ہے پھر کہ ہو ترا ثانی
روشنی دار انوری ہے ترا — راستی پر ہے راست قول مرا
فیض یاب ایک تیرا فیضی ہے — ذرہ تیرا ذرا ظہوری ہے
عنصری عسجدی و فرخی — آرزو مند تیرے ہیں یہ سبھی
تیرا پس خوردہ کھا کے عرفان کا ہاں — بن گیا ہے وہ ایک نعمت خاں
وہ ظہوری جو قابلی ہے — تیرے وہ عرفان کی رکابی ہے
وہ جو اک لونڈی واقف تھا — خاک در سے ترے بنا تھا
تیرا ثانی نہ اتنے سالوں میں — وہ ہیں اہل سو اہل کالوں میں
تھا جو سودا وہ ایک سودائی — تجھ کو خوش اس کی بات کب آتی
کیا منسوخ تو نے ناسخ کو — خاک جل کر ہوا ہے آتش تو
کیا اسد گیری تیرا کار ہے یہ — تیرے پیشہ کا اک شکار ہے یہ
برق کیا، طور کیا ہے کیا گویا — ان کا کہیے تو مرتبہ ہے کیا
عقد ایک عقد ہے خرافاتی — اس کو اک بات تک نہیں آتی
جرأت اتنی کہاں تھی جرأت کی — جو کبھی عمر بھر ہو جرأت کی

[۳۴الف]

بات سب دیکھ لے امانت کی — تیرے مضمون سے خیانت کی
تھا جو مومن وہ اک مسلماں تھا — تیرے در کا وہ ایک دہقاں تھا
سن کے تیرے کلام کو ممنون — دل و جاں سے ہوا ہے کب ممنون
میر کی میری یاں نہیں چلتی — سودا کی طبع جلتی ہے جلتی (کذا)

درد بھی درد سے ہیں بس دم سرد　　تیرے اشعار سن کے یہ پُر درد
گرم تھی گرچہ بس ہے گرما گرم　　روبرو تیرے بس رکی ہے شرم
تھا تقریر و تحریر بھی کچھ چیز　　حوصلہ جس میں ہو کرے وہ تمیز
ذوق سے طبع کے ترے ہاں ذوق　　شوق سے قبر میں رکھے ہے شوق
غرض اک اور ہے جو ہووے صاف　　منھ پہ آتی ہے اب کہوں کا صاف
آپ سچ پوچھ آئے ، آئے نہیں　　دل تو اٹکا تھا ٹونک ہی میں کہیں
ہوش بہ کوئی وہاں تمھارا ہے　　یہ تو اک بات آشکارا ہے
بات ہے یہ تو ایک سیدھی سی　　ہے کسی سے تمھاری خوب سدی
سب کی الفت تمھیں بھلا دے گی　　ہے ہُوا تیز تیرہ صدی کی
مجھ ہی پہ کچھ فقط نہیں موقوف　　ہے نہیں کیا مجھے تمیز و وقوف
اور بھی دوست و آشنا سارے　　ہیں شکایت میں آپ سے بارے
خیر اس کا نہیں گلہ ہم کو　　ہاں جو دل ہی سے دو بغض ہم کو
میرے لائق جو کار ہو تو سدا　　مجھ کو لکھتے رہیں جناب ذرا
دوست خالص سمجھ کے مجھ کو ضرور　　بے تکلف لکھیں نہ ہو گا قصور

[۴۳۴ب]

کر سرو چشم سے بجا لاؤں　　دل سے حاضر کروں جہاں پاؤں
نامہ موقوف ہوا ہے تمام　　میرے سب دوستوں کو پہنچے سلام
کیوں کر یک جا معاش رکھتے تھے　　ایک جا بود باش رکھتے تھے
یاد ان سب کی جب ستاتی ہے　　یہ غزل ہی زبان پہ آتی ہے

غزل

جمع یکجا ہوئے تھے کیا احباب　　ہو گئے ہائے کیا جدا احباب
تھا نہ کچھ رنج نے کدورت دل　　سب تھے آئینہ ساں صفا احباب
جمعیتوں میں گزرتے تھے اوقات　　کیا ہی خوش خوش تھے آشنا احباب
سیر باغ و بہار ہوتی تھی　　خندہ کرتے تھے کھلکھلا جوں حباب

ہم تو سلطاں کہیں گے مر کر بھی
آشنا یا حبیب یا احباب

ہیں جو مشفق مرے نصیر الدین اُن کی تم کو اگر خبر ہو کہیں
تو ضرور اُن کا حال لکھیے گا مجھ کو مرہون جان منّت کا
مولوی ہیں جو سید امام میرے استاد ہیں وہ نیک انجام
در رحمت ہو اُن کے اوپر باز میرا پہنچے انھیں سلام و نیاز
ہیں جو وہ مولوی محمد یار شاعر بے بدل ہیں اور طرّار
میرے استاد زادہ ہوتے ہیں وہ بزرگ اور اُن کا خورد ہوں میں
اُن سے دگرا برادرانہ ہے واقف اس حال سے زمانہ ہے
ہو گی تکلیف اتنی تم کو ذرا اُن کو کہنا سلام شوق مرا
اور جو دوست و آشنا ہیں تمام پہنچے اُن کو سلام خیر انجام
اور جو میرے حال کو پوچھیں آپ اُن سے سلام میرا کہیں
اور یہ کہدیں کہ وہ بہت خوش ہے بس دعا کی امید ہے تم سے

ہے یہی ورد اُس کا صبح و مسا
حق سے کرتا ہے سب کے حق میں دعا

○

فیض بخشائے خلق و فیض رساں قبلہ و کعبہ ، صاحب ایماں
اے خلاصۂ نعمت و اکرام حق تعالیٰ تجھے رکھے مادام
روز افزوں ہو تیرا جاہ و جلال حق تعالیٰ کرے بڑھے اقبال
مشفق حال شوقِ سلطاں حق تعالیٰ کی تجھ پہ حفظ و اماں
بعد گلدستۂ نیاز تمام می رسانم سلام خیر انجام
چہ سلامی سلام عجز و نیاز چہ سلامی سلام سوز و گداز
چہ سلامی سلام روح فزا چہ سلامی، سلام خیریت
چہ سلامی سلام عافیت چہ سلامی سلام صدق و صفا
چہ سلامی سلام با دل ریش چہ سلامی سلام خیر اندیش
چہ سلامی کہ خیریت با او چہ سلامی کہ عافیت با او

[۳۳۵ ب]

چہ سلامی چو صبح نور افزا چہ سلامی چو مہر نور و ضیا
چہ سلامی کہ با نیاز توام چہ سلامی کہ با ناز توام

چہ سلامی کہ مجلس دلشاد
چہ سلامی کہ صد سلامت باد

خیریت ہے جناب کی مطلوب
عافیت ہے جناب کی مرغوب

شوق پا بوس دل کو از حد ہے
شوق پا بوس حد سے بے حد ہے

چرخ سے گاہ کچھ شکایت ہے
بخت سے گاہ کچھ حکایت ہے

کبھی کہتا ہوں یہ کہ واہ رے بخت
کبھی کہتا ہوں یہ کہ آہ رے بخت

چرخ سے یہ کہ کیا کیا تو نے
دور سرکار سے رکھا تو نے

میں کہاں وصل جناب کہاں
الٰہی اللہ کس کو تاب و تواں

پائے بوس سدا حضور رہوں
چاہتا یہ نہیں کہ دور رہوں

پل بھی گزرے ہے ایک ماہ و سال
آہ دوری نے کر دیا پامال

ہر گھڑی آپ کا فسانہ ہے
ہر زباں آپ کا ترانہ ہے

آب و دانہ سے پر میں ہوں مجبور
اس میں تقدیر کچھ قسمیں ہے ضرور

ناموافق ہے یاں کی آب و ہوا
بس بجز اس نے مجھ کو کر ڈالا

میں کہیں اور یہ سمجھوں ہو گا
رفتہ رفتہ کبھی جاؤں ہو گا

جو کہ ظاہر بھی ہے توقف اب
تابع حکم ہے یہ فدوی اب

نوکری میں دریغ سر سے نہیں
اس میں کب ہو سکے ہے عذر کہیں

پہ میں ممنون اور ہوں مشکور
دور ہوں دور بخت سے مجبور

[۲۳۶ب]

کر چکا عرض حال تو یہ تمام
خاتمہ ہے دعا پہ بعد سلام

حق تعالیٰ تجھے رکھے خورسند
اور خوش خوش رہیں تیرے دل بند

عمر سے جاہ اور مراتب سے
جتنی ہو جتنی تجھ کو ان سب سے

تیرے جمشید سے نگہباں ہوں
اور دارا سے تیرے درباں ہوں

تیرے خسرو سے ہوویں خدمت گار
اور طہمورث سے ہوں ایک جزدار

تیرا پابوس اک زمانہ ہو
سجدہ گہ تیرا آستانہ ہو

تجھ پہ امداد حق تعالیٰ ہو
یا علی تیرا بول بالا ہو

O

صدر فیض و منبع اکرام
حق تعالیٰ تجھے رکھے مادام

مطلع فیض و فخر اقبال　　　یاور اقبال تو بہ جاہ و جلال
بعد از بس نیاز و بس تسلیم　　　خوش رہیں آپ خوش بہ رب کریم
آپ شایان لطف و احساں ہیں　　　آپ قبلہ ہیں قبلۂ جاں ہیں
آپ کا فیض دائما جاری　　　ہوں عدو آپ کے سدا ناری
عالم فیضان ذر سے تیرے سدا　　　پرورش پاتے ہوں جو ہیں غربا
تیرے انعام اور تیرے اکرام　　　ہو کہ خلق خدا پہ ہوویں عام
میں نمک خوار آپ کا ہوں مدام　　　خیر خواہی سوا نہیں کچھ کام
تیرے ابرو کا جو اشارا ہوا　　　قفل امید اس سے کھلتا ہو
نوکری میری فضل یزداں سے　　　آپ کے لطف اور احساں سے

[۳۳۶ب]

ہو گئے زمرۂ طبیبوں میں　　　خوش ہوں اب تنگی سے حبیبوں میں
آپ کا کہنا کیا کچھ ایسا تھا　　　کہ دل میں خستہ یوں ہی رہ جاتا
بار احساں سے پشت خم ہوں میں　　　تیرا ممنون دم بہ دم ہوں میں
غم سے مجھ کو نجات آپ نے دی　　　جانتا ہوں حیات آپ نے دی
اطلاعاً مری گزارش ہے　　　کہ یہ بس آپ کی نوازش ہے
گر کرم آپ کا نہیں ہوتا　　　جانے بیکار کب تلک رہتا
خوب ہی دست گیری آپ نے کی　　　کیا ہی اللہ نے مری سن لی
جو کہ واجب تھا ، حق تھا ، عرض کیا　　　کام کیا مجھ کو اب دعا کے سوا
جب تلک آفتاب ہو روشن　　　ہو ترے فیض کا چمن گلشن

عرضی از خاص فدوئ سلطاں
پیش گاہ جناب میں ہے رواں

○

مضمون عرضی

مصدر خلق و منبع الطاف　　　قبلۂ عدل و کعبۂ انصاف
عالم و فاضل زمانہ توفی　　　کامل و عارف یگانہ تقی
حامی دین پاک مصطفوی　　　ناجی بوجب خفی و جلی
دین پاک محمدیؐ کی پناہ　　　شرع و اسلام احمدی کی پناہ

باد اقبال و جاہ تو دائم　　　سایۂ دولت آپ کا قائم
بعد گلدستہ سلام و نیاز　　　عرض فدوی کی ہے یہ بندہ نواز
آپ قانون دان شرع متیں　　　آپ سا دوسرا کہیں ہے نہیں
قدر داں آپ ہیں شریفوں کے　　　دست گیر آپ ہیں غریبوں کے
حامی حق محمدی داری　　　تجھ پہ انعام ایزد باری
مرجع خلق آستاں تیرا　　　ہے زمیں جوں آسمان تیرا
ہے ثنا خوان اک جہاں تیرا　　　شہرہ پہنچا کہاں کہاں تیرا
ہے تیرا اک جہان شیدائی　　　تو نے کیا دولت ہما پائی
.... کیا نام حاتم طائی　　　تجھ سے حاتم کی روح شرمائی
ان دنوں ہے جو بسکہ بے کاری　　　توڑے دیتی کمر ہے ناداری
نہیں بر جاتیں میرے ہوش و حواس　　　آنکھیں دکھلا رہا ہے بس افلاس
ہے مسیحائی آپ کے لب میں　　　دم کیا کچھ ہے میرے مطلب میں
سب بنانے میں کام ہوتا ہے　　　آپ کا اور نام ہوتا ہے
آپ کی ہے زبان میں تاثیر　　　آپ کے منھ ـــ نکال اکسیر
ایک اجر عظیم ہی لو گے　　　گر کسی جا پہ لب ہلا دو گے
خوش بھی ہووے گا ہی کریم و رحیم　　　اور ہووے گا ایک اجر عظیم
ہوتا بے شک لکھا ہے قسمت کا　　　آپ فرمائیں اور نہ ہووے کیا
یہ تو لطف ہی کار کر دیجیے　　　بہر روزگار کر دیجیے
عرض مطلب تو کر چکا ہوں تمام　　　خاتمہ ہے دعا پہ اور سلام

دولت و جاہ و عزت و اکرام
حق تعالیٰ کرے رہے مدام

○

نامۂ شوق

اے صنم مہوشِ نگار جہاں　　　اے گل تازۂ بہار جہاں
مصر الفت کی تو زلیخا ہے　　　قیس مجنوں کی تو ہی لیلا ہے
تیرا یہ حسن بے زوال رہے　　　جب تلک تو رہے کمال رہے
خیریت ہے یہاں تو خیریت　　　پر تیری خیریت کی ہے چاہت

تیری ہی خیریت کا خواہاں ہوں　　تیری ہی خیریت کا جویاں ہوں
تیری ہی خیریت مجھے مطلوب　　تیری ہی خیریت مجھے مرغوب
ہجر میں تیرے آہ وزاری ہے　　اشک آنکھوں سے ہے کہ جاری ہے

[۲۴۳الف]

روتے روتے گزرتے ہیں اوقات　　ایک ساون ہے ایک سی ہے رت
دن کے دکھ کیسے کیسے سہتے ہیں　　رات کا سونا کس کو کہتے ہیں
بجھی جاتی ہے غم سے اب چھاتی　　عید کو سوں نظر نہیں آتی
کام دن رات آہ وزاری سے　　عمر گزاری ہے ایک خواری سے
لکھنا پڑھنا بھی طاق پر رکھا　　تیرے ہی نام کا ہے ورد سدا
نام لے لے کے تیرا جیتا ہوں　　نام جینے کا ہے پہ مرتا ہوں
جو مجھے دیکھتا ہے کہتا ہے　　حال کچھ کیا تمھارا رہتا ہے
کوئی کہتا ہے مجھ کو اے سلطاں　　کیا ہوا تجھ کو تو کہاں ہے کہاں
کوئی کہتا ہے سن تو اے سلطاں　　ساری حکمت تیری گئی وہ کہاں
کچھ تو بولو اتی کہو کچھ تو　　اس کا ہووے علاج کچھ تو ہو
گر کسی نے کیا ہو کچھ تم کو　　اس کا فی الفور بھی تدارک ہو
گر کسی شے کی تم کو ہو درکار　　بے تکلف اسے کہیں سرکار
اس کے آنے میں دیر کیا ہوگی　　بس ابھی تو وہ حاضر آ ہوگی
اور گر طبع آگئی کہیں　　اس کا بھی کچھ مضائقہ تو نہیں
اس کی بھی راہ کچھ نکالیں گے　　دل کو تو آپ کے سنبھالیں گے
پر میں کہتا ہوں کچھ نہ سنتا ہوں　　منہ کو بس بیٹھا بیٹھا تکتا ہوں
کچھ کسی کے نہیں سخن کا جواب　　ایک آفت میں ہے ہر اک احباب
ہجر نے تیرے یہ کیے سب کام　　آگے اب دیکھیے ہو کیا انجام

[۲۴۳ب]

الفرق ! الفراق ! لب پر ہے　　جان پر آبنی ہے اب ہے ہے
جب بہت یاد تیری آتی ہے　　بے قراری زبس ستاتی ہے
بے قراری میں شعر پڑھتا ہوں　　بسر اوقات ایسے کرتا ہوں

شعر

کوئی آفت ہے یا بلا ہے فراق　　نہیں معلوم یہ کہ کیا ہے فراق

تجھے وصل صنم سے ہوگی سزا　　　سر مگر ہاں ترا پھرا ہے فراق
آخر اک روز مار رکھے گا　　　رور سلطاں کہیں بھلا ہے فراق

شوق ہے تیرا گر لکھے جاؤں
فرصت اک دم نہ عمر بھر پاؤں

اور پوری نہ ہو کسی صورت　　　شرح کو اس میں لاکھ ہو حکمت
حرف مطلب پہ اب میں آتا ہوں　　　حال کچھ کچھ تمھیں سناتا ہوں
نامۂ شوق جب ترا آیا　　　عالم اک روح کا سا دکھلایا
جان اک جسم زار میں آئی　　　اک سلیماں کی سی مہر پائی
اس کو ہاتھوں میں لے کے چوم لیا　　　اس کو آنکھوں سے پھر لگاے گا
تاب پڑھنے کی اس کے تھی کس کو　　　آتے ہی کھو دیا تھا مجھ کو تو
پڑھ سکا اک اور ہمدم نے　　　بس تھی ا ہے تپش کر دل غم
منھ پہ اڑنے لگی ہوائی سی　　　موت آئی نظر میں آئی سی
غش پہ غش پھر تو ایک طاری تھا　　　موت کا ساپیتا جاری تھا
آگئی تیرگی اک آنکھوں میں　　　چھا گئی تیرگی اک آنکھوں میں
کوئی دوڑا ہوا کو جاتا تھا　　　عطر لا کر کوئی سنگھاتا تھا

[۲۲۸الف]

صرف یک شیشۂ گلاب ہوا　　　جب ذرا کچھ تو ہوش میں آیا
بعد عرصہ کے جب ہوئی تسکیں　　　عقل واقف یہ ہوئی آکے قریں
دیکھ تو خط کو کچھ لکھا تو نہیں　　　ہو کسی تحفہ کی طلب نہ کہیں
ہاں تو غفلت ہی ہوی غفلت میں　　　فرق آجاے ساری حکمت میں
دل میں کچھ اور ہی نہ واں ٹل جائے　　　باب شکوہ کا ہو نہ پھر کھل جاے
بس اسی وقت خط کو پھر جو پڑھا　　　حال سب کھل گیا ، چھپا نہ رہا
پہلی صدوبخ اشرفی اس دم　　　کی رواں ہندوی کو کر کے قلم
اور قریب آئے روز عید سعید　　　جلد لکھیے گا آپ اس کی رسید
تا کہ کچھ خرچ اور بھیجا جائے　　　کام میں ہو تو وقت پہ آجاے
اور سب چیز عید کی اوپر　　　حاضر آتا ہے معتمد لے کر
کیوں کہ جو ہے وہ معتمد میرا　　　ہے وہ بیمار کیا قصور اس کا
ورنہ آنے میں دیر ہوتی کیا　　　آج ہی وہ روانہ ہو جاتا

ایک دو دن کی دیر تو ہے ضرور　　　عفو ہووے مرا اور اس کا قصور
ہو نہ خط کے جواب میں تاخیر　　　تا نہ گھبرائے یہ دل دل گیر
مجھ کو ویسے نہ ہو سمجھو گی　　　خیریت تو ضرور لکھو گی

نامۂ شوق ہو چکا ہے تمام
تیری ہم جولیوں کو تجھ کو سلام

[۲۳۸ب]

Abstract

Mathnawi Nama-e- Shauq is written by Hakeem Sultan Rampuri, a pupil of a distinguished court poet Dhauq Dehlawi. His collection of poetry was complied in 1868/1285 and a rare copy of its manuscript is preserved in Muzammil Collection in Maulana Azad Library, AligarhMuslim University. The present writer has edited this Mathnawi, Nama-e- Shauq which covers some 9 pages of the Diwan of this poet Sultan Rampuri.

It is a love poem addressed to the beloved in the form of a letter. The present writer is obliged by Nawab Rehmatullah Khan Sherwani (Aligarh) care taker of the Collection, who allowed him to consult Diwan and edit this Mathnawi.

معیار۔ علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، جلد ۸، شمارہ ۱، جنوری-جون

علامہ اقبال کے ایک مکتوب اور مکتوب الیہ کی دریافت

خالد محمود سنجرانی*

مشاہیر کے مکاتیب اور ذاتی کاغذات ان کے اسلوبِ حیات اور طرزِ فکر کی تفہیم میں اس حد تک اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی تلاش، تدوین، اشاعت اور ان کے ذریعے نتائج کے اخذ کرنے کا عمل ان کی زندگی ہی میں شروع ہو جاتا ہے۔ مکاتیبِ غالب اور دیگر اکابر کے مکاتیب اس کی روشن مثال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کی پہلی نظر مشاہیر کے مکاتیب اور دستاویزات کی تلاش کے لیے ہی اٹھتی ہے اور اس پہلو پر دیا گیا زور اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ایک آدھ دہائی میں ہی یہ عمل مکمل ہونے کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد ان کے خطوط کی تلاش اور انھیں ترتیب دینے کا عمل بڑی عرق ریزی کے ساتھ شروع ہوا۔ چوں کہ ان کے مکاتیب کا بڑا ذخیرہ جنوبی ایشیا میں موجود تھا اور ان کے مکتوب الیہان کو بھی ان کی تاریخی اہمیت کا احساس تھا، اس لیے نہ صرف وہ محفوظ رہ گئے بلکہ ان تک رسائی حاصل کرنا بھی زیادہ دشوار نہ ہوا۔ جنوبی ایشیا کے علاوہ یورپ میں بھی علامہ اقبال کے مکاتیب کی دریافت بتدریج ہوتی رہی لیکن اتفاق سے علامہ اقبال کے کچھ ایسے یورپی احباب اس عمل سے بے نیاز رہے جو اقبال سے وابستہ جڑے ہوئے تھے اور نہ ہی جنوبی ایشیا کی علمی و ادبی فضا ان سے زیادہ شناسا تھی۔ اس نوع کی دو مثالیں اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں۔ اول بیرن فان ویلتھائیم ہانس ہاسو (Baron von Veltheim Hans-Hasso) جب کہ دوسری شخصیت پروفیسر گلاسیناپ (Prof Glasenapp) کی ہے۔ مجھے قدرے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ پروفیسر گلاسیناپ کے تمام ذاتی کاغذات، لائبریری اور دیگر دستاویزات جنگ کے زمانے میں تلف ہو گئی تھیں جب کہ وہ نہ صرف اقبال کے اہم معاصر، مترجم اور ان کے ملنے والوں میں سے تھے بلکہ جرمنی میں ہندیات کے بہت بڑے ماہر اور نقاد بھی تھے کہ جنھیں آج بھی جرمنی میں بہت عزت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ میں نے جرمنی کے ہر اہم آرکائیو کے ساتھ ساتھ پروفیسر گلاسیناپ فاؤنڈیشن سے بھی رابطہ کیا جس کا مقصد ان کے کاغذات میں سے اقبال کے خطوط کی تلاش کرنا تھا لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ پروفیسر گلاسیناپ کے کاغذات تلف ہو جانے کے سبب دستیاب نہیں۔ ان کاغذات کے تلف ہو جانے کے ساتھ ہی ان میں اقبال کے مکاتیب وغیرہ کی موجودگی کا امکان بھی ختم ہو گیا۔

جرمنی میں اقبال کے ایک اور دوست کی مثال بیرن فان ویلتھائیم ہانس ہاسو کی ہے جو جاگیر دار ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد شخصیت کے مالک بھی تھے۔ ان کی ہدایت پر ان کی جاگیر کا انتظام سنبھالنے والے دفتر نے ان کے محل میں موجود لائبریری میں ان کے اور ان کے احباب کے خطوط اور کاغذات کو بڑے سلیقے کے ساتھ محفوظ کیا ہوا تھا، جو ان کی وفات کے بعد برلن کے قدرے قریب واقع ہالے یونیورسٹی کے کتب خانے اور ہالے (Halle Salle) سے لگ بھگ ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے قصبے ویسر

* پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ، یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ، جرمنی؛ استاد شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

گروڈے (Wernigerode) کی لنڈس آرکائیو میں منتقل کر دیے گئے تھے، جو آج کل وہیں موجود ہیں۔ لنڈس آرکائیو میں موجود فس باسو کے کاغذات میں LHASA,MD,Rep H Ostrau II, Nr 1104 کے تحت سر محمد اقبال کے نام سے ایک فائل موجود ہے۔ اس فائل میں علامہ اقبال کا ایک انگریزی خط بنام فس باسو جوابی مکتوب کے ساتھ موجود ہے۔ ان دونوں خطوط کی نقول میں اصل متن کے پیچھے ٹائپ کی ہوئی عبارت لی ہے جسے متن کا حصہ سمجھا جائے۔ علامہ اقبال کا خط انگریزی زبان میں جب کہ فس باسو کا جوابی خط جرمن زبان میں ہے کہ جس کے اردو ترجمے کے لیے راقم اپنے دوست بلیک واٹکنس (Blake Watkins) کی معاونت اور اپنی نگران ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹرہیلڈ کی اعانت کا بے حد ممنون ہے۔ اس مقالے میں فس باسو کے خط کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دونوں مکاتیب کے وضاحت طلب مقامات پر حواشی درج کیے گئے ہیں اور حواشی کے ماخذات کی نشان دہی ان کے آخر میں قوسین میں کر دی گئی ہے جب کہ ماخذات کی تفصیل کتابیات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق علامہ اقبال کا یہ خط نہ صرف غیر مطبوعہ ہے بلکہ اس کے جوابی مکتوب سے علامہ اقبال کے ایک نئے مکتوب الیہ کا علم ہوتا ہے۔

ذیل میں علامہ اقبال کے لکھے ہوئے خط کا عکس دیا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حواشی کے نمبر درج کرنے کی غرض سے اس کو ٹائپ بھی کیا گیا ہے۔ ٹائپ کرنے کے مسائل کے سبب اردو عبارت میں حواشی کے نمبر ہیت کی علامت جب کہ انگریزی متن میں قوسین کی علامت کے ساتھ دیے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے خط میں سبقتِ قلم کی وجہ سے ایک آدھ لفظ چھوٹ گیا تھا جس کو قیاس کی بنا پر متن کے ساتھ قوسین میں درج کیا گیا ہے۔ ٹائپ شدہ خط کی ہر لائن میں موجود الفاظ کی تعداد علامہ اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اصل خط کے مطابق ہے۔ ذیل میں پہلے اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے خط کو پیش کیا جا رہا ہے۔

Lahore

30th June 1936

My dear Baron (2)

Thank you so much for your beautiful P C (3) which reached (received in the) last mail. It will be a great honor to stay in your castle (4) & I shall, at least I hope to, avail myself of your hospitality (5) when I come to Germany which I have always regarded as the Fatherland (6) of my spirit. Do remember me to Prof. Hassenaps (7) if he is still in your castle. I am looking forward to meeting him. But I fear it is not yet settled when I shall be able to leave (8) India. It may be next year (9). This year it does not seem to be possible as I have not been able to make proper arrangments (10) for my children (11) who lost their mother (12) last year. I am trying to get hold of a good governess (13). As soon as I find one (14) I shall make praparations to visit Germany once more (15)

Deutschland Über Alles (16)

Yours sincerely

Muhammad Iqbal

اب ذیل میں اقبال کے اس خط کے جواب میں فن ہاسو کا جرمن مکتوب اور اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء

عظیم المرتبت شاعر اور میرے عزیز دوست!

لاہور سے ۳۰ جون کو لکھا ہوا آپ کا بہت ہی پیارا خط ملا، جس سے مجھے ناقابل بیان خوشی ہوئی ہے لیکن میں یہ پڑھ کر اداس بھی ہو رہا ہوں کہ آپ اس سال یورپ، جرمنی اور آسٹریا تشریف نہیں لا سکتے۔ میں نے آپ کی نیک خواہشات ہم دونوں کے مشترکہ دوست پروفیسر فان گلاسیناپ (Prof. von Glasenapp) تک فوراً پہنچا دی تھیں، جس کی ایک کاربن کاپی[۱۷] اس خط کے ساتھ آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

مجھے لندن میں ورلڈ کانگریس آف فیتھ "[۱۸] کے موقع پر آپ سے ملنے کی بڑی امید تھی۔ اس کانفرنس میں آپ کے ملک سے اور لاہور سے بھی کئی اہم شخصیات نے شرکت کی اور عمدہ تقریریں کیں۔

میں اس امید کے ساتھ آپ کو آسٹریا کے بارے میں ایک معلوماتی کتابچہ[۱۹] ارسال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ کتابچہ آسٹریا کے بارے میں نہ صرف آپ کو معلومات فراہم کرے گا بلکہ آپ کے اس متوقع سفر کے عزم میں تقویت بھی پیدا کرے گا۔

براہ کرم آپ ہمارے مشترکہ احباب مسٹر وسواگر[۲۰] سر اور لیڈی دلیپ سنگھ[۲۱] کو میرا اسلام کہیے۔ پیر و مرشد جیسا کہ آپ نے گزشتہ خط کا اختتام Deutschland uber alles کے کلمات سے کیا تھا، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کے جواب میں آپ ہی کے خوبصورت اشعار درج کرتے ہوئے اس خط کا اختتام کروں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
اقبالؔ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا[۲۲]

گرچہ آپ اپنے گلے کے علاج[۲۳] کے لیے یورپ تشریف نہ لا سکے[۲۴] لیکن مجھے امید ہے کہ اب آپ کی آواز بہت حد تک بہتر ہو گی۔

دل کی گہرائیوں سے سلام[۲۵]
آپ کا اور آپ کے کلام کا مداح
(دستخط، ہنس ہاسو بیرن فان ویلتھائیم)

حواشی

۔ لندن آرکائیو، 2 مئی سے موصول شدہ، علامہ اقبال کے خط پر کچھ نمبر اور مہروں کے نشانات وغیرہ موجود ہیں کہ جس کی وضاحت ضروری ہے۔ خط کے اوپری بائیں سمت میں قلم سے 14B کا ہندسہ درج ہے۔ یہ ہندسہ اصل

خط کے صفحے پر بھی موجود ہے کہ جسے فس باسو کی جاگیر کا انتظام سنبھالنے والے دفتر کی جانب سے موصول ہونے کی عرص سے درج کیا گیا ہو گا۔خط کی اوپری دائیں سمت میں ایک مہر کا نشان موجود ہے اس کا متن ہے Dr H H v V Rentamt 22 Jul 36 Ostrau 22 7 -- یہاں Dr H H v V سے مراد ڈاکٹر فس باسو فان واتھائیم ہیں جب کہ Rentamt سے مراد جاگیر کا انتظام کرنے والا دفتر ہے۔فس باسو اپنے کاغذات کو بڑے سلیقے سے رکھتے تھے اور ہر خط اور دستاویز پر مہر لگا کر اس کے موصول ہونے کی تاریخ بھی درج کیا کرتے تھے،اس لیے 36 Jul 22 سے خط کے موصول ہونے کی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔اس مہر کا نشان اصل خط پر بھی موجود ہے۔خط کے متن کے پیچھے دھندلی سی ایک مہر کا نشان بھی ہے کہ جو اصل خط میں موجود نہیں ،یہ صرف موصول ہونے والی عکسی نقل میں دکھائی دیتا ہے۔اس مہر کی عبارت یہ ہے Kop e Landeshauptarchiv Sachsen-Anhalt (Nur zum e gen Gebrauch fur Dr Khalid Sanjarani,Weitergabe nur mit Genehrigunh des Landeshhauptrchivs) جس کے معانی یہ ہیں کہ یہ خط صرف راقم (میرا نام) کے لیے ہے اور اس خط کو آپ ہماری اجازت کے بغیر کسی اور کو نہیں دے سکتے،علاوہ ریں آرکائیو کا نام اس میں شامل ہے۔

خط کے آخر میں حاشیے کی صورت میں t ernachwe s LHASA,MD,Rep H Ostrau II, Nr 1104 دراصل آرکائیو کا حوالہ نمبر ہے جو اصل خط پر درج نہیں ہے۔

۴۔ بیرن (Baron) قدیم فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جو پرانی جرمن اور اطالوی کے لفظ بیرو (Baro) سے ماخوذ ہے،جس کے معانی جنگجو اور آزاد انسان کے ہیں۔بیرن جرمنی کے اشرافیہ کا کم تر خطاب ہے۔ریپبلکن جرمنی سے قبل یہ خطاب خاندانوں کے شرف و وقار کی علامت تھا۔۱۱ اگست ۱۹۱۹ء میں ویمر کی قانونی اصلاحات کی رو سے جرمنی کے تمام شہری قانون کی نظر میں یکساں قرار دیے گئے اور خطابات یافتہ خاندانوں کو حاصل شدہ قانونی مراعات اور سماجی منزلت کا خاتمہ کر دیا گیا۔اس بے ۱۹۱۹ء کے بعد اپنے نام کے ساتھ خاندانی خطاب لکھنے کا رواج بھی ختم ہو گیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس سے شاید آگاہ نہ تھے اور اگر تھے بھی تو انھوں نے اس امر کا خیال رکھنا ضروری نہ سمجھا۔ہم نے مکتوب الیہ کے بہت سے ذاتی اور سرکاری کاغذات دیکھے ہیں،وہ خود کسی بھی جگہ اپنے آپ کو بیرن نہیں لکھتے تھے۔

قبال کے مکتوب الیہ کا مکمل نام فس باسو فان واتھائیم ہے۔ جنوبی ایشیا میں انھیں بیرن فان واتھائیم بس باسو بھی لکھا گیا ہے (Civil and Militray Gazette,22 April,1938) فس باسو جرمنی کے شہر ظلوں میں ۵ نومبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ہالے یونیورسٹی،جرمنی کی لائبریری میں موجود ان کی تعلیمی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۵ مئی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک میونخ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔علامہ اقبال میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے جولائی کے تیسرے ہفتے جرمنی پہنچ گئے تھے۔اگرچہ ان کا قیام ہائیڈل برگ میں رہا لیکن میونخ سے بھی ان کا رابطہ برقرار تھا۔قرائن بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال اور فس باسو کے مابین اولین ملاقات میونخ یونیورسٹی ہی میں ہوئی ہوگی۔فس باسو کا شعبۂ

جہاں فلسفے خصوصاً ہندومت، بدھ مت اور جنوبی ایشیا کے تہذیبی علوم کی طرف مائل رہا تھا جس کی تصدیق اس کی تعلیمی دستاویزات سے ہوتی ہے۔ علامہ اقبال اور ہنس ہاسو کا مشترکہ موضوع تھا۔ دونوں ایک ہی تعلیمی ادارے میں موجود تھے۔ اس سے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اقبال اور ہنس ہاسو کے مابین جو روابط آگے چل کر مستحکم ہوئے، ان کی بنیاد یہیں میں پڑی تھی۔

ہنس ہاسو کے تعلیمی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۲۱ جون ۱۹۱۲ء کو میونخ یونیورسٹی سے آرٹ ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی (LHASA, MD,Rep H Ostrau II, Nr 27) آرٹ ہسٹری اس کا بنیادی مضمون تھا، ثانوی مضامین میں انھوں نے تاریخ اور انگریزی زبان و ادب کا مضمون منتخب کیا تھا۔ میونخ یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ۵ مئی ۱۹۰۷ء کو ہوا تھا۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک انھوں نے یونانی تاریخ، جرمن تاریخ، نگلدان پر مصوری کا فن، اطالوی، ہالینڈ اور انیسویں صدی میں مصوری کی تاریخ، بدھ مت مصوری کی روشنی میں، ایرانی مصوری کی تاریخ، مائیکل اینجلو سے شاہ قاچاریہ میں، وغیرہ، روم، جرمنی، برالس اور فلورنس کا آرٹ، انیسویں صدی کی تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ جنگ نوسٹاک، مارکیٹ کا کورس بھی پڑھا تھا مزید تفصیل کے لئے دیکھیے (Hans Hasso von Veltheim-Eine Biographer by Karl Klaus P 35-38)۔ ان کے مضامین کے انتخاب کے علاوہ ان کا فکری جھکاؤ انھیں بہت جلد علامہ اقبال کے قریب لے آیا ہوگا۔

۱۹۰۷ء کے بعد علامہ اقبال تو دوبارہ جرمنی نہ جا سکے لیکن ہنس ہاسو نے جنوبی ایشیا کی سیاحت کے دوران علامہ اقبال سے ان کی رہائش گاہ پر دو ملاقاتیں کی تھیں جن میں سے آخری ملاقات خاصی اہم ہے اور اس ملاقات کا احوال ہنس ہاسو نے اپنی ڈائری میں بھی درج کیا تھا۔ ان کی ڈائری تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے جب کہ اصل مسودہ ہالے یونیورسٹی، جرمنی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس اصل مسودے میں سے اقبال سے ملاقات والے حصے کی نقل راقم کے پاس موجود ہے۔ ہنس ہاسو کے حالات زندگی کی مزید تفصیل حواشی میں درج کرنا ممکن نہیں کہ یہ مقالہ زیادہ طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اس انگریزی مخفف سے مراد پوسٹ کارڈ ہے جس کی وضاحت ہنس ہاسو کی مطبوعہ ڈائری سے ہوتی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔ "انھوں (اقبال) نے کمال محبت سے میرے ہر سال کردہ اس کارڈ کا شکریہ ادا کیا جو میں نے جنوری میں ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر بھیجا تھا۔" (Tagebuchar aur Asien,Vol.1,P 138) معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۷۶ء کے حساب ۱۹۳۶ء کو اقبال کی ساٹھویں سالگرہ متصور کیا جو کہ غلط ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کی رہائش گاہ کے باہر جو یادگاری تختی ستمبر ۱۹۶۶ء کو نصب کی گئی تھی، اس میں بھی اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء کندہ تھا جس کی بعد میں اصلاح کی گئی تھی۔ موجودہ یادگار پر ۱۸۷۷ء ہی کی تاریخ درج ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدتوں تک قبل کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء ہی سمجھا جاتا رہا اور اسی برس کی مناسبت سے ہنس ہاسو نے انھیں ۱۹۳۶ء میں ساٹھویں سالگرہ کا کارڈ بھیجا تھا۔

پوسٹ کارڈ ملنے پر اقبال کا تشکر بہ ظاہر معمولی واقعہ ہے لیکن اسی نوع کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے شخصیت کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ ۳۰ اپریل ۱۹۳۷ء کی شام کو جب ہنس ہاسو اقبال سے ملنے کے لیے جاوید منزل گئے تو وہ اقبال کی زندگی کا آخری سال تھا۔ مسلسل علالت میں رہنے کے باعث اگرچہ وہ اس وقت شدید تکلیف کے عالم میں تھے لیکن اس عالم میں بھی انھیں وہ پوسٹ

کارڈ نہ صرف سنبھال رکھا تھا بلکہ انھوں نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔

۴۔ یہ محل جو آسٹراؤ محل کے نام سے جانا جاتا ہے جرمنی کے شہر ہالے کی شمالی سمت میں چند کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے آسٹراؤ میں موجود ہے۔ یہ محل اور قصبہ فنس ہاسو کو موروثی جاگیر میں ملا تھا۔ فنس ہاسو کے اجداد سلواکیہ سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ۱۵۸۸ء میں اس خاندان نے اپنی حیثیت کو مستحکم کرتے ہوئے موجودہ محل کی جگہ اور اس کے اطراف کی زمینوں کو خرید لیا تھا۔ اس محل کی تعمیر ۱۷۱۳ء میں فنس ہاسو کے اجداد میں سے ایک بزرگ اوٹو لیوڈوگ (Otto Ludwig) کے ہاتھوں ہوئی۔ انھوں نے فرانسیسی ماہر تعمیرات سے اس کا نقشہ بنوایا جس میں محل کے چاروں طرف ایک گہری نہر دفاعی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس محل کا مالک نہ صرف اطراف کی زمینوں بلکہ ان پر بسنے والے خاندانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا تھا اور اسے اپنے علاقے میں بے حد احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آسٹراؤ محل کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے (Schloss Ostrau bei Halle-Saale von Bruno Goetz,Halle,Otto Hendel-Druckerei,N.D,P 1-53) راقم کو ۲۶ مارچ ۲۰۰۹ء کو علامہ اقبال اور فنس ہاسو کے مابین روابط کی تحقیق کی غرض سے جرمنی کے کچھ دانشوروں کی معیت میں اس محل میں جانے کا موقع ملا تھا۔ آج کل یہ محل ایک فلاحی تنظیم کی نگرانی میں ہے۔ یہی وجہ ہے اس محل کے ایک حصے کو بچوں کے سکول لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس تنظیم کے چیئرمین نے راقم کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ فنس ہاسو کی زندگی میں یہ محل ادبی اور فکری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ محل مشرق و مغرب کا حسین امتزاج پیش کرے اور وہ اپنی زندگی میں اس حوالے سے خاصے کامیاب بھی ہوئے۔ چیئرمین نے مہمانوں کے تاثرات پر مبنی پرانی کتاب راقم کو دکھائی جس میں مشرقی مہمانوں کی خاصی بڑی تعداد کے تاثرات موجود تھے۔ فنس ہاسو کے دور میں مشرق سے آنے والے لوگ سیاست، فلسفہ، سائنس اور شعر و ادب کی دنیا سے متعلق تھے۔ انھوں نے اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ اقبال کو اپنے محل میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ اس محل کے قریب واقع واتھائیم خاندان کے گرجا گھر سے متصل ایک کمرے میں علامہ اقبال کی ایک تصویر بھی آویزاں ہے۔

۵۔ فنس ہاسو مشرق و مغرب کے مفکرین بالخصوص فنون لطیفہ سے وابستہ افراد کے میزبان کے طور پر مشہور تھے۔ ان کی ایک ہم عصر اس بارے میں بتاتی ہیں ”وہاں جانے کے بعد میزبان کے خلوص اور محبت کا تاثر اتنا گہرا ہوتا تھا جو کبھی محسوس ہوتا تھا اور یہ تاثر ایک ایسے شخص کا تھا جو دنیا میں کمیاب ہو۔ وہ اپنے مہمانوں کی عزت نفس، ذوق جمال، زندگی بسر کرنے کی ظاہری ہیئت کا خیال کرتے ہوئے خود کو اس کے مطابق ڈھال لیتا تھا۔ انھیں اپنے نوادرات کو دوسروں کے سامنے متعارف کرنے کا ذوق حاصل تھا۔ فنس ہاسو کچھ اس طور سے سمجھاتے کہ وہ ماضی کا ثبوت ہوتے ہوئے زندہ سانس کا وجود اختیار کر لیتے تھے۔“ (Hans-Hasso von Veltheim by Rolf Italiaander,P 12) وہ اپنے محل میں مشرق و مغرب کے مفکرین کو مدعو کرتے رہتے تھے اور ان کے محل اور اس کے اطراف میں مہمانوں کی "تعمیر" کا نیا سے عمدہ انتظام تھا کہ جس سے بچے ہوئے نقش آج بھی اس محل کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ محل میں موجود مہمانوں کے تاثرات پر مبنی کتاب سے اور مشرق سے میزبان کے حسن سلوک اور محل کی فکری فضا کا اندازہ ہوتا ہے۔ محل کے اطراف میں کئی خوب صورت روشیں ہیں جن کو کسی فلسفی کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔ محل کے چاروں طرف بہتی ہوئی نہر کا پل پار کرتے ہی جو پہلی روش آتی ہے،

Geote Weg کا نام دیا گیا ہے۔ روش کے آغاز میں ایک خوب صورت پتھر پر گوئٹے کا نام کندہ ہے۔ یہ ... مہر روش کے لئے ہے۔ علاوہ ازیں یہ قصبہ ہاسو کی زندگی میں ان کے اندر خوابوں اور خیالات کا ذخیرہ موجود تھا جو وہاں آنے والوں کے لئے بہت کشش کا باعث تھا۔

۶۔ اس خط میں اقبال نے جرمنی کو ''روحانی طور پر اپنی آبائی سرزمین'' قرار دیا ہے۔ آپ ۳ جون ۱۹۰۸ء کو ایما ویگے ناسٹ کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''۔۔۔ میرا جسم یہاں ہے، میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔'' (۔۔حوالہ۔۔، ص ۱۵۲) اقبال پر جرمنی کے اثرات کا مطالعہ اقبالیات کا ایک اہم اور وسیع موضوع ہے کہ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ایما ویگے ناسٹ اور قصبہ ہاسو کو لکھے جانے والے مکاتیب کے درمیان ۳۰ برس کا فاصلہ ہے لیکن ان دونوں خطوط میں جذبے کی شدت یکساں ہے۔ اقبال اور جرمنی کے حوالے سے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے Iqbal and Europa ed. J.C Burgel, Bern, Peter Lang 1980 and Muhammad Iqbal and Three Realms of the Spirit ,Hamburg1978

۷۔ پروفیسر گلاسیناپ (Prof Glassenaps) کا پورا نام ہلمتھ فان گلاسیناپ (Prof Helmuth von Glassenaps) ہے۔ ان کا شمار جرمنی کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔ آپ ہندیات میں تخصیص رکھتے تھے اور اس موضوع پر کئی اہم کتب کے مصنف ہیں۔ اس حوالے سے جرمنی میں ان کا کام بے حد معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے نام سے ایک فاؤنڈیشن بھی کام کر رہی ہے۔ پروفیسر گلاسیناپ ۲۳ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پروفیسر بانکی رائے کی وساطت سے علامہ اقبال سے ان کی رہائش گاہ پر ملے تھے۔ اس ملاقات کا احوال ان کی خودنوشت سوانح عمری Meine Lebensreise کے صفحہ نمبر ۱۳۴ پر موجود ہے۔ اس سوانح عمری سے پتا چلتا ہے کہ آپ اپنے والد اور امراؤ سنگھ کی وساطت سے علامہ اقبال کی شاعری اور متن انگریزی سے روشناس ہوئے تھے۔ انھوں نے اوائل عمری ہی میں اقبال کی نظم ''ایک شام'' کو جرمن زبان میں ڈھالا تھا۔ اردو اور ہندی شاعری سے ان کا یہ شغف آگے چل کر ''چار ہزار سالوں کی ہندوستانی نظمیں'' کی صورت میں سامنے آیا کہ جس میں انھوں نے ویدوں سے لے کر معاصر ہندوستانی ادب تک کا انتخاب شائع کیا تھا۔ ان کی اس سوانح عمری سے معلوم ہوتا ہے آپ ۱۹۵۱ء میں جب کراچی تشریف لائے تھے تو اقبال کی یاد میں منعقدہ ایک تقریب میں اقبال کی چند نظموں کا جرمن ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا اور اقبال سے اپنی ملاقات کے لمحات سے جڑی ہوئی یادوں کو تازہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل کے لئے دیکھیے (Meine Lebensreise, Wiesbaden, F A Broekhaus, 1964)۔

۸۔ علامہ اقبال نے ایما ویگے ناسٹ کو جو خطوط تحریر کیے تھے، ان میں جرمنی جانے کی امنگ ماہرین اقبال سے پوشیدہ نہیں۔ اس خط میں بھی یہی امنگ ایک اور ڈھب سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

۹۔ ۱۹۲۷ء تک علامہ اقبال کے ہاں اپنی روز افزوں علالت کی وجہ سے اپنی ذات پر (بیرون ملک سفر کے لئے) رقم خرچ کرنے کے حوالے سے ایک خاص رویہ جنم لے چکا تھا اور وہ اسے اپنے بچوں کی حق تلفی سمجھنے لگے تھے۔ اسی رویے، اپنی علالت اور مصروفیت کے سبب آپ خواہش کے باوجود جرمنی نہ جا سکے۔

۱۰۔ سردار بیگم کی وفات (۲۳ مئی ۱۹۳۵ء) سے لے کر لگ بھگ مئی، جون ۱۹۳۷ء تک علامہ اقبال اپنے کم سن بچوں، جاوید اقبال اور

منیرہ کی نگہداشت کے لیے مستقل بندوبست نہ کر سکے تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے اخبارات میں مسلمان گورنس کے لئے اشتہارات دیئے، احباب کو خطوط لکھے۔ یہ عرصہ ان کے لئے خاصی پریشانی کا عرصہ رہا جس میں ان کے لیے بچوں کو چھوڑ کر کہیں جانا ممکن نہ تھا۔ اگر لاہور سے کہیں باہر جانا ہوتا تو جاوید کو ساتھ لے کر جاتے۔ خود جاوید اقبال کا بیان ہے کہ اس عرصے میں نصیب بی طرف سے ہر دو کی رشتہ دار خواجہ عبدالغنی ہی تھے جو ہمارے ساتھ رہ سکتے تھے لیکن وہ کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے باہر رہتے تھے۔ اقبال کے خاندان میں سے خواتین کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر لاہور آ جانا اور ان بچوں کے ساتھ رہنا آسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مخصوص مدت کے لیے آ جاتا تھا۔ جاوید اقبال کے مطابق شیخ عطا محمد اور ان کی اہلیہ کے علاوہ اقبال کی چھوٹی بہنوں کریم بی بی یا زینب بی بی میں سے کوئی ایک رہ لیا کرتا تھا۔ شیخ عطا محمد کے بیٹے اعجاز احمد اور ان کی اہلیہ بھی کچھ دنوں کے لیے بچوں کے پاس آ کر رہیں۔ تاہم یہ سارے بندوبست عارضی تھے اور اسی وجہ سے جاوید اور منیرہ کسی سے مانوس نہ ہو پاتے تھے۔ (زندہ رود، ص ۶۰۹)

۱۔ بچوں سے مراد جاوید اقبال اور منیرہ اقبال ہیں کہ جنھیں علامہ اقبال پیار سے "با" اور "بی" کہتے تھے۔ دونوں بچے اپنی والدہ سردار بیگم کے انتقال کے وقت کم سن تھے۔ والدہ کی وفات پر دونوں بچوں کا ردِعمل خاموش لیکن ازحد گہرا تھا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (زندہ رود، ص ۶۰۸)

۲۔ اس سے مراد جاوید اقبال اور منیرہ کی والدہ سردار بیگم ہیں جن کی وفات مئی ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ انھوں نے علامہ اقبال کے ساتھ کم وبیش ۱۴ برس کا عرصہ گزارا۔ ان کی وفات نے اس گھرانے کے افراد پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھیے (زندہ رود از جاوید اقبال، ص ۴۷) آپ لاہور کے موچی دروازے کے متوسط کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ علامہ اقبال سے ان کا نکاح ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا لیکن رخصتی عمل میں نہ آئی تھی۔ چند گمنام خطوط کے باعث رخصتی کا معاملہ مزید التوا کا شکار ہو گیا۔ سردار بیگم کے اقبال کے نام خط، اقبال کے والد کے استفسار، مرزا جلال الدین اور اقبال کے چند دیگر چند دوستوں کی تحقیق کی روشنی میں علامہ اقبال نے مختار بیگم کی مشاورت اور رضامندی سے سردار بیگم سے اگست یا ستمبر ۱۹۱۳ء میں دوبارہ نکاح کیا۔ گر دیکھا جائے تو سردار بیگم ہی نے اقبال کے ساتھ اپنی ساری زندگی شریکِ حیات کے طور پر بسر کی۔ سردار بیگم کے اقبال سے نکاح اور رخصتی میں تاخیر کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے (روایاتِ اقبال از عبداللہ چغتائی، ص ۱۲۸، ۱۲۹۔ ذکرِ اقبال، عبدالمجید سالک، ص ۶۷، ۶۸۔ زندہ رود از جاوید اقبال ص ۲۰۲، ۲۰۳)

۳۔ اس عہد میں گورنس کے لئے اخبارات میں دیے جانے والے اشتہارات اور احباب کے نام اقبال کے کاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کسی مسلمان گورنس کی تلاش میں تھے جو اسلامی معاشرت سے واقف ہو، اردو زبان پر قدرت رکھتی ہو، انتظامِ خانہ داری اور تربیتِ اطفال میں سلیقہ مند اور اچھی انتظامی صلاحیتوں کی مالک ہو۔ گورنس کے انتظام میں تین دو برس کا عرصہ لگا۔ (ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک، ص ۲۱۲)

۴۔ ۱۹۳۷ء میں رشید احمد صدیقی کی وساطت سے اقبال نے اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک جرمن خاتون مسز ڈورس کی خدمات حاصل کیں۔ اس بارے میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں "۱۹۳۷ء میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن ہمشیرہ جو جرمن خاتون ہونے کے باوجود اسلامی معاشرت سے بھی واقف تھی اور اردو بھی بول لیتی تھی، جاوید اور منیرہ کی گورنس مقرر ہو گئی

اس وقت جاوید کی عمر تقریباً تیرہ سال اور منیرہ کی تقریباً سات سال ہوگی۔ یہ خاتون علامہ کے انتظام خانہ داری اور تربیتِ اطفال میں بے حد خوش سلیقہ اور منتظم ثابت ہوئیں" (ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک، ص ۲۱۲) جاوید اقبال نے مسز ڈورس کی آمد کے بعد گھر میں پیدا ہونے والی خوش گوار تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "مسز ڈورس احمد کے گھر میں آنے سے جاوید منزل کے سب مکینوں کی گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔۔۔ راقم اور منیرہ کو احساس ہوا کہ سب ایک خاندان کے رکن ہیں۔" (زندہ رود از جاوید اقبال، ص ۶۷۲)

۵۔ علامہ اقبال جرمنی دوبارہ جانے کے لئے بے حد گرم جوشی کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن انھیں دوبارہ جانے کا موقع نہ مل سکا حتیٰ کہ گول میز کانفرنس کے موقع پر بھی اور ایک آدھ اور موقع پر آپ پیرس اور اٹلی سے ہو کر آگے چلے گئے لیکن جرمنی نہ جا سکے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان پر برطانوی حکومت کا تسلط ہونے کے سبب اور اس زمانے میں جرمنی میں ہٹلر کی حکومت قائم ہونے جیسے عوامل آڑے آئے ہوں۔

۶۔ علامہ اقبال نے اپنے خط کا اختتام جرمنی کے قومی ترانے کے اس اولیں مصرعے سے کیا کہ جو تمام دنیا میں جرمنی کے درو دیوار سے گونجتا تھا۔ اس کے انگریزی معانی Germany over and above all کے ہیں۔ یہ مصرع جرمنی کے قومی ترانے کا پہلا مصرع ہے جو اب رائج نہیں۔ ذیل میں اس ترانے کے پہلے بند کا انگریزی ترجمہ درج کیا جا رہا ہے۔

Germany,Germany over and obove
all Above all in the world,
If it always sats together
Brotherly for protection,
From the Mass to the Memel,
From the Etsch up to the Belt,
Germany,Germany over and above all,
Above all in the world!

چوبیس مصرعوں اور تین بندوں پر مشتمل اس ترانے کے شاعر ہاف مین فان فالرسلیبن ہیں۔ انھوں نے ۱۸۴۱ء میں یہ ترانہ تحریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ جرمن قوم الگ الگ ریاستوں میں منقسم رہنے کی بجائے قومیت کی بنا پر ایک ہی ریاست کی تشکیل کرے۔ ہاف مین ان شعراء میں سے تھا جو متحد اور آزاد جرمنی کا خواب دیکھتے تھے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ترانے میں پیش کیے گئے انقلابی خیالات کی وجہ سے اسے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ شاعر کے ہاتھ سے لکھا ہوا ترانہ۔ یہ قیمتی مخطوطے کی صورت میں پولینڈ کے شہر کراکوف (Krakow) کی یاگیلونکا کولیکشن میں موجود ہے۔ اس گیت کو ۱۹۲۲ء میں جرمنی میں انقلابی روایت کے احیاء کے دوران قومی ترانے کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء سے لے کر آج تک یہ گیت کبھی مکمل تو کبھی ایک آدھ بند کی صورت میں قومی ترانے کے طور پر پڑھا اور گایا جاتا رہا ہے۔ نازی دور میں اس کا پہلا بند، ۱۹۵۲ء میں مغربی جرمنی میں اس کا تیسرا بند جب کہ ۱۹۹۱ء میں جرمنی کے اتحاد کے بعد اس گیت کے تیسرے بند کو قومی ترانے کا درجہ حاصل ہے۔ یہ گیت

جوزف ہائیڈن کی دھن پر گایا جاتا ہے۔ جوزف ہائیڈن نے یہ دھن ۱۷۹۷ء میں روم کے شہنشاہ فرانسس دوم کی سالگرہ کے موقع پر ترتیب دی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں رومن شہنشاہت کے خاتمے کے بعد اس دھن کو آسٹریا کی بادشاہت میں بجایا جاتا رہا اور بعد ازاں اسی دھن پر ہافمین نے گیت تحریر کیا کہ جسے جرمنی کے قومی گیت کا درجہ حاصل ہوا۔ دیگر تفصیلات کے لئے دیکھیے (The Nat ona Anthem Debate in the Federal Republic of Germany by Margarete Myers Feinstein, P 505)

جرمنی میں نازی دور کے خاتمے کے بعد اس گیت کا پہلا بند نہیں پڑھا جاتا۔ راقم نے اس موضوع پر کئی جرمن دانشوروں، اساتذہ اور طلبہ سے مکالمہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس گیت کے پہلے بند بالخصوص پہلے مصرعے Deutach and über Alles سے شدت کے ساتھ قوم پرستانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ہٹلر کے تلخ زمانے کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں جرمن قوم اب شعوری سطح پر قوم پرست رویوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ نوجوانوں کا خیال ہے کہ اب ہم جرمنی کی بجائے عظیم یورپ کے بارے میں سوچ رہے ہیں جس میں اس طرح کے مصرعوں اور قوم پرستانہ جذبات کی حامل شاعری کی کوئی گنجائش موجود نہیں جب کہ جرمنی میں عرصے سے مقیم غیر ملکی دانشوروں کا خیال ہے کہ جرمن قوم اس کا انکار کرتی ہے لیکن لاشعوری سطح پر یہ مصرعہ ان کے باطن کے نہاں خانوں میں اب بھی گونجتا ہے۔

۷۔ مکتوب اقبال بنام فنس ہاسکر ۳۰ جون ۱۹۳۶ء۔

۸۔ فنس ہاسکر کے جوابی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۲۲ جولائی کو جب علامہ اقبال کا خط فنس ہاسکر کو ملا تو پروفیسر گلاسیپ ان کے محل سے جا چکے تھے۔ فنس ہاسکر نے اقبال کی نیک تمنائیں اور ملنے کی خواہش کے بارے میں پروفیسر گلاسیپ کو خط لکھ کر آگاہ کیا تھا اور اس خط کی کاربن کاپی علامہ اقبال کے ملاحظے کے لیے اپنے خط کے ساتھ روانہ کر دی تھی۔ لنڈن آرکائیو میں اس کاربن کاپی کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ فنس ہاسکر قلم کی بجائے ٹائپ رائٹر استعمال کرتے تھے جس میں کاربن کاپی بنانا آسان ہوتا ہے۔

۹۔ ''ورلڈ کانگریس آف فیتھ'' ۳ جولائی ۱۹۳۶ء سے ۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء تک لندن میں منعقد ہوئی تھی جس میں دنیا بھر سے مختلف مذاہب کے علما اور مفکرین نے شمولیت کی تھی۔ اس کانگریس کا مقصد مختلف مذاہب کے مابین ہم آہنگی کی فضا کو پیدا کرنا تھا نہ جانے اس طرح کی کاوشیں بے ثمر کیوں رہیں۔ برطانیہ میں یہ تنظیم اب بھی خاصی فعال ہے۔ ۱۹۳۶ء کے سیمینار اور اس تنظیم کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں (Interfa th Orginizations-1893-1979, by Marcus Braybrooke)

۱۰۔ اس کانفرنس میں علامہ اقبال کے نہایت قریبی دوست سر عبدالقادر کے علاوہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل یوسف علی، سردار موہن سنگھ، آغا خان اور ڈاکٹر ایس۔ این۔ داس گپتا نے خطاب کیا تھا۔ اس کانفرنس میں مقالات پڑھنے والوں میں فنس ہاسکر کا نام ہمیں نظر نہیں آیا، ممکن ہے کہ انھوں نے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی ہو۔

۱۱۔ آسٹراؤ محل کے بارے میں یہ کتابچہ جرمن زبان میں ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر "Sch oss Ostrau" کا عنوان دیا گیا ہے جس کے معنی آسٹراؤ محل کے ہیں۔ اس عنوان کے اوپر محل کا فوٹوگرام چھپا ہے جو فنس ہاسکر نے ۲۰۰۲ء میں بنوایا تھا۔ اس کتابچے کو محل کے اندرونی اور بیرونی حصوں کی خوب صورت تصاویر سے مزین کیا گیا ہے۔ اس میں محل کی تاریخ کے ساتھ ساتھ

واضح ہو کہ خاندان کا مختصر پس منظر بھی درج ہے۔محل میں موجود نوادرات کی فہرست اور چند تصاویر کے علاوہ مہمانوں کی تاثراتی کتاب سے کچھ اقتباسات اس میں شامل کیے گئے ہیں۔چند ایک تاثرات منظوم بھی ہیں۔ راقم دسمبر ۲۰۰۸ء میں جب اس محل کو دیکھنے کے لیے آسٹریا گیا تھا تو واپسی پر میزبانوں نے جن چند روایتی تحائف سے مجھے سرفراز کیا، ان میں یہ کتابچہ بھی شامل ہے۔

۲۲۔ مسٹر اور مسز وسگر کے بارے میں عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں: ''علامہ اپنی موٹر میں ہمیں میکلوڈ روڈ پر لائے اور بخشی ٹیک چند کے مکان کے بالمقابل ڈرائیور کر کے ایک مکان کے سامنے اتر گئے۔ یہاں ایک پارسی میاں بیوی مسٹر و مسز وسگر رہتے تھے جن کے ہاں ان دنوں انگلی کے ایک سکالر ڈاکٹر سکاباپا آئے ہوئے تھے۔ مسٹر اور مسز وسگر بھی علامہ کے عقیدت مند تھے اور وہ ان کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مسز وسگر آکسفورڈ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں اور ان دنوں ڈی۔اے۔وی کالج میں انگریزی کی اعزازی پروفیسر تھیں'' (اقبال کی صحبت میں از عبداللہ چغتائی، ص ۳۱۵۔۳۱۶)

۲۳۔ اقبال کے معاصرین میں سے دلیپ سنگھ کے حوالے سے تین شخصیات کے نام سامنے آئے ہیں۔اس نام کے ایک جج لاہور ہائی کورٹ میں تھے کہ جنھیں بعض اوقات چیف جج بھی سمجھا گیا جب کہ لاہور ہائی کورٹ کی ویب سائٹ پر چیف جج کے طور پر ان کا نام درج نہیں۔انھوں نے گستاخِ رسول راج پال کو ماتحت عدالت سے ملنے والی سزا (دو سال قید سخت اور ہزار روپے جرمانہ) سے بری کر دیا تھا کہ جس سے مسلمانوں میں عام اشتعال پھیل گیا تھا۔ان کے اس فیصلے کے بعد لاہور میں فسادات کے اندیشے کے تحت حکام نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی تھی۔علامہ اقبال کے ہاں بھی اس فیصلے کے خلاف ردِعمل ملتا ہے۔قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دلیپ سنگھ نامی یہ جج اقبال اور فنس ہاسو کے مشترکہ دوست نہیں ہیں اور حیاتِ اقبال پر لکھی جانے والی کسی بھی کتاب سے تو ان کی ان سے دوستی یا روابط کا کوئی سراغ نہیں ملا۔دلیپ سنگھ نام کی ایک اور شخصیت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں لیکن ان کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہو گیا تھا، اس لیے وہ بھی ان دونوں کے مشترکہ دوست نہیں ہو سکتے۔

دلیپ سنگھ کے حوالے سے تیسرا نام ایک خاتون شہزادی کا ہے جو بمبا کے نام سے مشہور تھیں۔اپنے والد دلیپ سنگھ اور والدہ کے حوالے سے دلیپ سنگھ بمبا کہلاتی تھیں اور لاہور میں مقیم تھیں۔ان کے ہاں اقبال کا آنا جانا بھی رہا ہے۔میر جلال الدین ان ملاقاتوں کا احوال لکھتے ہیں: '' ایک مرتبہ شہزادی دلیپ سنگھ بمبا کی کوٹھی پر جانے کا اتفاق ہوا۔میر جو گندر سنگھ، سر ذوالفقار علی خان اور میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔موصوفہ کو ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت تھی اور وہ انھیں اکثر اپنی کوٹھی پر مدعو کیا کرتیں۔ہم سب بیٹھ گئے تو شاہزادی اٹھ کر برآمدہ میں تشریف لے گئیں اور چند منٹ بعد ایک نفیس حقہ خود اٹھائے ہوئے واپس آئیں اور ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ کر فرمایا کہ شوق کیجیے۔شہزادی اردو نہ جانتی تھیں مگر ڈاکٹر صاحب کے کلام کی بہت مشتاق رہتیں۔ان کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی نظم سنائی، جس کا ترجمہ سر جوگندر نے انگریزی میں کیا'' (ملفوظاتِ اقبال، مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص ۱۰۵) جاوید اقبال ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس (دلیپ سنگھ) کی بیٹی راجکماری بمبا اقبال کے جاننے والوں اور مداحوں میں سے تھی۔ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک کوٹھی میں مقیم تھی۔اس کا انتقال پاکستان بننے کے بعد ہوا'' (زندہ رود، ص ۴۲۵) ہمارا خیال ہے کہ فنس ہاسو کے خط میں دلیپ سنگھ سے مراد یہی دلیپ سنگھ بمبا ہیں لیکن خط میں ''سر اور لیڈی دلیپ سنگھ'' کے الفاظ اشتباہ کا باعث ہیں۔

۲۴۔ یہ اشعار اقبال کی معروف نظم "ترانۂ ہندی" کے ہیں جو "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ علامہ اقبال اور فنس باسو شرق و مغرب کے مابین گہرے علمی و ادبی روابط کے آرزو مند تھے۔ اس امنگ کا اظہار مکاتیب میں درج اشعار سے بھی ہوتا ہے۔

۲۵۔ علامہ اقبال بہت خوش آواز تھے لیکن عمر کے آخری حصے میں آ کر ان کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اقبال کے سوانحی حالات لکھنے والوں میں سے کم و بیش ہر سوانح نگار نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ تاہم ہمارے خیال میں سب سے وقیع رائے ان کے معالج، حکیم محمد حسن قرشی کی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اس مرض کی نزاکت سے واقف تھے یا پھر خود علامہ کی رائے کو اہمیت دی جا سکتی ہے کہ وہ اسے جھیل رہے تھے۔ اس مرض کی وجہ کے بارے میں حکیم محمد حسن قرشی لکھتے ہیں: "بیگم صاحبہ کی رحلت سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کو ایک خاص تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ عید کی نماز پڑھ کر آئے اور گرم دودھ ملا کر سویاں کھائیں۔ سویاں کھاتے ہی ان کی آواز بیٹھ گئی۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی مگر آواز نہ کھلی۔ آخر مجبور ہو کر پھر حکیم نابینا صاحب کی طرف رجوع کیا جن کے علاج سے ان کو معتد بہ فائدہ ہوا۔" (مشمولہ ملفوظاتِ اقبال، ص ۱۳۱)

۲۶۔ علامہ اقبال آسٹریا اور جرمنی میں کچھ معالجین سے رابطے میں تھے اور انھوں نے اپنے کچھ ایکسرے اور رپورٹیں بھی ارسال کی تھیں۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ فنس باسو کو علاج کی غرض سے اقبال کی متوقع آمد کا علم تھا تاہم اقبال علاج کی غرض سے یورپ نہ جا سکے جس کی ایک نفسیاتی توجیہ بیان کی جا چکی ہے اور جس کی تائید ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کے اس خط سے بھی ہوتی ہے: "بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے۔ مزید برآں یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہو گی کہ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے سالوں میں جب کہ میری زندگی کا کام تقریباً انجام کو پہنچ چکا ہے، میں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں۔ ایک خواہش جو ہنوز میرے دل میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ وہ تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لئے مکہ جاؤں۔" (خطوطِ اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، ص ۲۷۶۔ اصل خط انگریزی میں ہے کہ جس کا ترجمہ مذکورہ کتاب کے ص ۲۶۲ سے لیا گیا ہے)

کتابیات

(اردو کتب)

۱۔ بٹالوی، عاشق حسین "اقبال کے آخری دو سال" کراچی، اقبال اکادمی، بار دوم ۱۹۶۹ء
۲۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر "زندہ رود" لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
۳۔ چغتائی، محمد عبداللہ، ڈاکٹر "اقبال کی صحبت میں" لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۷۷ء
۴۔ چغتائی، محمد عبداللہ، ڈاکٹر "روایاتِ اقبال" لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۷۷ء
۵۔ خالد سنجرانی و طارق عزیز و دیگر (مرتبین) "اقبال شرق و مغرب کی نظر میں" لاہور، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء
۶۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر "فکرِ اقبال" لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۶۸ء

۷۔ خورشید، عبدالسلام ''سرگزشتِ اقبال'' لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء

۸۔ درانی، سعید اختر، ڈاکٹر ''اقبال یورپ میں'' لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۹ء

۹۔ رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر و دیگر (مرتبین) ''اقبالیات کے سو سال'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۲ء

۱۰۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر (مرتب) ''ملفوظاتِ اقبال'' لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء

۱۱۔ سالک، عبدالمجید ''ذکرِ اقبال'' لاہور، بزمِ اقبال (س ن) عرض حال یکم جون ۱۹۵۵ء

۱۲۔ عبدالواحد، سید ''نقشِ اقبال'' لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۹ء

۱۳۔ سید، عابد ''اقبال'' لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۷۷ء

۱۴۔ فقیر، وحیدالدین، سید ''روزگارِ فقیر'' کراچی، لائن آرٹ، بار ششم ۱۹۶۱ء

(جرمن اور انگریزی کتب)

1 Braybrooke,Marcees "Intrfaith Orginigations 1831 to 1979 A Historical Directory" Edwin Mellen Pr ND

2 Burgel, J C " Iqbal and Europe " Bern, Peter Lang, 1980

3 Chaghatai M Ikram. "Iqbal and Tagore" Lahore, Sang e meil publications 2002

4 Feinstein,Margarete Myers "The National Anthem Debate in the Fedral Republic of Germany" in "Central European History " Vol 33,Cambridge University, 2000

5 Glasenapp,Halmuth " Meine Lebensreise" Weisbadin,F A Brockhaus 1964

6 Goetz Bruno "Schloss Ostrau" Halle(Salle) Otto Hendel Druckerei,ND

7 Veltheim Hans Hasso "Tagebuchar aus Asein" Hamburg, Neue Folge 2 verb Aufl 1956

8 Walter Karl Klaus " Hans Hasso von Veltheim" Halle, mdv Verlag, 2004

9 Wintzen Rene "Post war German Literature" Hamburg, New Haven,1987

10 Wolfgang, Kochler "Mohammad Iqbal and three Realms of spirit" Hamburg

German Pakistan Forum,1977

Abstract

Personal letters and documents are considered a basic and reliable source of information about great personalities. The present writer has got the opportunity to discover an unpublished and rare letter of Allama Muhammad Iqbal addressed to one of his German friends Baron von Veltheim Hans-Hasso in the Archives of Wernigerode, a small town near Halle, Germany. This original letter of Iqbal, dated June 30, 1936 is in English and the reply by his German friend, dated July 22, 1936, is in German language. Both letters along with the Urdu translations of the German letter and detailed references are given in this article. It also refers to another German friend of Iqbal about whom the writer has attempted to collect a piece of information which is quite useful in the field of Iqbal's studies and for all who are interested in exploring Iqbal's peculiar association with Germany and German people.

یورپ سے ایک خط

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی!
تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال!
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام؟
کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومی

جواب

کہ نباید خورد و جو ہمچوں خراں
آہوانہ در ختن چر ارغواں
ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود
ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود

معیار ۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ: جنوری۔ جون ۲۰۰۹ء

ایک ذی علم خاندان:
مشفق خواجہ بنام منصور نعیم الرحمن

طیب منیر*

مشفق خواجہ (۱۹ دسمبر ۱۹۳۵-۲۱ فروری ۲۰۰۵) اُردو زبان و ادب کے نامور محقق، معتبر نقاد، بے مثل ادبی کالم نگار، ممتاز شاعر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ فیض رساں شخصیت تھے، جنھوں نے تمام عمر تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھانے اور ادبی و علمی مہمات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہر کسی و ناکس کی بھرپور مدد کی۔ بقول ڈاکٹر عارف نوشاہی "خواجہ صاحب بلاشبہ اس وقت برصغیر میں اُردو زبان و ادب سے متعلق تحقیقی معاملات میں مرجع عام کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

مشفق خواجہ مرحوم نے بلا مبالغہ ہزارہا خطوط اپنے ملنے والوں یا چاہنے والوں کو تحریر کیے۔ کتابی صورت میں خطوط کے تین مجموعے تو شائع ہو چکے ہیں،اس کے علاوہ سیکڑوں خطوط مختلف علمی و ادبی اور تحقیقی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ خطوط کے چند مجموعے یہ ہیں:

۱۔ مشفق نامے، محمد عالم مختار حق، اُردو اکیڈمی پاکستان ۲۰۰۶ء

۲۔ خطوط مشفق، ڈاکٹر طیب منیر، پورب اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۷ء

۳۔ مکاتیب مشفق، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مطبوعات سلیمانی لاہور ۲۰۰۸ء

پیشِ نظر دس خطوط ایک ایسی شخصیت کے نام ہیں جن کا خاندان علم و فضل کے حوالے سے ایک بلند مرتبے پر فائز رہا ہے۔ بقول مشفق خواجہ اس خاندان کے علمی کارنامے اس پائے کے ہیں کہ اُن پر ڈاکٹریٹ کے مقالے تحریر کیے جا

* پرنسپل، پوسٹ گریجویٹ کالج، سٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

سکتے ہیں۔ ان خطوط کی مجموعی فضا کو جاننے، محسوس کرنے اور معلوم ہونے ہوتے اُن علمی کارناموں سے آگاہی اور شناسائی کے لیے مناسب ہے کہ مکتوب الیہ کے دادا مولوی خلیل الرحمن اور والد مولوی نعیم الرحمن کے بارے میں اجمالاً ضروری معلومات درج کر دی جائیں۔ زیرِ نظر خطوط مشفق خواجہ کی انھی کوششوں کا تحریری عکس ہے، جن میں وہ ان بزرگوں کے علمی کارناموں کو محفوظ کرنے میں خود بھی کوشاں اور متعلقین کو بھی مائل کرتے نظر آتے ہیں۔

منصور نعیم الرحمن کے دادا مولوی خلیل الرحمن (۱۸۷۶ء-۱۹۳۹ء) کی پیدائش قصبہ سراوہ تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ (بابائے مولوی عبد الحق بھی یہیں کے رہنے والے تھے اور مولوی صاحب کے لڑکپن کے دوست بھی تھے) ملازمت کے سلسلے میں ایک طویل عرصے تک لاہور میں قیام رہا۔ لاہور کی مصروفیات میں مولوی صاحب کی علمی و ادبی تصنیف و تالیف اور تراجم کے کام کا آغاز ہوا۔ آپ کے دوستوں اور رفقا میں بڑے بڑے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ سید وحید الدین سلیم، مولانا اصغر علی روحی، جسٹس شاہ دین ہمایوں، سر محمد شفیع، مولانا ظفر علی خان، حافظ محمود شیرانی، مولوی محبوب عالم، مولانا ابو الکلام آزاد، خلیفہ عبد الحکیم، عبد المجید سالک وغیرہ۔ مولوی صاحب کے تحریری کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ چند ایک کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ سرگذشت نامہ   ۲۔ نفح الطیب (ترجمہ)

۳۔ مختصر تاریخ اسلامی   ۴۔ مولفین

۵۔ تاریخ الخلفاء (علامہ سیوطی کی کتاب کا ترجمہ)

۶۔ تاریخ الفلاسفہ

۷۔ ہنری رائیڈر ہیگرڈ کی کتاب SHE کا ترجمہ

مولوی خلیل الرحمن مرحوم نے عربی اور اُردو کے فروغ کے لیے انجمن بستیں جیسی کے دور رس نتائج آنے والے دور میں نظر آتے ہیں۔ مولوی خلیل الرحمن کے صاحبزادگان نے بھی بڑی بڑی علمی خدمات سر انجام دیں۔ مولوی نعیم الرحمن (۱۸۹۳ء-۱۹۵۰ء) مولوی خلیل الرحمن کے لائق فرزند تھے۔ ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے عربی کا امتحان طلائی تمغہ کے ساتھ پاس کیا۔ پریذیڈنسی کالج مدراس میں عربی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۲ء میں جامعہ الہ آباد میں شعبۂ عربی فارسی میں آگئے۔ انتقال تک اسی شعبے سے وابستہ رہے۔ موصوف کا شمار عربی فارسی کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ آپ

کئی زبانیں جانتے تھے۔ آپ کا میدان تخصص، اسلامی تہذیب، عرب تہذیب، دیوِمالا، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، فارسی ادب اور لسانیات میں تھا۔

مولوی نعیم الرحمن نے ابتدائی تعلیم لاہور کے اسلامیہ اسکولوں میں حاصل کی اس وجہ سے وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ اس طرح علامہ اقبال سے بالواسطہ تعلق قائم ہوا۔ کالج کے زمانے میں علامہ اقبال کے یہاں آنا جانا بھی رہا۔ علامہ اقبال کے کہنے پر اُن کے اردو کلام کو منتشر کاغذات سے جمع کر کے دو مکمل نسخوں میں تمام اوقاف و قرأت کو خوشخطی کے ساتھ نقل کیا۔

مولوی نعیم الرحمن کی مطبوعہ کتب اساس عربی، مفتاح عربی، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں اور چند کہیں پہیلیاں کے علاوہ متفرق موضوعات پر درجنوں مضامین غیر مطبوعہ یا غیر مدون ہیں۔ اُن کا بڑا کارنامہ "قاموسِ تلمیحات" ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ مشفق خواجہ کے ایماء پر رسالہ اُردو میں چھ سات قسطیں شائع ہوئیں۔ مولوی صاحب نے بانگِ درا پر حواشی بھی تحریر فرمائے، ان کی بھی چند قسطیں رسالہ اردو میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ مکتوب الیہ مسعود رحیم الرحمن (۱۹۲۶-۱۹۹۷ء) الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے طلائی تمغے کے ساتھ ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی اور پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۵۱ء میں سول سروس میں آئے۔ کئی انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے والد محترم مولوی نعیم الرحمن کی تحریروں کو یکجا کر رہے تھے کہ زندگی نے مہلت ہی نہ دی، تمام منصوبے ناتمام چھوڑ کر ۱۷ نومبر ۱۹۹۷ء کو راولپنڈی میں انتقال کر گئے۔

☆☆☆

- مولوی نعیم الرحمن صاحب نے ایک کتاب ۱۹۳۵ء میں شروع کی تھی اس کتاب کو وہ انگریزی میں لکھ رہے تھے وفات تک تقریباً تین ہزار موضوعات پر مضامین تیار کر چکے تھے۔ رحیم الرحمان صاحب ان کو اردو میں منتقل کر رہے تھے۔ قاموسِ تلمیحات کے عنوان سے چھ اقساط سہ ماہی "اُردو" شائع ہوئیں۔ پہلی قسط جون ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔

محترمی و مکرمی،

سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۲۰ اکتوبر ملا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ Dictionary of Allusions [1] کے مسودے کے چند صفحات کا عکس مجھے بھیج دیجیے، میں اُسے دیکھ کر ترجمے کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ اگر مسودے کے سرورق پر کوئی دیباچہ ہو تو اس کا عکس ضرور ارسال فرمائیے۔

آپ کے خاندان نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں اُن کا تقاضا ہے کہ اس خاندان کا ایک ایسا تذکرہ شائع ہو جس میں ہر فرد خاندان کے حالات اور علمی خدمات کی تفصیل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کام کو ایک مضمون میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اس کام کو اور زیادہ دیر تک ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔

میری ایک عرصے سے خواہش ہے کہ آپ کے خاندان کا ایک مفصل تذکرہ مرتب کیا جائے۔ قدسیہ انصاری صاحبہ نے جب آپ کا ذکر کیا تو میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا۔ آپ کے اہلِ خاندان کی علمی خدمات سے تو میں ایک عرصے سے واقف ہوں، لیکن آپ سے تعارف کا موقع نہیں ملا۔ آپ کا ذکر پہلی مرتبہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مجھ سے کیا تھا۔ مولوی نعیم الرحمٰن مرحوم کی کتابیں جب انجمن کے کتب خانے میں داخل ہوئی تھیں تو مولوی صاحب نے آپ کو خط لکھا تھا۔ اس زمانے میں آپ شاید لائل پور میں تھے۔ دو چار مرتبہ رئیس صدیقی مرحوم سے آپ کا ذکر آیا تھا۔ اب کبھی کبھی [illegible] [2] آپ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۳۱/۱۰/۸۷ء

☆☆☆

۱۔ اس کتاب سے مراد "قاموس تلمیحات" ہے۔ مولوی نعیم الرحمٰن صاحب نے اس کا نام "Encyclopedia of Allusions in Arabic and Urdu Literature and Poetry" تجویز کیا تھا، بعد میں اس کو "Dictionary of Allusions" کا نام دیا گیا۔

۲۔ [illegible] (۱۹۳۳ء – ۲۰۰۲ء) معروف طنز و مزاح نگار، الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی میں کیا۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ "باتوں سے خوشبو آئے" (۱۹۷۴ء)، دوسرا مجموعہ "دیگر احوال یہ ہے کہ" (۱۹۸۳ء)، مضامین کا تیسرا مجموعہ "[illegible]" (۱۹۹۹ء) میں شائع ہوا۔

محترمی وکرمی،

سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۱۱ نومبر موصول ہوا یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ کے والد مرحوم کی کتاب کے چاروں اور رباعیات میں نے دیکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا کام شاعری کی زبان میں موجود ہے۔ اس کتاب کے انگریزی متن اور اردو ترجمے دونوں کی اشاعت ضروری ہے۔ آپ ترجمے کا کام شروع کر دیجیے، اگر آپ پسند فرمائیں تو ترجمہ کر کے مجھے بھیجتے جائیے، میں اپنے طالب علمانہ مشورے پیش کرتا رہوں گا۔ اردو ترجمے کی اشاعت کا فوری انتظام ہو سکتا ہے اس کے بعد انگریزی متن کی اشاعت کی بھی کوئی راہ نکل آئے گی۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے خاندانی تذکرے کی ترتیب کے سلسلے میں ابتدائی اقدامات کر رہے ہیں، یہ فرض خاندانی ہی نہیں علمی بھی ہے۔ خدا کرے آپ اسے خوش اسلوبی سے ادا کر سکیں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۱/۱۱/۸۷ء

☆☆☆

محترمی وکرمی،

سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۲۱ اپریل موصول ہو گیا تھا، اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے خاندان کے تذکرے کے لیے مواد جمع کر لیا ہے اب اس کی ترتیب و تدوین کا کام باقی ہے۔ میری رائے میں مناسب یہ ہوگا کہ آپ کو جو مضامین لکھنے ہیں وہ پہلے مکمل کر لیجیے اور اس کے بعد دوسروں کے مضامین کی تدوین کا کام کیجیے۔ جب کتاب کا تمام کام مکمل ہو جائے تو آخر میں مقدمہ یا تمہید لکھیے جس میں تاریخی و تہذیبی اور ادبی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے۔

آپ کے دونوں مضامین جو اردو میں چھپے ہیں، چھپنے سے پہلے میں نے پڑھے تھے، رسالہ اردو میں چھپنے والی ہر چیز میری نظر سے

۱۔ ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۳ [illegible] ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہ استاد، شاعر، نثر نگار، محقق، نقاد اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی ایک اور بڑی پہچان خاکہ نگاری اور وہ کام ہے جو حضرت سلطان المشائخ کے حوالے سے کیا ہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں محمد حسین آزاد۔ حیات و تصانیف، "تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار" (تدوین)، "اردو کی پہلی کتاب" اور درسی کتابیں، گلدستۂ احباب، خاکے، دبستان نظام، آنگن میں ستارے، خاکے معروف کتب ہیں۔

۲۔ مولوی خلیل الرحمن کے تیسرے بیٹے (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۲ء)

گزری ہے اس لیے کہ انجمن کے ایک ضابطے کے مطابق، کوئی مضمون اس وقت تک اُردو میں نہیں چھپتا، جب تک میری نظر سے نہ گزر جائے۔ افسوس کہ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ لہٰذا آئندہ آپ اردو کے لیے جو کچھ بھی رسالہ میں دیں وہ براہِ راست میرے پتے پر بھیج دیجیے۔ "تعلیمات اور بابائے اردو" کا سلسلہ جاری رکھیے۔

آپ کے والد مرحوم کے جو غیر مطبوعہ مضامین آپ کے پاس ہیں وہ انھیں شائع کرا دیجیے۔ اُردو مضامین رسالہ "اردو" اور انگریزی مضامین "اقبال اکیڈمی کے جرنل "اقبال ریویو" میں شائع ہو سکتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ مضامین ہر حالت میں محفوظ ہو جانے چاہئیں۔

آپ کے چچاؤں پر اور والد مرحوم کے بارے میں بعض رسائل و کتب میں کچھ تحریریں شائع ہوئی تھیں۔ کیا یہ سب آپ نے جمع کی ہیں؟ مثلاً پچھلے سال شہاب الدین دسنوی صاحب کی آپ بیتی "دید و شنید" شائع ہوئی تھی (دہلی سے) اس میں ڈاکٹر محمد بدر الرحمن صاحب کا ذکر بھی بہت اچھے الفاظ میں ہے۔ اگر یہ کتاب آپ کی نظر سے نہ گزری ہو تو متعلقہ صفحات کے عکس پیش کر سکتا ہوں۔ شہاب الدین دسنوی میرے کرم فرما ہیں۔ ان سے ایک مستقل مضمون لکھنے کی بھی فرمائش کی جا سکتی ہے۔ آپ کے دادا جان نے مولوی محمد حسین آزاد کے بارے میں ڈاکٹر محمد صادق کو جو مقالہ دیا لکھا تھا، وہ میرے پاس ہے اگر آپ کے پاس نہ ہو تو میں پیش کر سکتا ہوں۔ رسالہ اردو میں آپ کے والد صاحب کے مندرجہ ذیل تین مضمون چھپے تھے۔

۱۔	اصلاحِ رسم الخط	اپریل ۱۹۳۱ء
۲۔	انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث	اپریل ۱۹۳۲ء
۳۔	تجویز اصلاحِ رسم الخط	اکتوبر ۱۹۳۲ء

اگر یہ آپ کے پاس نہ ہوں تو ان کے عکس بھیجے جا سکتے ہیں۔

اب کچھ میرے سوالات

۱۔ آپ کے دادا، والد اور چچاؤں کے نام اہلِ علم کے خطوط محفوظ ہیں یا نہیں؟ کیا محفوظ خطوط میں مولوی عبدالحق کے نام کے خطوط ہیں؟

۲۔ مولوی عبدالحق سے آپ کی بھی خط و کتابت رہی ہے خصوصاً ان کتابوں کے بارے میں جو الٰہ آباد سے آپ کے والد صاحب کے کتب خانے سے منگوائی گئی تھیں۔

۳۔ آپ کے والد صاحب کی جو کتابیں مولوی عبدالحق اور پشاور یونیورسٹی کو دی گئیں، کیا ان کی فہرستیں آپ کے پاس ہیں؟

۴۔ آپ نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق آپ کے دادا کے بچپن کے دوست اور ہم عمر تھے، میں سمجھتا ہوں کہ کچھ رشتہ داری بھی تھی کیا اس رشتے داری کی نوعیت پر آپ روشنی ڈال سکتے ہیں؟

۵۔ ہاپڑ اور سرادہ کے بارے میں کوئی کتاب یا مضمون آپ کی نظر سے گزرا ہو تو مطلع فرمایئے۔

میں دراصل مولوی عبدالحق کے بارے میں تحقیقی کام کر رہا ہوں اور ان کے خطوط جمع کر رہا ہوں، اس لیے آپ سے یہ سوالات کیے ہیں۔

اور اگر ہو سکے تو اپنے چچاؤں کی تاریخ ہائے وفات سے مطلع کیجیے تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ غلطی کہاں ہے۔ میں ان کے بارے میں تحریری شذرات لکھے گئے ہیں کہ نہیں۔

کیا آپ کے والد صاحب کے اقبال سے متعلق مقالات اتنی تعداد میں ہیں کہ ایک کتاب تیار ہو سکے۔ اقبال اکیڈمی کی طرف سے اس کی اشاعت کا انتظام ہو سکتا (ہے) اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ اکیڈمی کے لیے اعلیٰ علمی معیار کے حامل مسودات حاصل کرنے میں ان کی مدد کروں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا خیراندیش
مشفق خواجہ
۲۴/۲/۹۳ء

☆☆☆

محترمی و مکرمی،

سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۲ مئی موصول ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی "بانگِ درا" پر حواشی کی دوسری قسط بھی مل گئی[1]۔ یہ دفتر انجمن کمپوزنگ کے لیے بھیج دی گئی ہے۔ "قاموسِ تلمیحات" کی چھٹی قسط زیرِ ترتیب شمارے میں ہے۔ پچھلے شمارے میں یہ قسط اس لیے شائع نہ ہو سکی کہ ایک ہی مضمون سے رسالے کی ضخامت پوری ہو گئی۔ ایک عرصے سے رسالہ 'اردو' کی اشاعت میں بے قاعدگی پائی جا رہی ہے۔ سن ۹۳ء کا پہلا شمارہ پچھلے ہفتے شائع ہوا ہے (یہ آپ کو بھیجا گیا ہے) ۹۳ء کے تین اور ۹۴ء کے دو شماروں کی اشاعت کے بعد ہی اس بے قاعدگی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ طے کیا گیا ہے ۹۳ء کے تین شماروں کو ایک مشترکہ شمارے کی صورت میں شائع کر دیا جائے اور اسی طرح ۹۴ء کے دو شمارے یک جا کر دیے جائیں۔ اس طرح جولائی تا ستمبر ۹۴ء کا شمارہ اپنے وقت پر شائع ہوگا۔ جو دو شمارے زیرِ ترتیب ہیں ان میں سے ایک میں "قاموسِ تلمیحات" اور دوسرے میں "بانگِ درا۔۔۔" شامل ہیں۔ ان مضامین کی اگلی قسطیں اگر آپ جلد عنایت کر سکیں تو رسالے کی بروقت اشاعت میں مدد ملے گی۔

میں نے دفترِ انجمن کو ہدایت کر دی ہے کہ رسالہ 'اردو' میں آپ کے والد مرحوم کے جو تین مضامین شائع ہوئے ہیں ان کے عکس آپ کی خدمت میں بھیج دیے جائیں۔ یہ عکس رسالہ اردو کے تازہ شمارے کے ساتھ آپ کو مل جائیں گے۔ اس خط کے ساتھ مولوی خلیل الرحمن مرحوم کا خط (بصورتِ عکس) بھیج رہا ہوں۔ یہ محمد حسین آزاد کے بارے میں ہے اور ڈاکٹر صادق کے نام ہے۔ شہاب الدین دسنوی کی آپ بیتی کے اقتباسات آئندہ بھیجوں گا۔ یہ کتاب ایک دوست مطالعے کے لیے لے گئے تھے، ابھی واپس نہیں ملی۔ آپ کے والد صاحب کے مضامین پرانے رسالوں میں نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں یہ مضامین نظر سے گزرے ہیں۔

۱۔ بانگِ درا پر چند حواشی کی پہلی قسط سہ ماہی "اردو" دسمبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔

۱۔ فنِ تنقید (قسط ۵) ماہنامہ "نگار" لکھنؤ، شمارہ اکتوبر ۱۹۳۳ء
۲۔ قصہ سکندر و دارا اس کی مشابہت یونانی قصے سے، رسالہ "مخزن" لاہور شمارہ جون ۱۹۱۹ء
۳۔ انگریزی ہندسے، رسالہ "مخزن" لاہور دسمبر ۱۹۲۰ء

اگر یہ آپ کے پاس نہ ہوں تو ان کے عکس بھیج سکتا ہوں ویسے اس سلسلے میں صحیح طریق کار یہ ہوگا کہ آپ کے پاس جو مطبوعہ مضامین ہیں ان کی فہرست (مع حوالہ) بھیج دیجیے، جو مضمون اس فہرست میں نہیں ہوگا، اس کا عکس بھجوا دیا کروں گا۔

نظم "تصویر درد" سے متاثر ہو کر پروفیسر صاحب نے جو نظم (تاثیر درد) لکھی وہ بھجوا دیجیے اسے تو کسی رسالے میں شائع کر دیا جائے گا۔ سامری کی مثنوی کے متعلق مضمون پانچویں اورینٹل کانفرنس کی روداد میں چھپ چکا ہے یہ روداد دو جلدوں میں ہے یہ مضمون پہلی جلد میں ہے یہ دونوں جلدیں میرے پاس ہیں۔

از راہ کرم مطلع فرمائیے کہ فارسی میں ریڈیائی تقاریر کی تعداد کیا ہے اور یہ کن موضوعات پر ہیں اور ان کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

آپ کے چچا جان کے اصرار پر وہ مضمون ضرور کسی ذمہ دار شخص کو دیا ہوگا۔ یقیناً یہ کسی رسالے میں مل جائے گا۔ مطلع فرمائیے کہ یہ مضمون اردو میں تھا یا انگریزی میں۔ یہ معلوم ہو جائے تو تلاش میں سہولت ہو جائے گی۔

خط کے پیرا گراف ۶ میں آپ نے جن Notes کا ذکر کیا ہے انھیں ایک ہی عنوان "اشارات" کے تحت مرتب کر دیجیے۔ یہ متفرق موضوعات پر ایک اچھا خاصا مقالہ بن جائے گا۔ حروف مقطعات پر جو اشارات ہیں وہ تو شاید وہی ہوں گے جن کا ذکر قاموس تلمیحات میں آئے گا۔ گیتوں کو بھی آپ تمہید کے ساتھ تیار کر دیجیے۔

آپ نے مقالے کے ساتھ اپنے والد صاحب کی تصانیف کی جو فہرست رسالہ "اردو" میں شائع کی تھی اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مقالہ کون سا ہے اور کتاب کون سی۔ آپ ایک نئی فہرست مرتب فرما دیجیے جو چار عنوانات کے تحت ہو۔

۱۔ مستقل کتابیں　۲۔ انگریزی مقالے　۳۔ اردو مقالے　۴۔ دیگر زبانوں کے مقالے

ہر کتاب یا مقالے کے بارے میں یہ بتایا جائے کہ مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ۔ چھپا ہے تو کس ادارے سے یا کس رسالے میں (مکمل حوالہ) آپ کے پاس ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی مقالوں کو موضوع وار مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ نیز مطبوعہ کتابوں کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں کس ادارے سے چھپوایا جائے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے جو خطوط آپ کو لکھے تھے وہ ان کتابوں کے بارے میں تھے، جو آپ کے والد مرحوم کے کتب خانے سے آئی تھیں۔ آپ کے ایک دو خط میرے کاغذات میں ہوں گے (بنام مولوی عبدالحق) ان میں سے ایک خط مولوی صاحب نے چھپوا بھی دیا تھا، میں مولوی عبدالحق کے خطوط جمع کر رہا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کے عکس عنایت کر دیجیے۔

آپ نے اپنے مضمون میں "دیوان ثابت" کا ذکر کیا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ دیوان شائع نہیں ہوا۔ یہ کس سے شروع میں کون مقدمہ ہے؟ اس کی ضخامت کیا ہے؟ اگر یہ کم صفحات کا ہو تو اسے کسی علمی جریدے میں شائع کرایا جا سکتا ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۳/۶/۹۲ء

☆☆☆

محترمی وکرمی،

سلام مسنون

آپ کا رجسٹری لفافہ مل گیا تھا، بانگِ درا کے حواشی قسط ۳ اور مولوی عبدالحق کے خطوط کے عکس بھی ملے۔ ان عنایات کے لیے شکر گزار ہوں۔

میں کئی روز سے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں مگر ۳ جولائی سے مسلسل بارش ہو رہی ہے، اس وجہ سے زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ ذرا حالات بہتر ہوں تو میں آپ کو مفصل خط لکھوں گا۔

یہ محض رجسٹری لفافے کی وصولی کی اطلاع ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۲۰/۷/۹۲ء

☆☆☆

محترمی وکرمی،

سلام مسنون

''قاموسِ تلمیحات'' کی ساتویں قسط موصول ہوئی۔ اس کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کے پچھلے خط کا جواب مجھ پر واجب ہے۔ مضامین کی کچھ فوٹو اسٹیٹ حاصل کر لی ہیں کچھ باقی ہیں یہ سب یک ساتھ روانہ کروں گا۔ تاخیر کا سبب یہ ہے کہ جولائی اور اگست کے مہینوں میں مسلسل بارشوں کی وجہ سے نظامِ زندگی معطل رہا۔ آسمانی بلاؤں کے ساتھ زمینی مصائب بھی کم نہیں ہیں۔ میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہ ہر طرح کی شورشوں کا مرکز ہے۔ اس وقت بھی جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، گولیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ بہرحال اب تو یہ سب کچھ زندگی کا معمول بن چکا ہے۔ میرے دوسرے خط کا انتظار فرمائیے، جس کے ساتھ مضامین کے عکس بھیجوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ
۲۱/۹/۹۴ء

☆☆☆

محترمی و مکرمی،

سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا، جواب تاخیر سے دے رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں وجہ کراچی کے حالات ہیں۔ میرے علاقے میں گڑبڑ کچھ زیادہ ہی ہے اس لیے زندگی معمول کے مطابق بسر نہیں ہو رہی۔

صورت حال یہ ہے کہ سنہ ۱۹۹۳ء میں "اردو" کا صرف ایک شمارہ شائع ہوا تھا، اب جو شمارہ زیر طبع ہے وہ سنہ ۱۹۹۳ء کے باقی ماندہ تین شماروں پر مشتمل مشترکہ شمارہ ہے۔ ایسا ہی ایک شمارہ ۱۹۹۴ء کے لیے شائع ہوگا۔ انھیں دونوں شماروں میں آپ کے مضامین کی قسطیں ہوں گی، یہ شائع ہوتے ہی دو سال کر دیے جائیں گے۔ آپ کے بزرگوں کے جو مضامین جمع کر رکھے ہیں وہ ابھی ان کے فوٹو اسٹیٹ نہیں ہو سکا، حالات ذرا معمول پر آ گئیں تو یہ کام کروں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۱/۱۲/۹۴ء

☆☆☆

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ خاصی تاخیر سے اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں، اس خط کے ساتھ آپ کے والد صاحب کے انھارہ مضامین کے عکس بھجوا رہا ہوں۔ ایک مضمون اصل صورت میں (نگار) ہے اس طرح کل ۱۹ مضامین ہیں۔ یہ ان رسالوں سے حاصل کیے گئے ہیں جو میرے ذاتی کتب خانے میں ہیں۔ دوسرے کتب خانوں میں تلاش سے مزید بہت سے مضامین مل سکتے ہیں۔ آئندہ بھی جب کوئی مضمون نظر سے گزرے گا تو اس کا عکس آپ کے لیے حاصل کر لوں گا۔

شہاب الدین دسنوی کی آپ بیتی "دیدہ و شنیدہ" میں متفرق صفحات پر ڈاکٹر عبدل الرحمن صاحب کا ذکر ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمالیں اور جن صفحات کے عکس ہوا ہوں ہوا لیں۔ اصل کتاب واپس بھیج دیں۔

میں نے شہاب الدین صاحب کو لکھا تھا کہ وہ ڈاکٹر غزل الرحمٰن کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھ دیں، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ نہیں لکھ سکے البتہ انھوں نے مختصر تاثرات لکھ بھیجے ہیں، ان کا عکس بھی بھیج رہا ہوں، انھوں نے ایک کرم یہ کیا کہ شہدائے قریش کا ایک مضمون مع حوالہ کسی کتاب میں شائع ہے انھوں نے کتاب کا نام نہیں لکھا میں نے خط لکھا ہے کہ کتاب کا نام مطلع کیجیے۔ جوں ہی آپ کو اطلاع دوں گا اس مضمون کا عکس بھی بھیج رہا ہوں۔

آپ کے والد صاحب کے مضامین ایک رسالے میں رسالوں میں کثرت سے چھپتے رہے ہیں ان سب کو جمع کرنا چاہیے۔ اس صدی کے ابتدائی ۳۰-۴۰ برسوں کے رسالے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس لیے ان مضامین کو جمع کرنا چنداں مشکل نہیں ہے آپ بے حد ان کا حوالہ کر لکھ دیے ہیں اس کی تکمیل کے لیے ان مضامین کا آپ کے پاس ہونا ضروری ہے۔

قاموس تلمیحات کی ساتویں اور حواشی بانگ درا کی تیسری قسط ''اردو'' کے زیر ترتیب شمارے میں ہے۔ اگلے شمارے کے لیے اگلی قسطیں عنایت فرمایئے۔ آپ کے پاس آپ کے والد مرحوم کی جو قلمی تحریریں ہیں، اگر آپ ان کے عنوانات لکھ بھیجیں اور ایک آدھ تحریر کا عکس تو میں ان کی اشاعت کے لیے سلسلہ جنبانی کر سکتا ہوں، کتابی صورت میں نہیں تو فی الحال کسی رسالے میں انھیں چھپوایا جا سکتا ہے۔

''دیوان ثابت'' کو تلاش کرنا چاہیے۔ یہ بہت اہم کام ہے خدا کرے یہ ضائع نہ ہوا ہو۔ ممکن ہے اہلِ آزاد میں کوئی اس کے بارے میں کچھ بتا سکے۔

میں کبھی کبھی اسلام آباد جاتا ہوں اگر اب کے موقع ملا تو آپ سے ملاقات کروں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۱۳/۱۲/۹۵ء

☆☆☆

محترمی و مکرمی،

سلام مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں، یہ پچھلا سال عجیب غیر معمولی انداز میں گزرا۔ بیماری، بسر، خاندانی مسائل و معاملات، غرض کہ کوئی کام معمول کے مطابق نہ ہو سکا۔ خط و کتابت کے لیے جس ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے وہ تقریباً مفقود رہا۔ امید ہے آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ آئندہ خط و کتابت میں یوں کوتاہی نہ ہوگی۔

حالات جیسے بھی رہے ہوں، مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں پرانے رسالے خاصی تعداد میں دیکھے۔ لاہور میں ایک صاحب کے پاس ''شہاب اُردو'' نامی رسالے کے کچھ شمارے دیکھے۔ ان میں آپ کے والد صاحب کے دس مضامین نظر آئے۔ یہ میں نے آپ کے لیے بصورت عکس حاصل کر لیے۔ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں، ان کے علاوہ بہت سے مضامین کے حوالے بھی میں نے نوٹ کر لیے ہیں۔ یہ

میں اگلے خط کے ساتھ بھیجوں گا۔

تین چار روز ہوئے سجاد زمن صاحب کا فون آیا تھا۔ انھوں نے آپ کو خط لکھا تھا جو نامکمل پتے کی وجہ سے واپس آ گیا۔ میں نے انھیں آپ کا صحیح پتا لکھوا دیا۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آپ رسالہ غالب کے لیے کوئی مضمون بھیجنا چاہتے ہیں۔ ضرور ارسال فرمائیے۔ اس رسالے کا مرتب بھی میں ہی کرتا ہوں۔ یہ تو یہ ششماہی رسالہ مگر سال میں ایک شمارہ بمشکل نکلتا ہے۔ اس کا آخری شمارہ ۱۹۹۵ء کا تھا، کیا آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ اگر نہیں تو بھجوا دوں گا۔ ۱۹۹۶ء ختم ہونے والا ہے لیکن ابھی نئے شمارے کے کام کا آغاز نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ غالب لائبریری میں عملہ نہیں ہے۔ میں اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں، جب فرصت ہوتی ہے تو اس طرف توجہ کرتا ہوں۔

یہی حال رسالہ "اردو" کا ہے۔ انجمن میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو صحیح پروف ریڈنگ ہی کر دے۔ اس لیے اس کی اشاعت میں بھی تاخیر ہوتی رہتی ہے۔ یہ ۱۹۹۶ء ہے اور اس کا آخری شمارہ جو شائع ہوا تھا وہ ۱۹۹۳ء کا آخری شمارہ تھا۔ اس وقت بمشکل ۱۹۹۴ء کا پہلا شمارہ مکمل ہو سکا ہے۔ آخری پروف میں نے پڑھا تو ان میں بے شمار غلطیاں تھیں۔ اب ان صفحات کو از سر نو بنوایا جا رہا ہے۔ آپ کے بھیجے ہوئے مضامین ۱۹۹۴ء کے شمارہ نمبر ۲ میں شائع ہو رہے ہیں۔ ایک دیوان پر حواشی کی تیسری قسط اور ناسخ کی تلمیحات کی ساتویں قسط۔ ازراہ کرم اگلی قسطیں ارسال فرمائیے تاکہ یہ سلسلے جاری رہیں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ ۱۹۹۷ء سے رسالے میں باقاعدگی پیدا ہو۔ ۱۹۹۴ء کا شمارہ نمبر ۲ تو مکمل ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کے تین شمارے اگلے چند مہینوں میں شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ پھر ۱۹۹۷ء سے پرچہ باقاعدگی سے شائع ہو گا۔

انجمن ترقی اردو اور غالب لائبریری کے کاموں میں، میں فی سبیل اللہ مدد کرتا ہوں۔ میرا ان اداروں سے کسی قسم کا مالی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ مذکورہ رسالوں پر بطور مرتب میرا نام دیا جائے۔ لیکن میں اتنا ہی کام کر سکتا ہوں جتنا میرے حالات اجازت دیتے ہیں۔

آپ جو اپنا خاندانی تذکرہ لکھ رہے تھے، اس کی رفتار کیا ہے؟ کس حد تک کام آپ نے مکمل کر لیا ہے؟ اس کام کو جلد از جلد مکمل کر دیجیے، یہ ایک بڑی علمی خدمت ہو گی۔

رسالہ اردو میں شائع شدہ مضامین کا حقیر سا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ کیا آپ کو کبھی دفتر کی طرف سے آپ کے مضامین کا معاوضہ ملا ہے؟ اگر نہیں تو ازراہ کرم اردو میں اپنے شائع شدہ مضامین کی فہرست بھیج دیجیے تاکہ معاوضہ آپ کو بھیجا جا سکے۔

آپ رسالہ اردو کے لیے جو مضامین ارسال فرمائیں وہ میرے گھر کے پتے پر بھیجیں تو بہتر ہے۔ میں انجمن کے دفتر کبھی نہیں جاتا اور وہاں میرے نام جو ڈاک آتی ہے وہ تاخیر سے مجھ تک پہنچتی ہے۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر ایک عرصے تک خط نہ لکھنے کی معذرت کرتا ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۲/۹/۹۶ء

☆☆☆

محترمی ومکرمی،

سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۶ اکتوبر مل گیا تھا اس کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کی صحت کی ناسازی کا معلوم کر کے تشویش ہوئی۔ میری دعا ہے کہ آپ صحت و شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ امید ہے آپ اب تک پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں گے۔

آپ کے بزرگوں کے بہت سے مزید مضامین کا سراغ ملا ہے۔ غالب لائبریری کے ذخیرۂ رسائل میں متعدد مضامین ہیں۔ جو میری نظر سے گزرے ہیں ان میں شامل مضامین کی فہرست میں نے بنائی تھی۔ یہ آپ کو جلد ہی بھیجوں گا۔ ان میں سے جو مضامین آپ کے پاس نہ ہوں گے، ان کی فوٹو اسٹیٹ فراہم کر دوں گا۔ پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے علمی و ادبی رسائل کے اشاریے چھپ گئے ہیں ان سے بھی آپ کے بزرگوں کے مضامین کا سراغ ملتا ہے جو اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔

مختار زمن صاحب کو آپ نے جو مضامین اپنے والد مرحوم کے بارے میں بھیجے تھے، وہ انھوں نے میرے حوالے کر دیے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین بہت اچھے ہیں اور بعض سرسری۔ بہرحال یہ سب قابل اشاعت ہیں۔ اے جی خان اور نسیم جعفری کے مضامین انگریزی میں ہیں۔ ان کے تراجم ہو جائیں تو اچھا ہے۔ کیا یہ کام آپ کر سکتے ہیں؟ پروفیسر نسیم الرحمن کے خود نوشت حالات ۱۹۴۶ء میں لکھے گئے تھے، اس کے بعد (وفات تک) کے حالات ایک دو پیراگراف میں آپ لکھ دیجیے، انھیں اس تحریر کے آخر میں بطور حاشیہ درج کر دیا جائے گا۔ اب اس گوشے کی تکمیل کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہوگی۔

۱۔ آپ کا مضمون
۲۔ پروفیسر صاحب کی تصنیفات و تالیفات، نیز مقالات کی فہرست
۳۔ پروفیسر صاحب کی تصویر

میں کوشش کروں گا کہ اس گوشے کے لیے چند مضامین اور لکھوائے جائیں۔ علی گڑھ اور الہ آباد کے بعض اہل علم سے میرے روابط ہیں، انھیں خطوط لکھوں گا۔

آپ نے مختار زمن صاحب کو جو خط لکھا ہے اس کا عکس بھی انھوں نے بھیجا ہے۔ رسالے کی اشاعت پر اس کے پندرہ نسخے آپ کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں گے۔ قیمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام مضمون نگاروں کو رسالہ پیش کرنا ادارے کا فرض ہے۔ ظاہر ہے آپ یہ نسخے مضمون نگاروں کے لیے ہی منگوا رہے ہیں۔

یہ گوشہ شائع ہو جائے تو میں کوشش کروں گا کہ پروفیسر صاحب کی زندگی اور علمی آثار پر کسی یونیورسٹی میں ریسرچ کرائی جائے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کا کام ہونا چاہیے۔ اگر کوئی اچھا ریسرچ اسکالر مل گیا تو وہ موضوع کا ....

رسالہ غالب کا تازہ شمارہ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں، اس سے آپ کو رسالے کے مزاج کا اندازہ ہو جائے گا۔ اردو کے یہ آپ کے مضامین کا انتظار رہے گا۔ اس کا بے حد شکریہ کہ آپ اردو کے مضامین کا سلسلہ ختم نہیں کریں گے۔ میں اب خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت کے لیے دعا گو ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

۔ مسعود رحیم الرحمن صاحب نے اپنے خاندان کا تذکرہ بعنوان "بابا جان" اور "مولانا خلیل الرحمن" جون ۱۹۹۰ء، دسمبر ۱۹۹۰ء سہ ماہی میں شروع کرایا۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۲۳/۱۲/۹۵ء

Abstract

These are some letters of Mushfiq Khawaja, a very famous Scholar poet and humorist. These letters are written to Mansoor Zaim Al Rehman, a member of a family with great academic traditions. In these letters Mushfiq Khawaja is trying to divert addressee's attention to bring the Academic and Literary achievements of his ancestors into light. Mushfiq Khawaja himself has been keenly cooperating in editing and appearing of their works. These letters contain highly precious material for the research scholars of the relevant subjects.

HISTOIRE DE LA LITTÉRATURE HINDOUI ET HINDOUSTANI

PAR M. GARCIN DE TASSY

PROFESSEUR À L'ÉCOLE SPÉCIALE DES LANGUES ORIENTALES VIVANTES
MEMBRE DE L'INSTITUT DE FRANCE
ET DES SOCIÉTÉS ASIATIQUES DE PARIS, DE LONDRES, DE CALCUTTA, DE MADRAS
ET DE BOMBAY
CHEVALIER DE LA LÉGION D'HONNEUR, ETC. ETC. ETC.

> The Hindi dialects have a literature of their
> own and one of very great interest.
> H. H. WILSON, *Introd. to Mack. Collect.*

TOME I

BIOGRAPHIE ET BIBLIOGRAPHIE
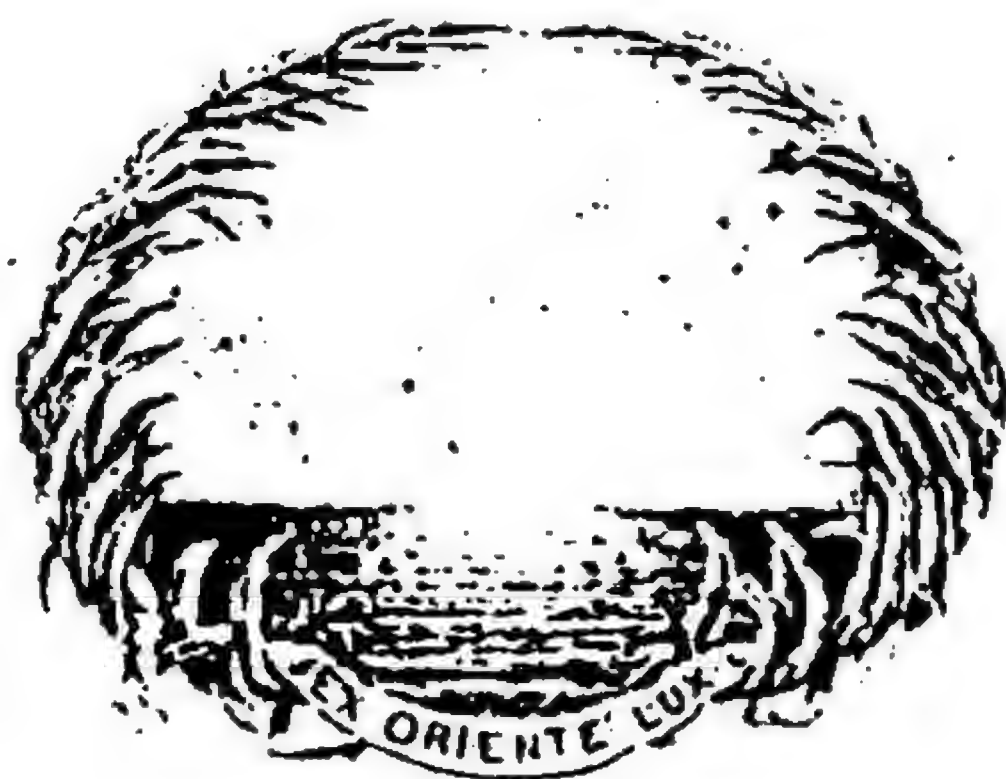
PARIS

PRINTED UNDER THE AUSPICES

OF THE ORIENTAL TRANSLATION COMMITTEE
OF GREAT BRITAIN AND IRELAND

M DCCC XXXIX

معیار - علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد [illegible]

عطیہ فیضی کی نادر خودنوشت "زمانۂ تحصیل"

محمد یامین عثمان*

"زمانۂ تحصیل" حصول علم کی اس غیر معمولی جدوجہد کی روداد ہے جو مصنفہ عطیہ فیضی نے ۱۹۰۶ء میں لندن پہنچ کر کی۔ عطیہ فیضی کا نام اردو ادب میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کے حوالے سے معروف ہے اور ان دونوں شخصیات کے عطیہ فیضی کے نام دلچسپ خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ مصنفہ نے اپنی روانگی کے دور سے ہی اپنے اہل خانہ کے نام مکاتیب کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں وہ تاریخ وار تمام پیش آمدہ واقعات اور روزمرہ کی روداد تفصیل سے بیان کیا کرتی تھیں اور ہندوستان میں ان کی ہمشیرہ زہرا بیگم ان خطوط کو ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزار کر "تہذیب نسواں" میں اشاعت کے لیے بھیجتی تھیں۔ "زمانۂ تحصیل" کتابی صورت میں بہت بعد میں شائع ہوئی لیکن چونکہ یہ روزنامچہ اپنی تصنیف کے وقت ہی قسط وار شائع ہو چکا تھا لہٰذا "زمانۂ تحصیل" کا سن تصنیف اور اشاعت دراصل ۱۹۰۶ء ہی ہے جب "تہذیب نسواں" میں اس کی قسط وار اشاعت کا آغاز ہوا۔

"زمانۂ تحصیل" کو اگرچہ خود مصنفہ نے سفرنامہ قرار دیا ہے لیکن اسے سفرنامے کی بجائے روزنامچہ سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ مصنفہ نے اس میں تاریخ وار روزانہ کی مصروفیات کی تفصیل درج کی ہے اور اس تفصیل کا بیشتر حصہ ان کی تعلیمی مصروفیات پر مشتمل ہے۔ ابتدائی اور آخری اندراجات سفری روزنامچے کی طرح کے ہیں جب عطیہ بیگم نے ہندوستان سے روانہ ہونے سے لے کر لندن آمد تک مختلف مقامات کا حال قلم بند کیا ہے اور آخری حصے میں جرمنی اور پھر فرانس کے شہر پیرس میں قیام اور وہاں کے دلچسپ مقامات کا احوال ملتا ہے۔ "زمانۂ تحصیل" کا آغاز یکم ستمبر ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے جب عطیہ فیضی بحری جہاز مولڈیویا (Moldevia) کے ذریعے لندن کے سفر کا آغاز کرتی ہیں اور آخری اندراج ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کا ہے جو عریبیا (Arabia) نامی میل بوٹ میں لکھا گیا ہے جس سے عطیہ بیگم ساحل بمبئی پر اتری تھیں۔ کتاب میں مختلف تاریخوں کے تحت کل ایک سو [illegible] اندراجات ہیں جن میں بعض خاصے طویل اور بعض بہت مختصر ہیں۔

عطیہ فیضی (۱۸۷۷ء۔۱۹۶۷ء) ترکی کے شہر استنبول میں پیدا ہوئیں جہاں ان کے والد حسن علی فیضی (۱۸۳۲ء۔۱۹۰۳ء)،

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

عطیہ بیگم کے حوالے سے اپنی پی ایچ ڈی کے تحقیقی منصوبے پر کام کے دوران خوش قسمتی سے راقم کی رسائی ان خطوط تک بھی ہو گئی ہے جن کی مدد سے "زمانۂ تحصیل" کو مرتب کیا گیا ہے۔ ان خطوط سے حاصل ہونے والی معلومات کو بھی حواشی میں شامل کیا گیا ہے۔

بیگم نے اپنے زمانے کی مسلم خواتین کے برخلاف پردے کی پابندی بھی نہیں کی اور اسی سبب سے انھیں مجلسی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ان کی ہمشیرہ، نواب صاحب جنجیرہ کی بیگم تھیں اور اس حوالے سے ان کے کئی ریاستوں کی شاہی خاندانوں سے قریبی مراسم تھے۔ یہ مراسم عطیہ بیگم کے لیے زیادہ سے زیادہ تقریبات میں شرکت اور حلقۂ احباب میں وسعت کا سبب بنے اور وہ اعلیٰ طبقے کی مجالس کے آداب اور نشست و برخاست سے پوری طرح واقف ہو گئیں۔ پردے کی پابندی نہ ہونے کے سبب وہ مردوں سے ملاقات اور گفت و شنید بھی کرتی تھیں جس سے ایک طرف ان کی معلومات کو وسعت ملی اور دوسری طرف ان کے شخصی اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھیں اور تعلیم نسواں کی تحریک کو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلتا ہوا دیکھنے کی خواہش مند بھی تھیں۔ جس کی ایک جھلک ۱۹۰۵ء میں انھوں نے علی گڑھ میں دیکھی تھی جہاں وہ اپنی ہمشیرہ زہرا بیگم کے ساتھ لیڈیز کانفرنس کی کارروائی میں شرکت اور اس سے متعلق ایک نمائش کے انتظام کے لیے گئی تھیں۔[۱] عطیہ بیگم کو ہندوستان کے طول و عرض میں سفر و سیاحت کے بے شمار مواقع ملے۔ ایسے ہی ایک موقع پر وہ کلکتہ بھی گئیں۔ کلکتہ کے دورے میں انھیں رابندر ناتھ ٹیگور کے ہاں قیام کا موقع ملا جہاں ٹیگور کی بھتیجی سرلا دیوی گھوشل سے ان کی دوستی ہو گئی۔ سرلا دیوی حقوق نسواں کی پُر جوش علم بردار تھیں۔[۲] عطیہ بیگم خود بھی تعلیم نسواں کے لیے عملی طور پر کچھ نہ کچھ کرنے کی خواہش مند تھیں۔ سرلا دیوی سے دوستی اور ملاقاتوں نے اس جذبے کو اور تقویت دی اور ان کے دل میں خواتین کے لیے تعلیم کا حصول ممکن بنانے اور تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی خواہش تیز تر ہو گئی چنانچہ انھوں نے تربیت معلمی کے لیے سرکاری وظیفہ حاصل کیا تاکہ تربیت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹ کر خواتین کی تعلیم کے لیے عملی طور پر کچھ نہ کچھ کر سکیں۔

"رسالۂ تحصیل" کی سب سے بڑی خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ اس کی مصنفہ ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتی تھیں جہاں گھر کے اندر بھی خواتین کی بیہودہ تعلیم کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا اور مسلم اشرافیہ تو اپنی بچیوں کو حصول علم کے لیے گھر سے باہر بھیجنے پر کسی طور رضا مند نہ تھی۔ بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں کسی عام مسلمان لڑکی کے لیے یہ محض خواب ہی میں ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر سے ہی نہیں بلکہ اپنے وطن سے بھی دور سات سمندر پار جا کر تعلیم حاصل کر سکے۔ ایسے ماحول میں عطیہ بیگم نہ صرف لندن کے لیے روانہ ہوئیں بلکہ روانہ ہونے کے دن سے لے کر اپنے قیام کے آخری ایام تک مسلسل اپنی سرگرمیوں سے خواتین کو آگاہ رکھنے کے لیے روز مرہ کی روداد بھی لکھتی رہیں تاکہ "تہذیب نسواں" کے ذریعے سے مسلم خواتین تک ان کے حصول علم کی جدوجہد کی تفصیلات پہنچتی رہیں۔ اگرچہ ۱۹۰۶ء میں "تہذیب نسواں" کا دائرۂ اشاعت بہت وسیع نہ تھا۔[۳] لیکن پھر بھی یہ رسالہ کئی مسلم گھرانوں میں باقاعدگی سے پڑھا جاتا تھا اور اپنے قارئین کا ایک حلقہ بنا چکا تھا۔ جب "رسالۂ تحصیل"

۱۔ نواب سیدی محمد خان والیٔ جنجیرہ سے نازلی بیگم کے تعلقات بعد میں کشیدہ ہو گئے تھے اور اس کا ایک سبب نازلی بیگم کے ہاں اولاد کا نہ ہونا بھی تھا جس کو جواز بنا کر نواب صاحب نے ایک اور شادی کر لی تھی۔ ریاست جنجیرہ اور نواب صاحب جنجیرہ سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: محمد مسعود عالم فلاحی، ہندوستان میں ذات پات اور مسلمان۔ (عنوان درست نہیں پڑھا جا سکا) مقصود اکبر

محمد مسعود عالم قاسمی، رجب ۱۴۲۳ھ، ملازان اکیڈمی، علی گڑھ

۲۔ "خاتون" علی گڑھ، جنوری ۱۹۰۵ء۔

اصغر عزیز احمد، "لڑکیاں جو شاعر ہو گئیں"، ص ۱۹۵، ۱۹۹۳ء، مکتبہ دوہ لاہور

۳۔ گیل مناک (Gail Minault) کے مطابق ۱۸۹۸ء سے شائع ہونے والے "تہذیب نسواں" کے خریداروں کی تعداد اشاعت کے چار سال بعد تین سو سے چار سو کے درمیان پہنچ سکی تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنفہ مذکورہ کی تصنیف "Secluded Scholars"، ص ۱۱۳، دہلی، ۱۹۹۸ء

شائع ہونا شروع ہوا تو نہ صرف بہت دلچسپی سے پڑھا گیا بلکہ یہ خود عطیہ بیگم کی شہرت کا بھی باعث بنا اور نہ صرف ہندوستان بھر میں بلکہ لندن تک بھی یہ شہرت پہنچ گئی جس کا تذکرہ مصنفہ نے "زمانۂ تحصیل" میں بھی کیا ہے۔ جب علامہ اقبال لندن میں ان سے پہلی بار ملاقات کے لیے آئے تو انھوں نے بھی اس روزنامچے کی "تہذیب نسواں" میں اشاعت اور اس کی دلچسپی و مقبولیت کا ذکر کیا تھا۔ [13] اسی طرح زمانۂ تحصیل کے ۲۶ جون کے اندراج میں انھوں نے لندن میں ہندوستانی طلبہ کی کانگرس میں بیگ کو ہندوستان سے ملنے والے خطوط کے ذریعے زمانۂ تحصیل کی مقبولیت کا پتہ چلنے کا ذکر کیا ہے۔

"زمانۂ تحصیل" عطیہ فیضی کی واحد اردو تصنیف ہے۔ انھوں نے اس کے علاوہ جو کتابیں لکھیں وہ تمام انگریزی زبان میں ہیں۔ [14] عطیہ فیضی نے جا بجا روزنامچوں اور اہلِ خانہ کے نام اپنے خطوط میں کئی بار اردو میں قوتِ اظہار کی کمی کا ذکر کیا ہے تاہم انھوں نے روزنامچے میں یہ روایت اور دوسرے ممالک میں کیے ہیں۔ وہ اپنے خطوط بھی روزنامچوں کی طرز پر تاریخ وار تحریر کرنے کی عادی تھیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے "زمانۂ تحصیل" کو بھی روزنامچے کی طرز پر ہی تحریر کیا ہے۔ "زمانۂ تحصیل" اپنی ابتدا سے ہی عطیہ بیگم کی ایک بین نگاہوں اور قوتِ مشاہدہ کے سبب دلچسپی کا حامل ہے۔ اپنے سفر کے آغاز پر سمندر کی مضطرب کیفیت اور اس کے اپنے اوپر پڑنے والے اثرات کو انھوں نے بہت فطری انداز میں قلم بند کیا ہے۔ پھر جہاز کے اندر کا ماحول، مسافروں کی کیفیت، جہاز پر صفائی کے انتظامات، چند مسافروں کے مختصر تعارف اور اپنی مصروفیت کے بیان کے ساتھ ساتھ انھوں نے جہاز پر کھانے پینے اور رہنے سہنے کے انداز کی تفصیل اس طرح سے درج کی ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اس ماحول میں شامل تصور کرنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں کہیں عطیہ بیگم کو موقع ملتا ہے وہ اپنے قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے مختلف تفاصیل بھی لکھتی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں ان کا انداز افسانوی اور داستانیہ بھی ہو جاتا ہے اور اس طرح زمانۂ تحصیل میں کہیں کہیں مکالمے کا انداز بھی نظر آتا ہے۔ زمانۂ تحصیل میں عطیہ بیگم کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لندن کی مجلسی زندگی کی بھی بہت دلچسپ جھلکیاں ملتی ہیں اور ساتھ ساتھ ان کے احباب کا مختصر مختصر تعارف بھی حاصل ہوتا جاتا ہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۰۷ء کو امپیریل انسٹی ٹیوٹ لندن میں ہونے والے ایک اجتماع کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

".......اور بہت سے اچھے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے لطیفیہ والے بھی تھے۔ علی رہبر

بقیہ حاشیہ ۱۱: ۱۹۰۶ء میں جب "زمانۂ تحصیل" "تہذیب نسواں" میں شائع ہونا شروع ہوا اس وقت "تہذیب نسواں" کی اشاعت کا آٹھواں سال تھا اور اگر اس میں سالانہ اضافے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس اعتبار سے ۱۹۰۶ء میں خریداروں کی تعداد سات سو سے آٹھ سو کے درمیان ہوتی ہوگی۔

۱۳ عطیہ بیگم، "اقبال"، مترجم ضیاء الدین احمد برنی، ص ۱۰

۱۴ عطیہ بیگم کی دیگر تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ "INDIAN MUSIC" ۱۹۱۴ء، ہوم جرنل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن

۲۔ "The Music of India" ۱۹۱۴ء، لوزاک اینڈ کمپنی، لندن

۳۔ "SANGEET OF INDIA" ۱۹۴۲ء، بمبئی

۴۔ "IQBAL" ۱۹۴۷ء، اکیڈمی آف اسلام، بمبئی

بھائی مرزا جان، مس داس، مس بلیئر ڈیلیوی بانرجی کی لڑکی، لیڈی چارلس ایلیٹ، مسٹر رینگی وغیرہ

وغیرہ۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں ترک رفعت بیگ جو دو مہینے ہوئے کہ ولایت آئے ہیں وہ بھی تھے۔۔۔۔۔''

عطیہ بیگم کو اپنے قیام لندن کے آغاز سے ہی علامہ عبداللہ یوسف علی کی جو طیب جی خاندان سے خاصے قریب تھے، سرپرستی میسر آ گئی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے صرف لندن کے علمی حلقوں میں عطیہ بیگم کو روشناس کرایا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ عطیہ بیگم نے علامہ کے بعض لیکچروں کی تفصیلات بھی قارئین کی دلچسپی کے لیے تحریر کی ہیں۔ عطیہ بیگم کو قیام لندن کے دوران ہی ہندوستان کے کئی مشاہیر سے ملاقاتوں کا موقع بھی ملا۔ ان ملاقاتوں نے بعد میں مستقل روابط کی صورت اختیار کر لی۔ ان مشاہیر میں مدیر مخزن شیخ عبدالقادر، مشیر حسین قدوائی تعلقہ دار گدیہ، سید علی بلگرامی، جسٹس امیر علی، ڈاکٹر انصاری اور علامہ اقبال شامل ہیں۔ ''زمانۂ تحصیل'' میں ان شخصیات سے ملاقاتوں کی دلچسپ تفصیلات بھی ہمیں ملتی ہیں۔ عطیہ بیگم کے حلقۂ احباب میں اس وسعت اور ملاقاتوں کا ایک نقصان یہ ہوا کہ عطیہ بیگم کی توجہ اپنے اصل مقصد سے کچھ ہٹ گئی اور ان کی سماجی مصروفیات میں اس قدر اضافہ ہوا کہ تعلیم پر اس کا اثر پڑنے لگا۔ اسی دوران انھیں اپنی نانی محترمہ دوۃ الوالی کے انتقال کی خبر بھی ملی جن سے انھیں بے حد پیار تھا۔ اس صدمے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور کالج کی پرنسپل مس ووڈز (Miss Woods) کو انھیں تبدیلی آب و ہوا اور آرام کے لیے اپنی بہن جے ووڈز (Woods) کے پاس کینٹ میں قیام کے لیے بھیجنا پڑا۔ عطیہ بیگم سے امید بندھی ہوئی تھی کہ وہ امتحان بھی دیں گی لیکن اس امتحان میں انھیں پوری طرح کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور وہ آٹھ میں سے پانچ مضامین میں ہی کامیابی حاصل کر سکیں۔ علامہ اقبال سے عطیہ بیگم کی ملاقاتوں کی تفصیل ''زمانۂ تحصیل'' میں بہت کم شامل کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال اور عطیہ فیضی کی ملاقاتوں کی ابتدا لندن ہی سے ہوئی تھی اور بعد میں یہ روابط اتنے گہرے ہوئے کہ دونوں شخصیات کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ عطیہ بیگم کے ساتھ ہندوستان سے روانہ ہونے والوں میں ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر علی اصغر اور بھتیجے طیب علی اکبر کے علاوہ مس روحی داس اور مس ہانڈا بھی شامل تھیں جن کا ذکر عطیہ بیگم نے مس داس کے نام سے کیا ہے۔ عطیہ بیگم، ہانڈا میں مس روحی داس سے خاصی متاثر دکھائی دیتی ہیں لیکن بعد میں ان کے درمیان کچھ تلخی سی آ گئی تھی جس کا تفصیلی ذکر کتاب کے حواشی میں کیا جائے گا۔

''زمانۂ تحصیل'' میں مشاہیر ہند کے ساتھ ساتھ یورپ کی کئی شخصیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن سے عطیہ بیگم کی ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ قریبی دوستوں اور خاندان کے بعض افراد سے، جو لندن میں مقیم تھے، ملاقاتوں کا احوال بھی ''زمانۂ تحصیل'' کا حصہ ہے۔

شخصیات کے علاوہ زمانۂ تحصیل میں مختلف مقامات کا بھی بہت دلچسپ احوال موجود ہے۔ یورپ کی مختلف سیرگاہوں اور تاریخی مقامات کی منظر کشی عطیہ بیگم نے نہایت سادگی اور بے ساختگی سے کی ہے۔ خاص طور پر جہاں انھوں نے کسی نئی اور عجیب چیز کو دیکھا ہے تو اس کے تعجب اور حیرت کا تاثر بہت فطری انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ عطیہ بیگم نے پہلی بار لندن کی ٹیوب ریل کا ذکر

---

۵ علامہ نے عطیہ بیگم کو لندن کی سوسائٹی آف لٹریچر میں ہونے والے ایک علمی مذاکرے میں شرکت کی دعوت بھی دی تھی۔ اس مذاکرے میں اہل علم سے ملاقات اور ان سے گفتگو نے عطیہ بیگم کو بے حد متاثر کیا اور انھوں نے اپنے مکتوب میں اس کا تفصیل سے ذکر بھی کیا تاہم کسی وجہ سے یہ ذکر ''زمانۂ تحصیل'' میں شامل نہ ہو سکا۔ (عطیہ بیگم کا مکتوب بنام ''ظل السلطان'' ۱۴ نومبر ۱۹۰۶ء)

ہوئے" ڈانسر کیا تو حیرت کے مارے اس ریل گاڑی کی تیز رفتار آمد و رفت کو "جنات کا کھیل" کہہ گئیں۔ اسی طرح ایفل ٹاور کی لفٹ، جسے انھوں نے انسان کش گاڑی کا نام دیا ہے، ان کے لیے حیرت کا سبب بنتی ہے اور اس کے کام کرنے کے طریقے کو انھوں نے تفصیل سے تحریر کیا ہے۔

عطیہ بیگم نے قیامِ لندن میں یورپ کی تہذیبی زندگی کا بھی قریبی مشاہدہ کیا اور وہاں یورپ کے رہن سہن، خورد و نوش، رکھ رکھاؤ اور رسم و رواج وغیرہ کا گہری نظر سے جائزہ لے کر وہاں ہندوستان سے اس کا موازنہ تحیر و تاسف اور حسرت کے ساتھ کیا ہے۔ اس طرح کے موازنے کرتے ہوئے، وہ ایک خالص ہندوستانی وطن پرست اور تحریکِ نسواں کی علم بردار کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں جو ہر صورت میں اپنی قوم اور وطن کی ترقی اور خوشحالی کی خواہش مند ہے۔

"زمانۂ تحصیل" میں لسانی اعتبار سے بعض نقائص بھی موجود ہیں۔ اس کی زبان زیادہ تر وہی ہے جو اس زمانے میں بمبئی میں رائج تھی۔ بعض الفاظ و محاورات قارئین کے لیے غیر مانوس ہیں۔ مثلاً شاندار کے لیے بھپاک کا لفظ۔ اسی طرح ٹھیک کے مفہوم میں برابر کا استعمال، گزشتہ جملے کی جگہ گئے جملے، وعدے کے مطابق کی جگہ وعدے کے موجب، کیسے یا کس طرح کی جگہ کیوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض تراکیب انھوں نے ایسی استعمال کی ہیں جو اردو میں رائج نہیں ہیں ان میں سے کچھ تو خاص ان کی اپنی اختراع لگتی ہیں۔ مثلاً پرکالۂ آتش اور صفائی، آرام جوئی، ہجر بھرا کے، چاے خوری، دلچسپ پھرتی وغیرہ۔ لیکن ان لسانی کمزوریوں کے باوجود "زمانۂ تحصیل" کا انداز اتنا فطری ہے کہ اس کی دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر "زمانۂ تحصیل" ایک ایسا دلچسپ روزنامچہ ہے جس میں ایک طرف سادگی اور بے ساختہ پن موجود ہے تو دوسری جانب اس میں جابجا یورپ کی تہذیب و معاشرت اور خانگی و مجلسی زندگی کے دلچسپ مرقعے دکھائی دیتے ہیں۔ "زمانۂ تحصیل" کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے خواتین میں حصولِ علم کے لیے کوشش اور جد و جہد کا ایک جذبہ بیدار ہوا اور تعلیمِ نسواں کے علم برداروں کو ایک اچھی مثال میسر آئی۔ زمانۂ تحصیل سے جہاں ایک طرف عام ہندوستانی خواتین اور خاص طور پر مسلم خواتین کو شاید پہلی بار یورپ اور برطانیہ کی خواتین کی معاشرتی و خانگی زندگی اور حصولِ علم کے لیے ان کی کوششوں کے بارے میں اتنی تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں تو دوسری طرف عام مسلم خواتین میں یہ احساس بھی بیدار ہوا کہ تعلیم کا حصول ان کے لیے کس قدر ضروری ہے اور غالباً یہی "زمانۂ تحصیل" کی اشاعت کا مقصد بھی تھا۔

["زمانۂ تحصیل" کا متن مع تعلیقات: معیار، شمارہ ۱۸]

Abstract

Zamana-e-Tehsil is a memoir and travelogue written by a famous figure Atiya Fayzy in the form of personal diary or notes during her

stay in London in 1906. It is the only book, besides her articles, of Ms. Fayzy in Urdu and presents her daily routine of academic and social life, a brief introduction of her association with prominent and eminent personalities and a description of the significant social events and gatherings in London. It also gives an account of famous historical and interesting places in a simple narrative style.

ہوالمستعان

زمانۂ تحصیل

مصنفہ

عطیہ بیگم رحمین

۱۳۳۹ھ
۱۹۲۱ء

مطبع مفید عام آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخاں صوفی چھپا
۱۹۲۲ء

معیار۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری-جون ۲۰۰۹ء

جنوبی ایشیا میں انگریزی زبان کی ترویج: علماء کا ردِّعمل

محمد ارشد*

ستمبر ۱۸۰۳ء میں جنرل لارڈ لیک (Lord Lake) کی قیادت میں انگریزی فوج کے دارالسلطنت دہلی میں فاتحانہ داخلہ کے ساتھ ہی کلکتہ سے دہلی تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس بیرونی اقتدار سے یوں تو برعظیم پاک و ہند کی اجتماعی زندگی کے سب ہی شعبوں پر اثر پڑا لیکن روایتی تہذیب و تمدن کے تین عناصر -۱قانونی و عدالتی نظام، ۲-تعلیمی نظام اور ۳-فکری و اعتقادی نظام، خاص طور سے متاثر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام چونکہ ایک خاص تہذیب اور زبان کے نمائندے تھے چنانچہ ان کے اقتدار کے قیام و استحکام کے ساتھ ساتھ اُن کی تہذیب اور قومی زبان-انگریزی- کا غلبہ و استیلاء بھی ناگزیر تھا۔

گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings، ۱۷۷۲-۱۷۸۵ء) اور اُس کے جانشین کارن والیز (Cornwallies، ۱۷۸۶-۱۷۹۸ء) نے قدیم عدالتی نظام کی از سر نو تنظیم و تشکیل کی طرف خاص توجہ دی۔ چنانچہ ان دونوں کے ادوار میں فوجداری اور دیوانی کی عدالتوں کی تنظیم نو کی گئی۔ متعدد نئی عدالتیں قائم ہوئیں جن کے عہدے انگریزوں کے لیے مختص کر دیے گئے، جبکہ مسلمان قاضیوں کے دائرہ عمل کو محدود سے محدود تر کر دیا گیا۔ اب ضلعی دیوانی عدالتوں کی صدارت انگریز کلکٹر مسلمان مفتیوں اور ہندو پنڈتوں کے تعاون سے کرنے لگے۔ یہ عدالتیں مسلمانوں کے شخصی و عائلی قوانین سے متعلق مقدمات کے فیصلے شرعی قانون کے مطابق کرتی تھیں۔ کارن والیز کے دور میں اسلامی قانون سے نابلد انگریز ججوں اور قانونی افسروں کی سہولت کے لیے حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔ سر ولیم جونز (Sir William Jones) بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (م ۱۷۹۴ء) نے قانونِ وراثت سے متعلق فقہ حنفی کی کتاب سراجیہ کا ترجمہ کرنے کے علاوہ انگریزی میں اس کی شرح بھی لکھی۔ کمپنی نے اٹھارہویں صدی کے اواخر سے برطانوی دیوانی و فوجداری قوانین کے اجراء و نفاذ کا آغاز کیا۔ نئے قوانین کے نفاذ سے اسلام کے قانون فوجداری کی کارفرمائی مختصر و محدود ہوئی۔ کمپنی کی ان قانونی اصلاحات کے نتیجے میں نظامِ قانون کا انداز انگریزی ہوگیا اور گورنر جنرل کی مرکزی حکومت کی توثیق میں آ گیا۔ سب سے اہم یہ کہ مسلمانوں

* مدیر، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی (علامہ اقبال کیمپس)، لاہور ۵۴۰۰۰۔

اعلیٰ قانونی و عدالتی عہدوں کے دروازے انگریزی زبان اور جدید قانون سے عدم واقفیت کے سبب، بند ہو گئے۔
کمپنی کی حکومت کے ابتدائی چار عشروں (۱۷۷۳-۱۸۱۳ء) تک اس ملک میں جدید مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کی ترویج اور جدید اسکولوں اور کالجوں کے قیام کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ اس کے بجائے اس نے مشرقی علوم و السنہ کی سرپرستی کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے فارسی زبان کو بطور دفتری برقرار رکھا۔ مزید برآں اس نے عدالتی و انتظامی ضروریات کے پیش نظر عربی و فارسی زبانوں اور اسلامی قوانین میں ماہر علماء کی تیاری کے لیے ۱۷۸۰ء میں کلکتہ مدرسہ (مدرسہ عالیہ) قائم کیا۔ وارن ہیسٹنگز ہندوستان میں عرصے سے مقیم تھا۔ وہ فارسی زبان پر پورا عبور رکھتا تھا اور مشرقی علوم والسنہ کا بڑا شیدا و دلدادہ تھا، چنانچہ وہ مشرقی علوم و فنون کا سرپرست بن گیا۔ اُن دنوں اتفاق سے کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں میں بھی ایک حلقہ ایسا تھا جو وارن ہیسٹنگز کے خیالات سے اتفاق کرتا تھا اور مشرقی علوم اور زبانوں سے گہری دلچسپی رکھتا تھا مثلاً سر ولیم جونز (Sir William Jones)، جج عدالت عالیہ کلکتہ سر چارلس ولکنس، ییتھنیل براسی ہیلڈ، سر جان شور جو بعد میں گورنر جنرل بنے، فرانسس گلیڈون، جان کارنک، جوناتھن ڈنکن اور ولیم چیمبرس وغیرہ۔ سر ولیم جونز ۱۷۸۳ء میں عدالت عالیہ کا جج ہو کر کلکتہ آیا۔ وہ عبرانی، یونانی، لاطینی، عربی، فارسی، فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی، جرمنی، ترکی، چینی اور سنسکرت زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔ ولیم جونز نے برصغیر پاک و ہند پہنچ کر پہلے ہی سال بنگال میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (Asiatic Society of Bengal) کی اس غرض سے بنیاد ڈالی کہ ایشیا کی تاریخ، علوم طبعی، آثار قدیمہ، فنون لطیفہ و دیگر علوم و فنون و ادب کے متعلق تحقیقات کی جائے۔ غرضیکہ وارن ہیسٹنگز، سر ولیم جونز اور کمپنی کے بیشتر حکام اسی مشرقی رو ذہنیت کے مالک تھے۔ اٹھارہویں صدی میں کمپنی کی انتظامی پالیسی پر انہی عناصر کا غلبہ تھا۔

جدید تعلیم، انگریزی زبان کی ترویج اور مسلمانوں کا رویہ:

کمپنی کی حکومت کے ابتدائی سالوں ہی میں وارن ہیسٹنگز اور ان کے ہم خیال "مستشرقین" کے مقابلے میں کمپنی کے حکام میں ایک حلقہ ان افراد کا بھی تھا جن میں چارلس گرانٹ (۱۷۴۶-۱۸۲۳ء) وغیرہ پیش پیش تھے جو ہندوستان کو انگریزی زبان و ادب اور ولایتی تہذیب کے ذریعے "مہذب" بنانے پر مصر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں برطانوی قوانین نافذ ہوں، یہاں کی سرکاری زبان انگریزی کر دی جائے اور اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی تعلیم دی جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے سنسکرت یا عربی میں غیر عیسائی مذہبی تعلیم کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی نہ ہونی چاہیے۔ اس ملک کی سماجی برائیوں اور اخلاقی خرابیوں کا علاج اور بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی جہالت و لاعلمی کا سدِّ باب جدید انگریزی تعلیم کی ترویج و اشاعت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ انگریز مسیحی پادری اور متاد انگریزی زبان و ادب اور جدید تعلیم کی اشاعت کے پر جوش حامی تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو مہذب بنانے اور مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اس ملک میں جدید تعلیم خصوصاً انگریزی زبان کی ترویج کو بہت اہم خیال کرتے تھے۔ چارلس گرانٹ نے عیسائی مشنریوں کی تبشیری سرگرمیوں

ں بھی بڑے زور سے تائید کی تھی۔ تاہم ابتدائی دور میں کمپنی کی حکومت سیاسی و انتظامی مصالح کے پیش نظر اس کے حق میں نہ تھی۔ ۱۸۱۳ء سے قبل کمپنی حکام نے مسیحی مشنوں کے قیام اور تبلیغی سرگرمیوں کی سرپرستی و پشت پناہی سے بھی گریز کیا تھا۔ بایں ہمہ انگلستان میں مسیحی مشنریوں کے دباؤ اور تحریک پر ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نئے چارٹر ایکٹ کی منظوری دی۔ اس ایکٹ کے رو سے کمپنی کی حکومت کو پابند کیا گیا کہ مقبوضہ ملک کی آمدنی کا کچھ حصہ (کم از کم ایک لاکھ روپیہ سالانہ) علم و ادب کے احیاء اور ترقی، ہندوستانی اہل علم کی حوصلہ افزائی اور برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں انگریزی زبان اور سائنس کی تعلیم کی ترویج و ترقی میں صرف کیا جائے گا۔ اس ایکٹ کے اجراء کے ساتھ ہی مسیحی مبشرین کو برعظیم پاک و ہند میں تبلیغی و تعلیمی سرگرمیوں کی اجازت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ مسیحی پادریوں اور مشنریوں نے مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بمبئی، مدراس اور بنگال کے علاوہ ملک کے دوسرے حصوں میں جگہ جگہ تبلیغی مشن قائم کیے، اسکول اور کالج کھولے۔ ان اسکولوں اور کالجوں کے قیام نے مسیحی مبشرین کو مسیحیت کے لیے کام کرنے میں بڑی مدد دی۔ پادری ان اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ مسیحیت کا پرچار بھی کرتے تھے اور طلبہ کو اپنا قدیم مذہب ترک کرکے حلقۂ بگوش مسیحیت ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ مشن اسکولوں میں بائبل کی کلاسوں میں حاضری لازمی تھی اور بچوں سے امتحان عیسائی مذہبی کتابوں سے بھی لیا جاتا تھا۔

مسیحی مبلغوں نے اپنے عزائم کو پردۂ راز میں نہیں رکھا انہوں نے ببانگ دہل یہ اعلان کردیا تھا کہ انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کی اشاعت کے نتیجے میں دیسی مذاہب (اسلام اور ہندومت) کی عمارتیں مسمار ہوجائیں گی۔ چنانچہ اس دور میں بالعموم یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بچے انگریزی پڑھنے کے بعد اپنے دین سے بیزار ہوجاتے ہیں اور مسیحیت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے مشن اسکولوں میں اپنے بچوں کا پڑھنا یا انگریزی سیکھنا گوارا نہیں کیا، بلکہ انگریزی پڑھنے کی سخت مخالفت کی اور مشن اسکولوں کی تعلیم مسترد کردی۔

مسیحی مبشرین کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے علاوہ ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کے بعد خود حکومت کی طرف سے قائم کردہ مجلس تعلیمات عامہ کے صدر لارڈ میکالے (Macaulay) نے فروری ۱۸۳۵ء میں حکومت کو جو لائحہ عمل تحریر کیا اس نے نظام تعلیم میں ایک نہایت انقلابی تبدیلی کی بنیاد فراہم کی۔ میکالے ایک طرف مشرقی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور دوسری جانب اہل ہند کو جہالت اور توہم پرستی سے نکال کر اس چیز کی برکات سے فائدہ پہنچانے پر آمادہ و کوشاں تھا جسے وہ اپنی اعلیٰ و برتر تہذیب سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے حکومت کو مشرقی علوم کی سرپرستی کو کلیتاً ترک کرکے اہل ہند کو انگریزی کے ذریعے جدید مغربی علوم کی تعلیم دینے کی سفارش پرزور انداز میں کی۔ میکالے کی اس تجویز پر عمل درآمد کے طور پر مارچ ۱۸۳۵ء میں گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک (William Bentinck، ۱۷۷۴-۱۸۳۹ء) نے ایک قرارداد جاری کی جس میں یہ طے کردیا گیا کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند کے اندر یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے چنانچہ

جس قدر رقم مقاصد تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہیے۔ آئندہ سرکاری روپیہ صرف انگریزی تعلیم (انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم) پر خرچ کیا جائے گا۔ مشرقی درس گاہوں میں زیر تعلیم طلباء کی مالی امداد نہ کی جائے گی۔ جس نظام تعلیم کی ترویج کا بیڑا اٹھایا، اُس میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا، چنانچہ مسلمانوں خصوصاً اُن کے علماء نے اُن کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا اور مخالفانہ رویہ اختیار کیا۔ کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۵ء کی تعلیمی قرارداد میں انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ اس قرارداد میں یہ طے کر دیا گیا کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند کے اندر یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے۔ چنانچہ جس قدر رقم مقصد تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہیے۔ آئندہ تمام رقومات دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے ذریعے علم و ادب اور سائنس کی اشاعت پر صرف کی جائیں۔ اس قرارداد کی رو سے مشرقی طلباء کو تعلیمی وظائف کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔[۱۶] ۱۸۳۵ء کی تعلیمی قرارداد نے تعلیم کا رخ قدیم مشرقی علوم سے موڑ کر مغربی علوم کی طرف پھیر دیا۔ ساتھ ہی مشرقی زبانوں پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دیا گیا جس سے مسلمانوں میں شدید ہیجان اور اضطراب پیدا ہوا۔ سید احمد خاں کے سوانح نگار الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ ''۱۸۳۵ء میں کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انہوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے''[۱۷] مسلمانوں کے یہ خدشات کچھ بے بنیاد بھی نہ تھے۔ لارڈ میکالے (Macaulay, Thomas Rabbington) نے جو نظام تعلیم ترتیب دیا تھا (۱۸۳۵ء) اُس کا مدعا و مقصد ایک ایسے طبقہ کی تخلیق تھا جو رنگ و خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق و میلانات، رائے، مزاج و اخلاق اور عقل و فکر کے نقطۂ نظر سے برطانوی (مغربی) ہو۔[۱۸] میکالے کے تجویز کردہ اس نظام تعلیم میں مسیحی تبشیری روح بھی پوری طرح سے سموئی ہوئی تھی۔ چنانچہ میکالے اور اُس کے ہم خیال انگریز حکام کو یقین تھا کہ انگریزی تعلیم پانے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایسی قلب ماہیت ہو جائے گی کہ وہ کبھی بھی اپنے قدیم مذاہب پر خلوص دل سے قائم نہیں رہ سکیں گے۔[۱۹]

یہ نظام تعلیم اپنی روح، مقاصد اور نتائج و اثرات کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتا تھا، اس امر کا اعتراف خود انگریز حکام نے بھی کیا۔ ۱۸۷۱ء/۱۸۷۲ء میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے انگریزی تعلیم کے نتائج و اثرات کے بارے میں لکھا کہ ''ہمارا نظام تعلیم جس نے ہندوؤں کو اُن کی صدیوں کی نیند سے جگایا اور اُن کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ جذبات پیدا کر دیے ہیں، مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور اُن کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق بلکہ اُن کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے۔[۲۰] ہمارے اینگلو انڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یہ نہیں نکلتا جو اپنے آباء و اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلتے پھولتے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے سخت حقائق کے مقابلہ میں آ جاتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل نے

علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے"[۳۰] انگریزی تعلیم نے برعظیم پاک و ہند کی نئی نسل کے ذہن و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کا اپنے قدیم مذاہب اور تہذیبی و معاشرتی اور اخلاقی اقدار سے ربط و تعلق کمزور پڑتا گیا حتیٰ کہ جدید تعلیمی اداروں میں تبدیلی مذہب کے واقعات پیش آنے لگے۔ ۱۸۵۲ء میں آگرہ اور خصوصاً دہلی کالج کے متعدد ہندو اساتذہ اور طلباء کے قبولِ مسیحیت کے واقعہ نے ایک بحران کی صورت اختیار کرلی۔ اکا دکا مسلمان بھی اپنے قدیم مذہب سے برگشتہ ہوکر حلقۂ بگوشِ مسیحیت ہوئے۔ اس امر نے دہلی اور آگرہ کے مسلمان علماء کو سخت تشویش اور اضطراب سے دوچار کیا[۳۱] غرضیکہ انگریزی تعلیم نئی نسل کے ذہنی و فکری ارتداد کا ایک مؤثر محرک بن گئی[۳۲] مسیحی مبشرین، حکام اور ان کے بہی خواہوں کو یقین تھا کہ انگریزی نظامِ تعلیم کے نتیجے میں اس ملک کی نئی نسل کی

بڑی تعداد اپنے قدیم مذاہب کو خیرباد کہہ کر عیسائیت کو اختیار کرے گی۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے، جسے مسیحی تبشیری سرگرمیوں سے بڑی ہمدردی رہی، اپنے خطبات میں پاک و ہند میں انگریزی تعلیم کے امید افزا اثرات و نتائج کا اظہار ان الفاظ میں کیا (مئی ۱۸۵۹ء):

انگریزی حکومت [تعلیم] سے لازماً ہندوستانی ادب پر قوی اثر پڑے گا۔ وہ صورت بدل کر آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہوجائے گا یعنی آدھا ہندوستانی اور آدھا انگریزی۔ انگریزی ترجمے اور انگریزی تقلید کی کثرت ہوجائے گی۔ بہت سے ہندوستانی عیسائی ہوجائیں گے اور ان کا خاص ہندی عیسائی ادب ہوگا"[۳۳]

موصوف نے اپنے ایک دوسرے خطبہ میں (دسمبر ۱۸۶۳ء) میں کہا:

ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر رواج بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے اصولِ مذہبی سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مذہبی اصول [مسیحیت] ہی ہمارے تہذیب و تمدن کا مآخذ ہیں۔ ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کو جو کامیابی ہورہی ہے اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں اور اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیے[۳۴]

غرضیکہ انگریزی تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ دونوں لازم و ملزوم ہوگئے تھے چنانچہ اس تعلیم سے مسلمانوں کی مخاصمت ایک فطری امر تھا۔ سرسید احمد خان جو ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں انگریزی زبان و ادب اور جدید علوم کی اشاعت کے سب سے بڑے داعی اور محرک بن کر سامنے آئے، انگریزی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کی نفرت و بے رغبتی کے اسباب و محرکات کے بارے میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے

مسلمانوں کا یہ خیال عام تھا کہ انگریز آہستہ آہستہ انھیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں اور ان کے اس شبہ کے لیے نہایت قوی بنیادیں موجود تھیں۔ یہ درست ہے کہ انگریزوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں اس طرح کی مداخلت کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ عیسائی مبلغین، پادری اور مشنری عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مامور ہوئے اور گورنمنٹ کی جانب سے انھیں حمایت حاصل ہوئی[۳۵] جدید تعلیم سے لوگ یوں ہی متنفر تھے کہ مشنری اسکول جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ ہندو اور مسلمان بچوں کو جو ان مدرسوں میں داخل ہوتے تھے عیسائیوں کے عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سرکا

کی طرف سے دیہاتی مکاتب قائم ہوئے تو لوگ یقین رکھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ عامۃ الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرسٹان [Christian] بنانے کو بٹھاتے ہیں۔ ہمارے لڑکے ان میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے۔" ٤٧

یوں تو کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے ملازمتوں کے مواقع محدود ہو گئے تھے لیکن ۱۸۳۵ء میں عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے اختیار کیے جانے پر بہت سے مسلمان جو معتدبہ قابلیت رکھتے تھے ملازمتوں سے یکایک محروم ہو گئے۔ مسلمان انگریزی زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر سرکاری محکموں میں چپڑاسی دفتری جیسی معمولی نوعیت کی ملازمتوں کے علاوہ دیگر تمام عہدوں کے لیے نااہل قرار پائے، جس سے ان کی معاشی حالت مزید ابتر ہو گئی ٤٨۔ ان حالات میں سرکاری ملازمتوں کے آرزومند مسلمانوں کے لیے انگریزی زبان سے واقفیت اور جدید تعلیم کا حصول ناگزیر ضرورت کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مسلمان بحیثیت مجموعی اب زیادہ دنوں تک جدید تعلیم سے بے اعتنائی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

انگریزی زبان کے بارے میں علماء کا ردِعمل ۱۸۵۷ء سے پہلے:

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) برعظیم پاک و ہند کے وہ پہلے عالم و فقیہ اور سیاسی مفکر تھے جنہوں نے انگریزی زبان کی تحصیل کے جواز میں فتویٰ دیا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام (۱۷۷۲ء) کے بعد جب سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں فارسی کی جگہ انگریزی نے لینا شروع کی خصوصاً ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے اجراء کے بعد جب ملک کے طول و عرض میں مسیحی مبشرین نے اسکول و کالج قائم کیے تو انھوں نے انگریزی زبان کی تحصیل و تعلیم سے متعلق رہنمائی کے لیے شاہ عبدالعزیز دہلوی سے رجوع کیا۔ شاہ صاحب نے ایک فتویٰ میں انگریزی یا کسی اور زبان کا سیکھنا یا کسی شعبۂ علم کو حاصل کرنا جائز قرار دیا بشرطیکہ اس کا مفید اور جائز استعمال مقصود ہو ٤٩۔ شاہ صاحب سے جب ان کے متبعین نے یہ سوال کیا کہ کیا "انگریزی کا پڑھنا جائز ہے؟" تو انہوں نے فرمایا

"انگریزی کو اس لیے پڑھنا کہ انسان کتابیں پڑھ سکے، خط لکھ سکے اور الفاظ کے حقیقی معنوں کو معلوم کر سکے، جائز ہے کیونکہ حضرت زید ابن ثابتؓ نے رسول کریمؐ کے حکم سے یہود اور نصاریٰ کی زبان اور لغت پڑھی تھی تاکہ وہ ان خطوط کا جواب لکھ سکیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود اور نصاریٰ کی طرف سے آتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص انگریزی زبان کو اس لیے پڑھتا ہے کہ اس سے عیش و عشرت حاصل ہو یا انگریزوں کا تقرب اور خوشنودی حاصل ہو تو یہ حرمت و کراہت میں داخل ہے۔" ٥٠

اس فتویٰ سے مترشح ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز لکھنے پڑھنے کی غرض سے انگریزی زبان کے سیکھنے کو جائز سمجھتے تھے مگر انگریزوں کی قربت یا ان کی ملازمت کی غرض سے اس کی تحصیل کو ناپسندیدہ و حرام خیال کرتے تھے ٥١۔ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے انگریز حکام شاہ صاحب کے ہاں حاضر ہوتے اور اسلام کے بارے میں ان سے

معلومات حاصل کرتے رہے[2]۔ دہلی کا مشہور خاندان جو دہلی کے علمی اور انتظامی امور میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ شاہ صاحب کا عقیدت مند تھا[3]۔ متعدد دیگر حکام بھی شاہ صاحب کی صحبت میں رہے۔ چند ایک نے اُن سے کچھ پڑھا بھی تھا[4]۔ انگریزوں سے روابط کے سبب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کو انگریزی میں شد بد پیدا ہو گئی ہوگی۔ البتہ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے خود عبرانی زبان کے ایک فاضل سے، جو اُن کے زمانہ میں دہلی آگیا تھا، عبرانی سیکھی تھی اور براہ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اُس فاضل سے پڑھی۔ حالانکہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی[5]۔

بہتہ انگریزی زبان کی تحصیل کے بارے میں شاہ عبدالعزیز کے مذکورہ فتویٰ کی اشاعت کے باوجود مسلمانوں کا سواد اعظم انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم کی تحصیل سے گریزاں ہی رہا۔ مسلمانوں نے جدید نظام تعلیم سے فائدہ اس لیے نہیں اٹھایا کہ وہ اسے اپنے مذہب اور تہذیب و معاشرت کے لیے خطرناک تصور کرتے تھے۔ سرسید احمد خان کے رفقاء میں سے مولوی نذیر احمد دہلوی (۱۸۳۰-۱۹۱۲ء) کو دہلی کالج کے شعبہ علوم شرقیہ میں تعلیم کے دنوں (۱۸۴۶-۱۸۵۳ء) میں انگریزی کی اہمیت اور قدر و قیمت کا شدید احساس پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے انگریزی بھی پڑھنا چاہی اور اپنے والد مولوی سعادت علی، جو نہایت متدین اور متقی آدمی تھے، سے اجازت حاصل کرنے کے لیے پرنسپل کے ذریعے سفارش کرائی لیکن والد کے سخت انکار سے مجبور ہو گئے۔ مولوی نذیر احمد اپنے ایک خطبہ (لیکچر) میں کہتے ہیں "دلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول، مگر انگریزی پڑھانا گوارا نہیں"[6]۔ تاہم بعد میں انہوں نے ذاتی کوشش سے انگریزی میں مہارت حاصل کی۔

تحریک ردِ عیسائیت اور انگریزی زبان کے ماہر علماء ۱۸۵۷ء سے پہلے:

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے انیسویں صدی کے نصف اوّل میں ملک کے شہری اور دیہی علاقوں میں مسیحی سرگرمیوں کا جال پھیلانے کے لیے بہت بڑی تعداد میں مسیحی مناد/مبشرین برِعظیم پاک و ہند آئے۔ ان لوگوں نے محض اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بالعموم تمام ہندوستانی مذاہب اور بالخصوص اسلام اور پیغمبر اسلام کو ہدف بنایا، اسلامی تعلیمات اور تہذیب کی مذمت کی، منظم اسکیم کے تحت ایسی کتابیں شائع کی گئیں جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ یہ تنگ نظری ناآشنا مسیحی مبشرین کے اس تصور پر مبنی تھی کہ اس وقت چونکہ مسلمان سیاسی زوال کے باعث پست ہمتی کا شکار تھے، لہٰذا مسیحیت کے "مضبوط" پہلو اجاگر کرنے اور اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی "کمزوریاں" گنانے سے مسلمان اپنے مذہب کو خیرباد کہہ دیں گے اور حلقہ مسیحیت میں داخل ہو جائیں گے اور انگریز ہندوستان پر بلا روک ٹوک حکمرانی کر سکیں گے[7]۔

دریں حالات وہ علماء جو مسیحی مبشرین اور پادریوں کے مقابلہ کے لیے میدان میں اترے تھے انہیں دیسی پیٹ سے بے انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں سے واقفیت کی ضرورت و اہمیت محسوس ہوئی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی

(۱۲۳۳-۱۳۰۸ھ/۱۸۱۷-۱۸۹۳ء) جب مسیحی مبشرین کے مقابلہ کے لیے میدان میں اُترے تو انھیں عدم مخالف خیالات پر مسیحی و سورتی مقدس کتب کی تعلیمات سے براست طور پر آگاہی کے لیے ڈاکٹر محمد وزیر خان (م ۱۸۷۲-۱۸۷۳ء) کی حمایت درکار ہوئی [8]۔ ڈاکٹر وزیر خان طب و جراحت کی جدید تعلیم کے سلسلہ میں کئی سال انگلستان میں گزار چکے تھے۔ جہاں انہوں نے ذاتی محنت سے انگریزی کے علاوہ لاطینی اور عبرانی زبانوں میں مہارت پیدا کی تھی اور عیسائیت و یہودیت کا اصل ماخذ سے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ ہندوستان واپسی پر وہ یہودیت و مسیحیت سے متعلق انگریزی یونانی اور عبرانی کتب کا ایک وقیع ذخیرہ ہمراہ لائے تھے۔ آگرہ میں قیام و ملازمت کے دوران میں وہ مسیحی مبشرین کے مقابلہ اور اسلام کی تائید و نصرت اور اس کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر وزیر خان ہی کی دعوت و تحریک پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی مطالعہ و تردید عیسائیت کی طرف راغب ہوئے [9]۔ ڈاکٹر صاحب مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے علمی و تصنیفی کاموں میں ان کے شریک و معاون تھے۔ دونوں نے آگرہ کے تاریخی مناظرہ (۱۸۵۴ء) میں حصہ لیا اور مغربی پادری کارل فانڈر (Carl Gott eb Pfandar، ۱۸۰۳-۱۸۶۸ء) کو شکست فاش دی [10]۔

نامور مناظر مولانا سید ناصر الدین ابو المنصور دہلوی (۱۸۲۳-۱۹۰۳ء)، جو عمر بھر ردِّ عیسائیت میں ہمہ تن تصنیف و تالیف نیز تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ آپ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے، نیز عبرانی و یونانی کے بھی ماہر تھے انہوں نے توریت اور عبرانی و یونانی زبانیں علمائے اہل کتاب سے پڑھیں [11]۔

سید احمد خان اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے اس حقیقت کو عالم آشکار کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی قوت و اقتدار کا خاتمہ اور مسلم اقتدار کا احیاء کسی طور سے ممکن نہیں رہا اور لامحالہ طور پر اب ان کو اپنی معاشی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی حالت کی اصلاح برطانوی اقتدار کے تحت زندگی گزارتے ہوئے کرنا ہوگی۔ لہٰذا اب ان کی معاشی اور سیاسی زندگی کی بہتری کا راستہ یہی ہے کہ وہ انگریزی زبان اور جدید تعلیم میں استعداد و لیاقت اعلیٰ درجہ کی پیدا کریں۔

سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے، جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان کی حالت زار کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے تھے، اس حقیقت کو پالیا تھا کہ مسلمانوں کی پس ماندگی و بدحالی کا مداوا جدید تعلیم اور خصوص انگریزی زبان کی تحصیل کے بغیر کسی طور پر ممکن نہیں۔ سرسید احمد خاں کی رائے یہ ٹھہری تھی کہ "مسلمانوں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن میں انگریزی تعلیم پھیلائی جائے۔ اس دریا کو طے کیے بغیر مسلمانوں کی بھلائی کی تدبیریں فضول اور بے کار ثابت ہوں گی" [12]۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان و ادب اور جدید مغربی علوم کی تحصیل کی دعوت بڑے جوش و جذبے سے دی۔ وہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے لوگوں کو انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ذہن نشین کراتے رہے [13]۔ سرسید کا نظریہ یہ تھا کہ "ہم [مسلمان] جو کچھ ترقی کر سکتے ہیں انگریزی

زبان کے ذریعے سے کر سکتے ہیں کیونکہ ہماری حکمران زبان انگریزی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم صرف انگریزی ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اُس زبان میں نہ آ گیا ہو جو اُس ملک پر حکمران ہے۔ ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے انگریزی زبان ہے اس لیے اس ملک میں ورنیکلر زبان کے ذریعے کسی علم کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمراں قوم کی نہ ہو، کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔ اس لیے لازم ہو گیا ہے کہ ہم اسی زبان میں جدید علوم کو حاصل کریں"[۵۵]

سرسید نے بہانگ دہل یہ اعلان کیا کہ

ہمیں اپنی قوم کو انگریزی زبان کی، جس کو خدا نے اپنی مرضی سے ہم پر حکومت دی ہے اور جس کو چاہے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے بلکہ میں کہوں گا کہ دین کی بھی خدمت نہیں کر سکتے، تعلیم دینا ہے[۵۶]۔ ہم اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ اُن کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا ہونا چاہیے[۵۷]۔ ہمارے لیے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں"[۵۸]۔

غرضیکہ سرسید نے انگریزی زبان کی تحصیل اور جدید مغربی علوم کی تعلیم کی وکالت زور دار انداز میں کی۔ انہوں نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ اس سلسلہ کا اہم ترین اقدام علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (۱۸۷۵ء) اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام تھا (۱۸۷۸ء)۔ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں[۵۹]۔ محمڈن کالج کی تعلیمی اسکیم میں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کو مرکزی حیثیت دی گئی تھی کیونکہ اس کے قیام کا بڑا مقصد ہی مسلمان طلباء میں انگریزی زبان کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت و استعداد پیدا کرنا تھا[۶۰]۔ انگریزی زبان و ادب چونکہ یورپ کی تہذیب و معاشرت، اس کے اقدار حیات اور نظام افکار کی ترجمان تھی، چنانچہ اُس نے علی گڑھ میں زیر تعلیم نوخیز نسل کے ذہنوں میں لادینیت (secularism) اور مغربیت/تغرب زدگی (Westernization) کے رجحانات کی افزائش کی[۶۱]۔ پھر بانیٔ تحریک سرسید نے صرف اپنی فتح مند اور حاکم قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اس قوم کی تہذیب و طرز معاشرت اور عادات و اطوار کی تقلید کی دعوت بھی بڑے جوش و جذبے سے دی۔ وہ اس سلسلہ میں اپنے ایک مضمون "ورنیکلر یعنی ہماری زبان" میں لکھتے ہیں

قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرے اپنے فتح مندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتح مندوں نے کاملیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت

کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ نہیں ہے"[۲]

سرسید نے کالج میں یورپین اسٹاف کے تقرر کا محرک بھی یہی بتایا کہ وہ طلباء کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھائیں، انگلش نیشن کی محبت اور وقعت ان کے دل میں پیدا کریں۔ سرسید کا خیال یہ تھا کہ حاکم قوم کی تہذیب و طرزِ معاشرت اختیار کرنے سے حکام کی نظر میں مسلمانوں کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی[۳]۔ چنانچہ سرسید کے دور میں اور اس کے بعد بھی انگریزی اسٹاف کو پالیسی سازی کے علاوہ کالج کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑی اہم حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ انگریزی اسٹاف نے طلباء کو انگریزی زبان و ادب کے علاوہ مغربی تہذیب و معاشرت اور افکار و خیالات کا شیفتہ و دلدادہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا[۴]۔ چنانچہ اس دور میں طلباء کا طرزِ فکر خالصتاً مغربی ہوگیا۔ انگریزی تعلیم کی تحصیل اور مغربی تہذیب و طرزِ معاشرت کی تقلید کے بارے میں سرسید احمد خان کے طرزِ فکر و عمل اور اس کے اثرات و نتائج کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کا یہ تبصرہ بڑا موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے

سرسید مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ بغیر کسی تنقید و ترمیم کے ساتھ اختیار کرلینے کے داعی تھے۔ سرسید نے شخصی طور پر انگریزی تہذیب اور طرزِ معاشرت کو اختیار کیا اور دوسروں کو بھی بڑی گرم جوشی اور قوت کے ساتھ اس کی دعوت دی[۵]۔ انہوں نے مغربی نظامِ تعلیم کو اس کی ساری تفصیلات، خصوصیات اور اس کی روح و مزاج کے ساتھ درآمد کیا۔ انہوں نے صرف مغرب کے تعلیمی نظام ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ مغربی تمدن [تہذیب] اور روح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا۔ غرضیکہ سرسید کی دعوت اور تعلیمی نظریہ مغربی تہذیب کی دعوت کے ساتھ لازم و ملزوم سا ہوگیا۔ انگریزی تعلیم اور انگریز پروفیسروں اور پرنسپل کے غیر محدود اثر و نفوذ کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کے منتخب اور ذہین نوجوان، جو اس کالج میں زیرِ تعلیم تھے، انگریزی معاشرت و تہذیب سے متاثر و مرعوب ہوئے۔ ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا، ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت و تمدن میں انگریزی طور و طریق کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل"[۶]

علماء کا ردِ عمل ۱۸۵۷ء کے بعد:

۱۸۵۷ء سے قبل ان چند استثنائی مثالوں کے علاوہ علماء کا سوادِ اعظم انگریزی زبان اور جدید مغربی تعلیم سے لاتعلق ہی رہا۔ سرسید ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات نے انگریزی زبان اور جدید تعلیم سے علماء کی لاتعلقی و بے اعتنائی میں مزید اضافہ کردیا۔

انگریزوں نے جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد عام مسلمانوں اور بالخصوص علماء کو بدترین انتقام کا نشانہ بنایا تھا۔ بڑی تعداد میں علماء کو ملکۂ معظمہ برطانیہ کی حکومت کے خلاف ''بغاوت'' کے الزام میں پھانسیوں پر چڑھایا گیا، ہزاروں کو عمر قید اور

جلاوطنی (جزائر انڈمان کی طرف) کی سزا دی گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں مساجد، مدارس اور خانقاہوں کو مسمار اور نذرِ آتش کیا گیا۔ ان حالات و واقعات کے سبب انگریزی حکومت ہی نہیں بلکہ ان کی تہذیب و معاشرت، اُن کی قومی زبان اور تعلیم سے نفرت کا علماء کے دلوں میں پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ علماء انگریزی حکومت کو ایسے ایک جارح و غاصب دشمن طاقت کے طور پر دیکھتے تھے، جو سیاسی و عسکری تسلط کے بعد مسلمانوں پر اپنی تہذیب و طرزِ معاشرت اور اپنے مذہب (عیسائیت) کو بزورِ شمشیر مسلط کرنے کے درپے تھی۔ چنانچہ علماء نے بالعموم مغربی تہذیب کی یلغار سے شکست خوردہ و شکستہ حال مسلم قوم کو بچانے کے لیے انگریزی زبان اور جدید علوم کے مکمل استرداد کا راستہ اختیار کیا۔ بعض علماء ایسے بھی تھے جنھوں نے انگریزی زبان اور جدید تعلیم کے خلاف سخت مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ وہ انگریزی تعلیم کو مسلم قوم پر فاتح قوم کے مذہب اور اس کی تہذیب و معاشرت کے تسلط کا حربہ خیال کرتے ہوئے ازروئے اسلام ناجائز و حرام بیان کرتے تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس صورتِ حال پر یوں تبصرہ کیا ہے:

ذرا سوچیے کہ غم و غصہ، بے زاری اور دل افگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسی اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کرکے غلام بنالیا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے زمین پر پٹک دیے گئے تھے۔ ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہیے تھا، قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، فطرتاً اس سے مسلمان بھڑکتے تھے، بلکہ چڑھتے تھے۔ انگریزی مدرسے اور ان مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ براندام ہوجاتے تھے۔ "جو انگریزی پڑھے گا وہ کافر ہوجائے گا"، مولویوں کی طرف اس تکفیری لطیفہ کو مسخروں نے جو منسوب کررکھا ہے بجائے خود افتراء و بہتان کی یہ جتنی بھی شرمناک مثال ہو، لیکن اس کا شاید انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی آبادیوں کی فضا کچھ اسی قسم کی صداؤں سے معمور ضرور تھی۔ کس نے فتویٰ دیا؟ کب دیا؟ ان سوالوں سے بے تعلق ہوکر کچھ کہنے والے اسی قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، اور اسی نوعیت کے چرچے عموماً پھیلے ہوئے تھے"[۸]

انگریزی زبان، جدید تعلیم اور تہذیب و معاشرت سے علماء کی شدید نفرت کی مثالیں بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ممتاز عالم مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی (۱۸۲۱-۱۸۸۹ء)، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں لکھنؤ کے محاذ پر انگریزوں کے خلاف جنگ میں سرگرم حصہ لیا تھا[۹] انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور اس سے میل ملاقات کے قطعی روادار نہ تھے۔ چیف کمشنر اودھ نے ان سے ملنے کی خواہش کی تو انھوں نے ملنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے اپنے خطبات اور تقریروں میں یورپی آداب، عادات و اطوار کی تقلید و نقالی کی پُرزور انداز میں مخالفت کی۔ جب برطانوی حکومت کی طرف سے مولانا عبدالرزاق کو شمس العلماء کے خطاب کے عطا کیے جانے کا اعلان کیا گیا تو وہ اپنے گھر میں خلوت نشین ہوگئے اور اپنے بیٹوں سے کہہ دیا کہ وہ اس خطاب کو واپس کردیں۔ مولانا عبدالرزاق نے وقتی طور انگریزی مصنوعات کے استعمال اور ریل سے سفر سے اجتناب کیا۔ چنانچہ اس دور میں علماءِ فرنگی محل انگریز حکام سے کسی قسم کی راہ و رسم سے بالکل الگ رہے انھوں نے سرکاری ملازمتوں، امدادوں اور اعزازات حاصل کرنے سے انکار کردیا[۱۰]

انگریزی زبان اور مغربی تہذیب کے خلاف سخت مزاحمت کی ایک دلچسپ مثال ممتاز عالم دین مولانا محمد داؤد غزنوی (۱۸۹۹–۱۹۶۳ء) کے والد گرامی حافظ محمد اسماعیل (م ۱۹۲۳ء)، جو بڑے عالم اور محدث تھے، کی ہے۔ حافظ محمد اسماعیل نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ لفظ ٹماٹر جو شاید انگریزی لفظ (Tomato) کی بدلی شکل تھی، کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، اور اگر کوئی یہ لفظ بولتا تو اُس پر ناخوشی کا اظہار کرتے تھے۔ وہ اس کو نصرانیت کی علامت خیال کرتے تھے۔ حافظ محمد اسماعیل ٹماٹر کو لال بینگن کے نام سے پکارتے تھے[11]۔

جن علماء نے بڑی شدت کے ساتھ مغربی اثرات کے خلاف مزاحمت کی اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھنے کی سعی کی، اس سعی میں انہوں نے مغرب کی مثبت چیزوں کو بھی روکا، انہوں نے یہ سب کچھ محض مسلمانوں کو محض مغربی شرارت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے نہیں کیا تھا، بلکہ مسلم عوام کو مغرب کی تہذیبی یلغار سے محفوظ رکھنے اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے تحفظ و دفاع کی غرض سے کیا تھا۔

بایں ہمہ اس دور میں بھی جبکہ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں اور بالخصوص علماء کے جذبات بڑے سخت تھے، علماء کے انگریزی زبان سیکھنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری (۱۸۳۸–۱۹۰۵ء) پر، جو سید احمد شہید کی تحریک جہاد (تحریک مجاہدین) کے خاص اراکین میں سے تھے، ۱۸۶۴ء میں حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کے الزام میں مقدمہ چلا (مقدمہ انبالہ) اور ضبطی جائداد اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی[12]۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے جزائر

انڈمان میں قید کے دوران میں ایک شخص رام سروپ سے انگریزی پڑھی اور اس زبان میں لکھنے پڑھنے اور بولنے میں خاص مہارت حاصل کرلی۔ مولانا محمد جعفر فرصت کے اوقات میں انگریزوں کو فارسی، اردو اور ناگری زبانیں سکھایا کرتے تھے۔ انگریزوں سے باہمی ربط و ضبط رکھنے اور ترجمہ و مشق کی وجہ سے انگریزی کی استعداد خاصی پختہ ہوگئی جہاں تک کہ وہ انگریزی میں عرضی اور اپیل لکھنے لگے۔ جزائر انڈمان میں ان کے سوا کوئی دوسرا مسلمان انگریزی خواں نہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے مقدمات میں بڑی مدد کی یہاں تک کہ بعض کی پھانسیاں تک منسوخ ہوئیں۔ انگریزی جاننے کی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کی گراں قدر خدمات انجام دیں[13]۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری نے انگریزی زبان کی اہمیت کے بارے میں اپنی سرگزشت تواریخ عجیب میں لکھا ہے:

انگریزی زبان علم اور فنون کا گھر ہے جو انگریزی نہیں جانتا وہ بلاشبہ دنیا کے حالات سے ماہر نہیں اور بے انگریزی سیکھے پکا دنیادار اور طرحدار نہیں ہوسکتا اور نہ سوائے اس زبان کے آج کل کوئی آلہ روزگار کا ہے[14]۔

علمائے اہل حدیث کے سرخیل شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی (۱۸۰۵ء–۱۹۰۲ء) وہ سربرآوردہ عالم تھے جنہوں نے اپنے فتاوی میں بغرض حصول معاش و دفع حاجت کے انگریزی زبان پڑھنے (کی تحصیل) کو جائز قرار دیا[15]۔ میاں سید نذیر حسین کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری کے بیان کے مطابق انگریزی تعلیم جب فقر حیوانی جاتی تھی تو

میاں صاحب "اس تحصیل علم کو جائز کہتے تھے، سرکاری نوکری جب حرام خیال کی جاتی تھی تو میاں صاحب اس کمائی کو حلال کہتے تھے" [۲۶]

دینی تعلیم کا نظام اور انگریزی زبان:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علماء نئے عزم کے ساتھ اسلامی دینی روایت کے تحفظ، اسلامی و عربی علوم کی تعلیم و تدریس اور تبلیغ دین کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس غرض سے انہوں نے نئی درسگاہیں قائم کیں جن میں دارالعلوم دیوبند، مدرسہ احمدیہ آرہ (ضلع شاہ آباد، صوبہ بہار) اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں علماء فرنگی محل نے بھی اقتضائے زمانہ کے مطابق اپنے مدرسہ (مدرسۂ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ) میں دینی تعلیم کے نظام کو ازسر نو ترتیب دینے کی سعی کی۔ دارالعلوم دیوبند میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم سے مکمل طور پر اعراض کیا گیا۔ البتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے روایتی عربی و اسلامی علوم کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم کو بھی اس کے نصاب کا جزو بنایا۔ علماء فرنگی محل نے بھی مدرسہ عالیہ نظامیہ میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سطور ذیل میں انگریزی زبان کی تعلیم کے بارے میں ان درس گاہوں کے بانیوں اور منتظمین کے طرز فکر کا جائزہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند:

دیوبند-ضلع سہارن پور (اترپردیش-ہندوستان) کا ایک تاریخی قصبہ ہے جہاں ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو چند مقامی اہل اخلاص نے پرانی "چھتہ مسجد" میں معمولی وسائل سے ایک دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا۔ مولانا ملا محمود دیوبندی کو جو بلند پایہ عالم تھے، مدرس مقرر کیا گیا، جبکہ مولانا محمود حسن دارالعلوم کے وہ اولین شاگرد تھے جنہوں نے استاد کے سامنے کتاب کھولی [۲۷]۔ جلد ہی مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/۱۸۳۲-۱۸۸۰ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) جیسے مدرسین و منتظمین کی مساعی کی بدولت یہ دارالعلوم ایک تحریک بن گیا۔
دارالعلوم کے ان بانیوں نے ملا قطب الدین سہالوی (م ۱۱۰۳ھ) کے مرتب کردہ تعلیمی نصاب "درس نظامیہ" کو اس دارالعلوم میں جاری کیا (۱۸۶۹ء) البتہ تعلیمی دورانیہ دس سال سے کم کر کے چھ سال کیا گیا۔ اس کے نصاب میں انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون جگہ نہ پا سکے۔ البتہ دارالعلوم کے بانیوں نے اگر انگریزی زبان اور جدید علوم کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی مخالفت بھی نہیں کی [۲۸]۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جنہیں بالعموم دارالعلوم دیوبند کا بانی کہا جاتا ہے انگریزی تعلیم کی مخالفت نہیں کی لیکن انہوں نے اپنے تعلیمی پروگرام میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم کو کوئی جگہ بھی نہیں دی۔ مولانا کا خیال تھا کہ "انگریزی علوم کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل ہے اس کے برعکس مسلمانوں نے دینی

علوم سرکاری سرپرستی سے محروم ہیں، اگر انہیں سہارا نہ دیا گیا تو مسلمانوں کا اپنے ماضی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ لہٰذا علامت جن علوم کی سرپرستی کررہی ہے ان کو تو حکومت کے سپرد رکھا جائے لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے، اور نئی حکومت مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے نہ صرف دست بردار ہی نہیں ہوگئی ہے بلکہ نئی علامت نے پیدا کیے ہوئے ماحول میں رجوں حالی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں ان علوم کے حیاء و بقا کا نظام مسلم عوام کی مالی امداد سے کیا جائے۔"[19] مولانا محمد قاسم انگریزی تعلیم کی ضرورت و اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے بلکہ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر طلبہ دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کے بعد سرکاری مدارس میں جاکر جدید علوم کو حاصل کریں تو یہ بات ان کے لیے زیادہ مفید ہوگی۔ مولانا نے ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ/۹ جنوری ۱۸۷۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا:

اس کے بعد (یعنی دارالعلوم کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو اُن کے کمالات میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی"[20]

مولانا محمد قاسم کے اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بقول سید مناظر احسن گیلانی، "انگریزی مدارس میں داخل ہوکر تعلیم پانے کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں بلکہ اعلان فرمارہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہوکر علوم جدیدہ کی تعلیم علمی کمالات کے چکانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لیے معید ثابت ہوگی"[21]

مولانا محمد قاسم غیرمسلموں میں دعوت و تبلیغ اسلام کی غرض سے انگریزی زبان کی تحصیل کو ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس زمانہ میں مغربی زبانوں کو سیکھ کر اسلام کی خدمت کا موقع زیادہ مل سکتا تھا۔ خاص اس مقصد سے انہوں نے خود بھی زندگی کے آخری دور میں انگریزی زبان سیکھنے کا قطعی ارادہ کیا تھا۔ اُن کے سوانح نگار مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم آخری حج میں جب تشریف لے گئے تو کپتان جہاز سے، جو کوئی اطالوی باشندہ تھا، کیک انگریزی خواں مسلمان کے ذریعے سے مذہبی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ مولانا کی گفتگو سے کپتان متاثر ہو اور اُس نے مولانا سے عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ "اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم پر اتنا اثر ہوا کہ آپ نے جہاز پر ہی عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا۔ کیونکہ مولانا کو محسوس ہورہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا ترجمانی کے ذریعے وہ بات حاصل نہیں ہوئی تھی"[22] چنانچہ دوسروں تک دین کی دعوت پہنچانے کے لیے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی مولانا قاسم نے اپنے دینی مجاہدات کی فہرست میں شامل کرلیا تھا لیکن حج سے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی"[23] بقول مولانا مناظر احسن گیلانی، اگر "یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا"[24] مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جانشین مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹ء-۱۹۰۵ء) نے انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قرار دیا۔ انہوں نے ایک سوال/مسئلہ "انگریزی پڑھنا اور پڑھانا درست ہے یا نہیں؟" کے جواب میں فرمایا

انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آوے۔"[۵]

گو کہ مولانا رشید احمد نے انگریزی سیکھنے کو مشروط طور پر جائز قرار دیا تاہم ان کے دور میں بھی دارالعلوم دیوبند میں انگریزی کی بابت کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) کے بیان کے مطابق "مولانا رشید احمد گنگوہی مدرسے کے صدر تھے۔ ان کی رائے ہے اس کی بڑی ساکھ تھی اور وہ انگریزی زبان کی تعلیم اور انگریزی طور پر طریقوں سے سخت متنفر تھے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ انگریزی زبان پڑھنے سے دل اور دماغ اسلام سے دور ہو جائیں گے۔ مولانا گنگوہی کو پرانی وضع سے بڑی دل بستگی تھی اور اس میں وہ کسی تبدیلی کے روادار نہ تھے"[۶]۔ البتہ مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) کے دورِ صدارت (۱۹۰۵-۱۹۲۰ء) میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی اس تجویز کہ "مدرسہ ہٰذا دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں بات بیہودہ مؤید ثابت ہوگی"[۷] پر عملدرآمد کے کچھ امکانات پیدا ہوئے۔

۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دستار بندی کے لیے جو تاریخی اجتماع دارالعلوم میں منعقد ہوا تھا، اس میں علی گڑھ سے وفد صاحبزادہ آفتاب احمد خان (۱۸۶۷-۱۹۳۰ء)، جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے (۱۹۲۴-۱۹۲۶ء) کی قیادت میں شریک ہوا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد نے اس موقع پر تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علی گڑھ میں انگریزی پڑھنے جایا کریں اور علی گڑھ کے گریجویٹ عربی پڑھنے کے لیے دیوبند آیا کریں[۸]۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور اس کے مطابق علی گڑھ کے چند ایک گریجویٹ دارالعلوم دیوبند آ کر شریک بھی ہوئے، لیکن یہ عمل نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ ناظم جمعیۃ العلماء مولانا سید محمد میاں نے لکھا ہے:

یہ تجویز نہایت مبارک خیال کی گئی مگر اس کا ثمرہ نہایت تلخ تھا، یعنی پہلی مرتبہ جو علی گڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لیے آئے وہ انگریز کے سی آئی ڈی تھے، جنہوں نے حضرت شیخ الہند [مولانا محمود حسن] کو گرفتار کرنے میں وطن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کر کے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کا عہدہ حاصل کیا"[۹]۔

گرچہ دارالعلوم میں چند ایک گریجویٹ حضرات شریک کر لیے گئے لیکن علی گڑھ میں دارالعلوم دیوبند سے کسی کو شریک کرنے کی کوئی صورت عملاً پیش نہ آ سکی[۱۰]۔ یوں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کو انگریزی پڑھانے سے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد کی تجویز بروئے کار نہ آ سکی اور فاضلین دارالعلوم دیوبند کو اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد جدید علوم اور نئی زبانوں سے کی تحصیل کا موقع فراہم نہ ہو سکا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں "تقریباً ایک صدی کی تاریخ میں کوئی ایک نمونہ بھی دارالعلوم دیوبند پیش نہ کر سکا"[۱۱]۔

غرضیکہ علماءِ دیوبند انگریزی زبان سے بے اعتنائی کی روش پر ہی گامزن رہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ (علماء) انگریزی زبان کو فرنگیت و مغربیت کی اشاعت کا ایک بڑا طاقتور اور مؤثر ذریعہ خیال کرتے تھے۔ انگریزی زبان اُن کے نزدیک مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ملحدانہ افکار و خیالات اور غیر اسلامی مغربی تہذیب و

معاشرت کی تقلید و نقالی اور انگریز حکمرانوں کی فرمانبرداری و غلامانہ اطاعت کیشی کے رجحان و میلان کی ہر انگیز کا محرک بن رہی تھی۔ سر سید احمد خان نے مسلمان قوم کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید و نقالی اور انگریز حکمرانوں کی اطاعت کیشی کی دعوت جس جوش و جذبے سے دی تھی، اور علی گڑھ کالج میں جو تعلیمی اسکیم جاری کی تھی اس کے نتیجے میں ایک مغرب زدہ طبقہ وجود میں آیا تھا۔ جس نے مذہب سے بے اعتنائی ہی نہیں بلکہ اس کے استخفاف و استہزاء کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ مغربی تہذیب کی مسلم عوام اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقے میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان علماء نے دفاعی پوزیشن اختیار کی۔ انہوں نے، بقول سید ابوالحسن علی ندوی، "اسلامی طرز معاشرت کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار رہ گئے تھے، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں انگریزی تعلیم سے بے اعتنائی ہی کو اپنی حکمت عملی کا جزو ٹھہرالیا" [۸۲]۔ مولانا محمود حسن نے، جو دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان خلیج کو کم کرنے کے خیال کے پرجوش مؤید تھے، انگریزی زبان سے اپنے اکابر سلف کی بے اعتنائی کا اہم سبب انہی امور کو قرار دیا ہے۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اجلاس تاسیس (منعقدہ علی گڑھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء) کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں۔ لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔ اب از راہ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے" [۸۳]۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کی سرپرستی کے دنوں میں دارالعلوم کی شوریٰ کے اجلاس میں ۱۳۲۱ھ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ جو طلباء کو جو کم از کم انٹرنس پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہیں ان کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ کے وظائف دیے جائیں، اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلبہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے بھی وظائف مقرر کیے جانے کی ضرورت ہے۔ روداد کے الفاظ یہ ہیں کہ "دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لیے بہت سے فوائد ہیں۔" افسوس

ہے کہ اس ملک میں عملیات نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا [۵۴]۔

فتاویٰ علماءِ دیوبند:

انگریزی زبان کی تحصیل سے متعلق علماءِ دیوبند کے متعدد فتاویٰ بھی ملتے ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتویٰ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے ایک ممتاز رکن مولانا محمد اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء - ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) ہے، جن کا شمار دیوبند مکتبِ فکر کے مقتدر علماء میں سے ہوتا ہے اس بارے میں متعدد فتاویٰ جاری کیے جو اُن کے فتاویٰ کے مجموعہ امداد الفتاویٰ میں شامل ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے (فتویٰ) کے مطابق

انگریزی مثل اور زبانوں کے ایک مباح زبان ہے مگر تین عوارض سے اس میں خرابی آجاتی ہے۔ اول بعض علوم اس میں ایسے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں اور [عامۃ الناس کی] علم شریعت سے واقفیت ہوتی نہیں اس لیے عقائد خلاف ہو جاتے ہیں جن میں سے بعض عقائد قریب کفر بلکہ کفر ہیں۔ دوسرے ایسے علوم کی بھی نوبت نہ آئے تو اکثر صحبت بددینوں کی رہتی ہے ان کی بددینی کا اثر اس شخص پر آجاتا ہے کبھی اعتقاداً جس کا حکم اوپر معلوم ہو چکا کبھی عملاً جس سے نوبت فسق کی آجاتی ہے۔ تیسرے اگر صحبت بھی خراب نہ ہو یا وہ موثر نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یہ نیت رہتی ہے کہ اس کو ذریعہ معاش بنا دیں گے خواہ طریقہ معاش حلال ہو یا حرام۔ ان عوارض ثلاثہ کی وجہ سے گاہے کفر و الحاد تک، گاہے فسق ظاہری تک، گاہے صرف فسق باطنی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اگر کوئی ان عوارض سے مبرا ہو، یعنی عقائد بھی خراب نہ ہوں، جس کا آسان طریقہ بلکہ متعین طریقہ یہی ہے کہ علم دین حاصل کر کے یقین کے ساتھ اس کا اعتقاد رکھے اور اعمال بھی خراب نہ ہوں۔ عزم بھی یہ رہے کہ اس سے وہی معاش حاصل کریں جو شرعاً جائز ہوگی۔ اور پھر اسی کے موافق عمل درآمد بھی کرے تو ایسے شخص کے لیے انگریزی مباح اور درست ہے۔ اور اگر اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اس کو ذریعہ خدمت دین بنا دیں گے تو اُس کے لیے عبادت ہوگی۔ حاصل یہ کہ انگریزی کبھی حرام ہے، کبھی مباح، کبھی عبادت" [۵۵]۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک دوسرے فتوے میں دینی مصالح (مثل ردِ عیسائی وغیرہ) کے علاوہ کسبِ معاش کے لیے بھی انگریزی سیکھنے کو صرف ان لوگوں کے لیے جائز قرار دیا ہے جو ضروریاتِ دینیہ اور عقائد و مسائل سے واقف ہوں جبکہ دین سے واقفیت نہ رکھنے والوں کے لیے ممنوع۔ مولانا کی رائے (فتویٰ) ملاحظہ ہو

انگریزی ایسے ہی ہندی مختلف لغات یعنی زبانوں کے ایک زبان ہے اور زبان فی نفسہ کوئی قبیح نہیں بلکہ صنعت خداوندی سے ایک نعمت ہے اور خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی میں، کہ آپؐ کے زمانہ میں آتش پرستوں کی زبان تھی، تکلم فرمایا۔ البتہ کبھی بعض عوارض کی وجہ سے قبیح لغیرہ ہو جاتی ہے پس اگر وہ عوارض نہ ہوں صرف کسی مصلحت دینی مثل ردِ نصاریٰ [و] ہنود یا دنیوی مثل کسب معاش وغیرہ کے لیے سیکھے تو جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلیل ثابت کو لغت و خط سریانی (کہ اس زمانہ میں یہود کا لغت اور خط تھا، واسطے مراسلت و مکاتیب یہود کے سیکھنے کے لیے فرمایا تھا رجامع الترمذی)۔ اگر وہ عوارض ہوں تو اس وقت اجتناب واجب ہے سو اگر کوئی شخص ضروریت دینیہ

عقائد و مسائل سے واقف ہو اور ظنِ غالب ہو کہ یہ شخص بوجہ صحبت کفار و فجار کے ان خیالات یا رسوم یا وضع کی طرف مائل اور اپنے دین سے سست عقیدہ نہ ہوگا، واسطے کسب معاش حلال وغیرہ کے لیے انگریزی یا ہندی پڑھے، جائز ہے اور جو خود اپنے مذہب سے واقف نہیں خصوصاً جبکہ کم ہو اور غالب ہے کہ ایسے لوگوں کی مصاحبت سے ان کی طرف میلان و حرص اور اپنے مذہب سے ضعف اعتقاد پیدا ہوگا، ایسے شخص کے لیے البتہ ممنوع و مصداق ویتعلمون ما یضرهم ولا ینفعهم الآیۃ کا ہے۔ مگر آج کل تو اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انگریزی پڑھنے سے خرابی پیدا ہوتی ہے ضرہ اقرب من نفعہ۔ لہٰذا احتیاط مناسب ہے۔ کچھ اسی علم پر روزی منحصر نہیں اور ہوس کا کوئی منتہا نہیں"[1]۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے مذکورہ بالا فتاوی سے صریح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ انگریزی زبان کو ضعف و فساد عقائد کا موجب گردانتے ہیں اور دینی علوم سے بے بہرہ افراد کے لیے اس کی تحصیل کو ناجائز و ممنوع خیال کرتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے فتاوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم کی مخالفت سے اُن کا منشا محض کسی غیر اسلامی زبان کی تعلیم کا عدم جواز نہ تھا بلکہ وہ اُن اثرات سے ڈرتے تھے جو اس زبان کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس میں سرایت کر رہے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی انگریزی زبان کو دارالعلوم کے نصاب کا جزو بنانے کے علاوہ دارالعلوم سے فراغت پانے والے طلبہ کو انگریزی سکھانے کے لیے جدید تعلیمی اداروں میں بھیجنے کے مخالف تھے۔ اس بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ طلبہ کو انگریزی سکھانے کے لیے خود دارالعلوم کے ذمہ داروں کی نگرانی میں الگ سے یہ انتظام ہونا چاہیے۔ جب کلکتہ کے ایک متمول تاجر نے تھانہ بھون حاضر ہو کر یہ عرض کیا "(۱) مدرسہ دیوبند میں بقدر ضرورت تھوڑی سی انگریزی ہونی چاہیے۔ (۲) میرا خیال ہے کہ میں چند طلباء عربی کو کلکتہ لے جا کر انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلواؤں تاکہ دوسرے ممالک میں جا کر تبلیغ کر سکیں"۔ تو مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا

مدرسہ میں انگریزی داخل ہونے سے خلط بحث ہوجائے گا۔ اب جو کام مدرسہ میں ہو رہا ہے یہ بھی نہ ہوگا۔ مدرسہ ایک معجون مرکب ہوجائے گا۔ اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ مدرسہ کو تو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیجیے جو کام ہو رہا ہے ہونے دیجیے، اور انگریزی کے متعلق ایک درسگاہ الگ تیار کرا دیجیے اس کا نظم و نسق ان ہی حضرات کے ہاتھ میں رہے جو عربی کا نظم و نسق فرما رہے ہیں اور صورت اس کی یہ ہو کہ عربی کے فارغ التحصیل طلبہ انگریزی درسگاہ میں تعلیم پائیں اور جب تک طلبہ فارغ التحصیل نہ ہوجائیں ان کو انگریزی تعلیم پانے کی اجازت نہ ہو۔ ہاں فراغت کے بعد کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ قبل فراغ اندیشہ ہے اس طرف کے جذبات کے غلبہ کا اور بعد فراغ یہ اندیشہ نہ رہے گا۔ فراغ کے قبل اجازت نہ ہوگی، مصلحت یہ ہے کہ اکثر فقہ غالب آجاتا ہے اوصاف پر، اور اس صورت موجودہ میں مدرسہ کا کوئی حرج نہ ہوگا۔ ایک یہ بات بھی ضروری ہے کہ کتابیں ختم کرنے کے بعد جب تک دو چار مرتبہ نہ پڑھا لے علم محفوظ نہیں رہ سکتا۔ + فائض گھنٹوں کے حساب سے دونوں کام کر سکتے ہیں یعنی فارغ التحصیل طلبہ اس صورت میں عربی بھی پڑھا سکتے ہیں اور انگریزی بھی پڑھ سکتے ہیں اور دوسری جگہ بھیج کر فارغ التحصیل طلبہ کا بھی تعلیم انگریزی پانا مضرت سے خالی نہیں، اس کا رنگ ہی نہیں سکتا اور نہ اس کام کے بن سکتے ہیں جو آپ کی غرض ہے اس کا بھی صحیح طریق یہی ہے کہ جیسے میں قدیم

ساتھ ہی نگرانی میں تعلیم پائیں تاکہ ان کے جذبات پر برا اثر نہ پڑے۔ یہاں سے الگ ہو کر ان جذبات کا محفوظ رہنا مشکل ہے جس کا نتیجہ بجائے ہدایت کے گمراہی ہوگا اور انگریزی کو خود مدرسہ میں داخل کر دے سے عوام کے اوپر بھی یہ اثر ہوگا وہ شروع ہی سے اپنے بچوں کو تعلیم انگریزی کے لیے بھیجنا شروع کر دیں گے، ان کے پاس اس سمجھنے کا کوئی معیار ہی نہیں کہ اس کو مدرسہ دینیہ ہی کی شاخ بنا کر رکھنا چاہیے اور مدرسہ دینیہ ہی کے خدام اس انگریزی شاخ کے نگراں رہیں اور میری مجوزہ صورت میں ہر مصلحت محفوظ رہ سکتی ہے اور جیسے مبلغ آپ چاہتے ہیں ویسے تیار ہو سکتے ہیں۔ اس سے کہ جذبات وہی دین کے رہیں گے۔ غرض کہ مدرسہ دینیہ کے ماتحت انگریزی درسگاہ کو رکھنا چاہیے تاکہ انگریزی کا مدرسہ عربی مدرسہ سے بے نیاز مقصود نہ ہو جائے، پھر اس اہتمام اور نگرانی کے بعد اگر کوئی بگڑے تو بگڑے ہم تو ذمہ دار نہ ہوں گے اور اس کے خلاف صورت میں ہم ذمہ دار ہوں گے۔ یہ ہے فرق دونوں صورتوں میں۔

آپ انگریزی تعلیم کے متعلق یہاں پر تھا۔ جون میں انتظام کر دیجیے میں ہر کام اپنی نگرانی میں رکھوں گا اور مدرسین کا انتخاب وغیرہ اپنی رائے سے کروں گا، طلباء کی نگرانی اور ان کے متعلق اصول و قواعد میں خود منضبط کروں گا"[۴۷]

مدرسۂ احمدیہ، آرہ (ضلع شاہ آباد، صوبۂ بہار):

جنوبی ایشیاء میں پہلے پہل انگریزی زبان کو دینی مدارس کے نصابات کا جزو بنانے کا سہرا مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ کے سر ہے۔ سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ میں سے مولوی ابراہیم صاحب آروی (م ۱۳۲۴ھ) خاص حیثیت رکھتے تھے۔" جو نئی باتوں میں سے اچھی باتوں کو پہلے قبول کرتے۔ چنانچہ نئے طرز پر عربی مدرسہ اور اس میں دارالاقامہ کی نمود کا خیال [پہلے پہل] انہی کے دل میں آیا اور انہی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ آرہ (ضلع شاہ آباد، صوبہ بہار) میں قائم کیا۔ اس مدرسہ میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی[۴۸]۔ یہ مدرسہ مدتوں نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلتا رہا۔ سید نذیر حسین دہلوی کے نامور تلامذہ میں سے حافظ عبداللہ غازی پوری (م ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء) اور مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (مؤلف "حسن البیان"، مقتدائے اہل حدیث مظفر پور و دربھنگہ، صوبہ بہار) ۱۳۰۰ھ تک اس مدرسہ میں درس دیتے رہے۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری، صاحب "سیرت البخاری" اور مولانا عبدالرحمن مبارک پوری جو مدرسۂ احمدیہ کے فیض یافتہ تھے اس کے تعلیمی اسٹاف میں بھی شامل تھے[۴۹]۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء:

۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں مدرسۂ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر ندوۃ العلماء کے نام سے علماء کی ایک مجلس قائم ہوئی اور مولانا سید محمد علی مونگیری (۱۲۶۴-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد میں رفع نزاع باہمی (علماء کے مذہبی و فقہی نزاعات و اختلافات کا رفع کرنا)، اسلام کی تبلیغ و

شاعت، مسیحی مبشرین و مستشرقین کے اعتراضات کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت و مدافعت اور اصلاح نصاب و طریقۂ تعلیم کو خاص اہمیت دی گئی ۹۰۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اس غرض سے قائم کیا گیا کہ اس میں علوم دنیوی اور علوم دینی کی تعلیم یکساتھ دی جائے اور اس سے ایسے روشن خیال علماء پیدا ہوں جو دونوں قسم کے علوم کے جامع ہوں اور وہ جدید اور قدیم گروہوں کے درمیان رابطہ اتحاد کا کام دیں اور اسلام کا وہ مکمل نقشہ ان کے پیش نظر ہو جس میں دین اور دنیا دونوں جمع کیے گئے ہوں ۹۱۔

بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری (۱۲۶۴ھ-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶ء-۱۹۲۷ء) نے دارالعلوم کے لیے جو نصاب مرتب کیا اس میں جدید فلسفہ جدید ہیئت اور جدید تاریخ کی تعلیم و تدریس کی ضرورت کو پیش نظر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جن علوم کی اہمیت اس زمانہ میں بہت بڑھ گئی ہے ان کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ مثلاً جدید علم کلام، ریاضی، اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ، منطق و فلسفہ، قدیم کے بڑے حصہ کو ترک کیا جائے اور صرف اس کے مفید اور ضروری اجزاء پر اکتفا کیا جائے۔ قرآن و حدیث اور فقہ کی طرف توجہ دی جائے ۹۲۔ مولانا محمد علی مونگیری نے جدید علم کلام کی تدوین اور فلسفہ جدید کے رد کے لیے نیز دعوت و تبلیغ کے لیے طلباء علوم دینیہ کے لیے انگریزی زبان کا سیکھنا بھی ضرور قرار دیا۔ مولانا کے الفاظ ہیں۔ "فلسفۂ جدید کا رد کرنے کے لیے زبان انگریزی کا جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ یہ فلسفہ زبان انگریزی میں ہے اور ترجمہ کر کے اس کا جواب دینا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں فلسفہ یونانی کے ساتھ کیا گیا، کافی نہیں ہوسکتا" ۹۳۔

مولانا سید محمد علی مونگیری کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ ہمارے طلباء اور علماء جن کے ہاتھ میں امت کی زمام قیادت ہے انگریزی زبان اور جدید علوم سے بہرہ مند ہوں اور اس کو اسلام کی ترجمانی کا ذریعہ بنائیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقہ پر اثر انداز ہوں بلکہ یورپ میں جا کر اسلام کا پیغام پھیلائیں ۹۴۔ چنانچہ مولانا نے پوری قوت کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم اور جدید علوم کے حصول پر زور دیا۔ وہ مسلمانوں کے دینی مصالح کے تحفظ کے لیے انگریزی کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"الغرض اس زمانہ میں دینی و دنیوی ضرورتیں ایسی درپیش ہیں کہ انگریزی زبان کا سیکھنا ضروری ہے کہ چند ہمارے علماء اس قدر انگریزی سے واقف ہوں کہ یورپ میں جا کر اسلام کے فضائل ان کی زبان میں بیان کریں تو بہت کچھ اسلام کی اشاعت ہو۔ اسی طرح اگر انگریزی میں رسائل لکھ کر مشتہر کرائے جائیں تو بھی بہت نفع ہو۔ غرض اس وقت دنیا میں بہت بڑا فرقہ اپنی سلطنت کے اعتبار سے اکثر روئے زمین پر حاوی ہے اس کی زبان انگریزی ہے لہٰذا تبلیغ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی زبان سیکھی جائے کیونکہ اب ان کو غلبہ ہے اور مسلمان مغلوب ہیں اور غالب مغلوب کی زبان سیکھنے پر مجبور نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اگر مغلوب کو ان سے ضرورت پیش آئے تو بالضرور اسے غالب کی زبان سیکھنی ہوگی" ۹۵۔

مولانا محمد علی مونگیری نے یہ بات زور دے کر کہی کہ کفار کی زبان سیکھنے سے متعلق شریعت میں ہرگز کوئی ممانعت نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "انگریزی بھی ایک زبان ہے جس طرح فارسی اور ترکی وغیرہ۔ جس طرح فارسی اور ترکی اولاً کفار کی

زبان تھی جب اس زبان والے ایمان لائے تو مسلمانوں میں وہ زبان شائع ہوئی۔ اسی طرح اگر ہند کا فضل ہو جس کے ہونے کی امید کی جاتی ہے اور انگریزی زبان والے اسلام لائیں تو ان کا [انگریزی کا] حال بھی فارسی ترکی زبان جیسا ہو جائے گا۔ اور جس طرح آپ فارسی میں کتب دینیہ لکھتے ہیں ان شاء اللہ انگریزی میں بھی دیکھیں گے۔ حاصل یہ ہے کہ اس وقت مضرتوں کی اصلاح کر کے عربی و انگریزی دونوں حاصل کرنا چاہیے تاکہ اپنے بھائیوں کو فائدہ پہنچ سکے اور اپنے دین کو بھی محفوظ رکھ سکے، اس بنا پر ایسا کالج ہونا چاہیے جس میں عربی و انگریزی دونوں ہوں، اب جو انگریزی سے تعلق کرنا چاہے وہ ضروری علم عربی تحصیل کر کے انگریزی حاصل کرے"[96]

ستمبر ۱۸۹۸ء میں ندوۃ العلماء کے زیر انتظام لکھنؤ میں ایک دارالعلوم (جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے موسوم ہو) کا عملی افتتاح ہوا اور اس کے ابتدائی درجات کھل گئے۔ تاہم اصلاح نصاب و طریقہ تعلیم سے متعلق ندوۃ العلماء کے بانیوں کے بلند عزائم کے باوجود اس دارالعلوم کا نصاب دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا[97]۔ دیوبندی نظام و نصاب تعلیم جو درس نظامی پر مبنی تھا اور ندوی نظام و نصاب تعلیم کے درمیان نصاب تعلیم کا اختلاف اصولی نہیں، جزئی نوعیت کا تھا"[98]۔ البتہ اس کے نصاب عربی زبان و ادب کی تعلیم و تدریس پر خاص توجہ گئی۔ مزید برآں تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ انگریزی زبان کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۲ء میں "سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے انگریزی کا ایک کلاس کھول دیا گیا اور اس مقصد کے لیے انگریزی کے ایک مدرس کا تقرر بھی عمل میں آگیا"[99]۔ تاہم ندوۃ العلماء کے ایک دوسرے سربرآوردہ رکن مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) چاہتے تھے کہ نصابات میں انگریزی زبان اور جدید علوم بھی شامل کیے جائیں، تاکہ ایسے داعی اور مبلغ تیار ہو سکیں جو مسیحی مبشرین و مستشرقین کے اعتراضات کا رد کر سکیں اور مغرب کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت مؤثر طور پر پہنچا سکیں۔ مولانا شبلی نے خاص اس غرض سے دارالعلوم میں انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کی پُرزور حمایت کی تھی"[100]۔

مولانا شبلی نعمانی نے ایک عرصہ تک علی گڑھ میں قیام کیا تھا (۱۸۸۳-۱۸۹۸ء) جہاں وہ سرسید احمد خان کے معتقد علیہ بن گئے تھے۔ علی گڑھ کالج میں انھیں نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات اور مغربی زبان خصوصاً انگریزی کی ضرورت و اہمیت سے آگاہی ہوئی تھی۔ علی گڑھ کالج میں قیام اور مصر و شام و ترکی کی سیاحت نے مصر جدید میں علماء کے فرائض کی ضرورتوں کو ان پر منکشف کر دیا۔ علی گڑھ میں انہوں نے پروفیسر آرنلڈ (۱۹۳۰ء) سے کچھ فرانسیسی زبان بھی پڑھی۔ تعلیم کے سلسلہ میں دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے بھی واقف ہوئے[101]۔ مولانا کالج میں رہ کر کسی قدر انگریزی سے صرف شناسا ہو گئے اور معمولی عبارت سمجھ لیتے تھے[102]۔ علی گڑھ کالج کا ان پر ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ انگریزی کی تعلیم کی ضرورت ان پر اظہر من الشمس ہو گئی اور ان کو مسلمان قوم میں انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی[103]۔ مولانا شبلی کو انگریزی زبان کی ضرورت کا احساس اتنا ہو گیا تھا کہ وہ علماء کے لیے بھی اس کا جاننا ضروری خیال کرتے تھے۔ انھیں قدیم نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت کا بھی احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نصاب میں سے قدیم

یونانی فلسفہ کی کتابیں نکال کر جدید فلسفہ کی کتابیں داخل کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ علماء تعلیم یافتوں کی اصلاح، یورپ میں تبلیغ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب اور اُن کی غلطیوں کی اصلاح کے لیے انگریزی پڑھیں [54] ۔ خصوصاً جب مولانا شبلی نے سیرت النبی کی تالیف کا آغاز کیا تو انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں مستشرقین کے خیالات و آراء سے آگاہی کے لیے انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں سے واقفیت کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ سیرت ہی کے سلسلہ میں انگریزی ذخیرے سے واقفیت کے لیے انہوں نے سیرت کا دفتر قائم کیا اور انگریزی کے مترجمین کی خدمات حاصل کیں [55] ۔ چنانچہ مولانا شبلی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم اور انگریزی زبان کی تعلیم کے زبردست داعی و حامی تھے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۰ء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

عربی قدیم مدارس کا حال یہ ہے کہ نہ ان میں انگریزی زبان کی تعلیم ہوتی ہے اور نہ جدید علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں نہ نئے خیالات سے ان کو واقف کرایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعلیم یافتہ جدید تعلیم یافتہ افراد کے خیالات پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خیالات سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ندوۃ العلماء کا دارالعلوم درحقیقت ایک ''جامعہ دینیہ'' یعنی ایک مذہبی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ہے۔ آج مسلمانوں کو سب سے زیادہ ایک ایسی مذہبی یونیورسٹی کی ضرورت ہے۔ جس میں اسلامی علوم اعلیٰ درجے تک پڑھائے جائیں، جس میں یورپین علوم و فنون کی تعلیم کا کافی بندوبست کیا جائے، جو جدید علم کلام پیدا کر سکے، جس کے تعلیم یافتہ انگریزی زبان میں وعظ اور مذہبی لیکچر دے سکیں۔ اس قسم کی یونیورسٹی کی ضرورت اور اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے [56] ۔

مولانا شبلی بڑی قوت و طاقت سے کہتے تھے کہ "مذہبی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی ضرورت ہے۔ موجودہ فلسفہ کا مقابلہ علوم جدیدہ کی واقفیت کے بغیر کیونکر ہو سکتا ہے؟ یورپ میں اسلام کی اشاعت انگریزی دانی کے بغیر کیونکر ہو سکتی ہے؟ آریوں اور عیسائیوں کے مذہبی حملوں کا علم انگریزی دانی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے" [57] ۔ مولانا شبلی کی رائے تھی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تمام طلبہ کے لیے انگریزی لازمی کی جائے۔ انہوں نے سید سلیمان ندوی کے ایک سوال کہ "آپ مدرسہ میں انگریزی کو کیوں لازم قرار دیتے ہیں؟" کے جواب میں فرمایا

نئی تعلیم کس تیزی سے پھیلتی جاتی ہے اسی کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم اعلیٰ مسلمان خاندانوں سے مٹتی جاتی ہے۔ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزی کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجموں پر رہ جائے گا۔ اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی۔ اب بھی دیکھو جب غیر مذہبی تعلیم یافتوں کو قرآن پاک کے سمجھنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ اپنی اس پیاس کو سیل [G Sale] کے انگریزی ترجمے سے بجھاتے ہیں۔ فقہ اسلامی کا مدار ہدایہ کے انگریزی ترجمہ پر رہ گیا ہے کیا یہ کام ہمارے علماء کا نہیں؟" [58]

مولانا شبلی کہتے تھے کہ "اگر فقہاء انگریزی جانتے ہوتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے

تحریروں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند قرار نہ پاتے"۔ [۹] علامہ مولانا شبلی کی رائے تھی کہ ایسے علماء جو موجودہ زمانے میں اپنے علمی وقار کو قائم رکھ سکیں، معترضین اسلام کے جوابات دے سکیں اور نئے تعلیم یافتوں کی تشفی کر سکیں بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ انگریزی زبان سے تھوڑی واقفیت رکھیں"۔ [۱۰]

غرضیکہ مولانا شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کے نئے مدرسہ میں انگریزی کے پڑھانے پر مصر تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کے نصاب میں اس کے داخل کیے جانے کی تحریک ۱۸۹۹ء میں کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ سید سلیمان ندوی کے بقول ندوۃ کے جلاس اگست ۱۸۹۹ء میں مولانا نے دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی زبان کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام مسلمانوں کا انگریزی پڑھنا تو کفر نہیں رہا تھا مگر علماء کا انگریزی جاننا تو جرم عظیم سمجھا جاتا تھا۔ مولانا اس جرم عظیم کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے تحریک کی مگر اس وقت علماء کی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ منظور نہ ہوسکی۔ علماء اس بدعت کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوسکتے تھے، حیرت یہ ہے کہ مولانا شیروانی (مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی (۱۸۶۷-۱۹۵۰ء) جیسے روشن ضمیر و روشن خیال عالم نے خود مولانا شبلی کی بدنامی کے ڈر سے اس بحث سے اعراض فرمایا"۔ [۱۱] آخر کار مولانا شبلی کے اصرار پر ۱۹۰۳ء میں انگریزی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شریک نصاب کی گئی

"نے آخر ربیع الاول ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپے ماہوار پر ایک انگریزی کا استاد مقرر ہوگیا اور کچھ طالب علموں نے اے بی سی ڈی پڑھنا شروع کی مگر یہ تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی۔ سالہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمری سے آگے نہیں بڑھا۔ مولانا شبلی چند سال بعد ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمد تعلیمات ہوئے تو اُن کے اصرار سے ہر لڑکے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی [۱۳]۔ انگریزی کی یہ تعلیم اتنی تھی کہ طالب علموں میں میٹرک تک کی لیاقت پیدا ہوجائے۔ مولانا شبلی کا خیال تھا کہ ۸ برس کی عربی تعلیم کے بعد دو برس خاص انگریزی تعلیم کے لیے انگریزی کا ایک درجۂ تکمیل کھولا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ جب طلبہ درجۂ تکمیل میں دو برس تک اور صرف انگریزی پڑھیں گے تو دو برس میں قابل گریجویٹوں کی برابری کرسکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دے سکیں گے"۔ [۱۴]

مگر یہ درجہ دارالعلوم میں قائم نہ ہوسکا۔ افسوس کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قدیم و جدید کی یکجائی اور امتزاج کا مقصد بھی حاصل نہ ہوسکا۔ دارالعلوم میں انگریزی کا جو نصاب رائج کیا گیا وہ اس قدر معمولی تھا کہ اس سے طلباء میں اتنی استعداد ہرگز پیدا نہ ہوسکی تھی کہ وہ انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ کا وظیفہ بجا لاتے۔ بالفاظ مجیب احمد (سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں کا یہ خیال کہ انگریزی زبان، تاریخ اور جغرافیہ کا معمولی علم طلباء میں فلسفہ جدید کے رد اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب اور مغرب میں دعوت تبلیغ اسلام کی صلاحیت پیدا کر دے گا، درست نہ تھا"۔ [۱۵] بایں ہمہ علامہ شبلی کا تصور رائیگاں نہیں گیا۔

بایں ہمہ دارالعلوم میں انگریزی کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ کئی طلبہ نے انگریزی پڑھ کر معید علمی اور مذہبی خدمت انجام دیں۔ دارالعلوم کے بعض طلبہ ایسے بھی ہوئے کہ جنہوں نے علوم عربیہ کی باضابطہ تحصیل کے بعد جدید اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان

میں مولانا حکیم سید عبدالعلی (۱۸۹۳-۱۹۶۱ء) جو بعد میں عرصہ تیس سال تک (۱۹۳۱-۱۹۶۱ء) ندوۃ العلماء کی نظامت پر فائز رہے کے علاوہ مولوی مصطفیٰ کریم ندوی (ہمشیرہ زادہ سید سلیمان ندوی) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر ندوہ اور دیوبند سے فیض یاب ہونے کے بعد لکھنؤ کے ایک مشنری اسکول جس میں یورپین عیسائی اساتذہ نمایاں تھے، میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۵ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا، جبکہ لکھنؤ کے کرسچن کالج (کیننگ کالج) سے انگریزی ادب اور علم النباتات (بوٹنی) کے مضامین کے ساتھ بی ایس سی امتیاز کے ساتھ کیا (۱۹۱۹ء)۔ اور بعد ازاں کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی (۱۹۲۵ء) [۱۲۶]۔ دارالعلوم کے ایک دوسرے طالب علم مولوی مصطفیٰ کریم ندوی نے علوم عربیہ کی باضابطہ تکمیل کے بعد سائنس (باٹنی) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور وہ بھی امتیاز کے ساتھ [۱۲۷]۔

علماءِ فرنگی محل، لکھنؤ:

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انگریزی تعلیم داخل ہونے کے بعد بعض دوسرے مدرسوں میں بھی انگریزی پڑھائی جانے لگی۔ اس سلسلہ میں علماءِ فرنگی محل۔ لکھنؤ کا مدرسہ عالیہ نظامیہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی زبان کے معاملہ میں علماءِ دیوبند کے مقابلہ میں علماءِ فرنگی محل کا طرزِ فکر و عمل مختلف رہا۔ ممتاز فرنگی محلی عالم ابوالحسنات محمد عبدالحی (۱۸۴۸-۱۸۸۶ء) کا شمار ان معدودے علماء میں سے ہوتا ہے جنھوں نے علی گڑھ کالج کے قیام کی حمایت کی تھی اور اس کے حق میں فتویٰ دیا تھا۔ (مزید برآں) مولانا عبدالحی نے اپنے متعدد فتاویٰ میں انگریزی زبان سیکھنے کو شرعاً جائز اور مباح قرار دیا [۱۲۸]۔ مولانا عبدالحی کی رائے میں "شرعاً کسی زبان کے سیکھنے کی، اگرچہ وہ کفار کی زبان ہو، ممانعت وارد نہیں ہے۔ اس طور سے فی الواقع نفس تعلیم زبان انگریزی شرعاً ممنوع نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو زبان یہودی سیکھنے کا حکم کیا جیسا کہ جامع ترمذی میں مروی ہے۔ انگریزی پڑھنا اور زبان سیکھنا بشرطیکہ دین میں خلل نہ ہو جائز ہے۔ اگر انگریزی زبان پڑھنا اور اس کی خط و کتابت سیکھنا انگریزوں کے ساتھ محبت اور مشابہت کی وجہ سے ہو تو ناجائز ہے ورنہ ان کے مضامین اور کتابوں سے مطلع ہونے اور ان کی تحریرات پڑھنے کی غرض ہو تو حرج نہیں" [۱۲۹]۔

مولانا عبدالحی کے ان فتاویٰ سے دیگر علماءِ فرنگی محل بھی اتفاق کرتے تھے [۱۳۰]۔ علماءِ فرنگی محل کے متاخرین میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی کے بعد مولانا قیام الدین عبدالباری (۱۸۷۸-۱۹۲۶ء) کی ذات نمایاں ہوئی تھی۔ مولانا عبدالباری نے فرنگی محل میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک باقاعدہ مدرسۂ عربیہ کی بنیاد ڈالی، جس سے متعدد اصحابِ فکر اور اہل قلم علماء پیدا ہوئے [۱۳۱]۔ مولانا عبدالباری کے طرزِ فکر و عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برطانوی اقتدار کے تحت ملک میں جدید مغربی تعلیم کی اشاعت سے پیدا ہونے والے اثرات و نتائج کا پورا ادراک رکھتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم ن

تحصیل ایک طرف تو بہتری معاشی مواقع کا وسیلہ ہے تو دوسری طرف نہ صرف مسلمانوں کی نوخیز نسل کی بے دینی و مذہب سے دوری و بیگانگی کا سبب بن رہی ہے۔ مدرسۂ عالیہ نظامیہ کی بارہویں سالانہ رپورٹ میں مولانا عبدالباری انگریزی تعلیم کی طرف سے درپیش تحفظات کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی تعلیم روز بروز زوال پذیر ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جنھوں نے قدیم تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ قدیم خطوط پر مذہب کو سمجھتے ہیں اور جدید دور کے تقاضوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو مذہب کو علماء و اسلام سے نہیں بلکہ یورپی مصنفین اور دانش وروں [مستشرقین] کی تصنیفات سے سیکھتے ہیں وہ مذہب سے آگاہی مسلم علماء سے نہیں بلکہ سپنسر (Spenser) یا جارج سیل [George Sale] کے انگریزی ترجمۂ قرآن سے حاصل کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر گروہ راہ راست سے بھٹک چکا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ پہنچتا ہے کہ یہ جدید تعلیم یافتہ افراد عربی زبان سے عدم واقفیت کے سبب قرآن حکیم کا مطالعہ جارج سیل کے ترجمۂ قرآن کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔" [۳۲]

مولانا عبدالباری نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے نتیجے میں رونما ہونے والے چیلنجوں/تحفظات کے مقابلہ کے لیے ایک ایسا حل تجویز کیا جو مولانا محمد عبدالحئی کے افکار سے ہم آہنگ تھا۔ انہوں نے "فرنگی محل کے اطفال کے لیے خاص کر اور عامۂ اہل اسلام کے لیے مدرسۂ نظامیہ قائم کیا (۹ جمادی الاول ۱۳۱۳ھ) اور اُس میں جدید طریقۂ تعلیم کو جاری فرمایا" [۳۳]

مولانا عبدالباری نے مدرسۂ عالیہ نظامیہ میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تدریس کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں علماءِ فرنگی محل نے درسِ نظامیہ میں تبدیلیاں متعارف کرائیں۔ ریاضی، الجبرا، جیومیٹری اور جغرافیہ جیسے جدید علوم بطور لازمی مضمون شامل نصاب کیے گئے جبکہ انگریزی زبان کو درسِ نظامیہ کے آخری درجوں کے نصاب کا لازمی جزو بنایا گیا۔ انگریزی زبان کی تدریس کے لیے مدرسین، دیگر علوم و فنون کے مدرسین کے مقابلہ میں بھاری تنخواہ پر رکھے گئے [۳۴]۔ تاہم علماءِ فرنگی محل کو اس معاملہ میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ اگرچہ انگریزی زبان کی تحصیل کے متعلق بہت کچھ کیا گیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نہ جیسا کہ ۱۹۳۶ء کی سالانہ رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے طلبہ نے انگریزی کی طرف مناسب توجہ نہیں کی۔ اگرچہ انہیں انگریزی کی شد بد ہوگئی تھی تاہم وہ اس میں مہارت پیدا کرنے میں ناکام رہے [۳۵]۔

۱۹۲۰ء اور بالخصوص ۱۹۳۰ء کی دہائی میں علماءِ فرنگی محل کی قدیم خاندانی تعلیمی روایت میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ خاندان کی نئی پود برطانوی اقتدار کے تحت بہتر معاشی امکانات کی جستجو میں، مذہبی تعلیم کے بجائے جدید مغربی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ اس پیش رفت کا سب سے اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ قدیم خاندانی تعلیمی روایت میں تبدیلی کا فیصلہ نوخیز نسل نے نہیں بلکہ بزرگوں (یعنی خود علماء) نے کیا تھا [۳۶]۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی تک خاندان کی نئی نسل کے بیشتر افراد جدید مغربی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے جبکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی۔ حتیٰ کہ خاندان کی بچیاں/لڑکیاں بھی جدید تعلیم حاصل کرنے لگیں [۳۷]۔ دراصل فرنگی محل کے علماء نے انگریزی زبان اور جدید تعلیم سے ...

میں مخالفانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ مولانا محمد عبدالحی نے علی گڑھ کالج کے قیام کی حمایت کی تھی تو ان کے جانشین مولانا عبدالباری نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فنڈ میں پانچ صد روپے (۵۰۰) روپے دیے۔[۱۳۱]

اختتامیہ:

برعظیم پاک و ہند انگریزی زبان کی ترویج و اشاعت کے بارے میں علماء و فقہاء کا ردعمل مختلف النوع عوامل کے تابع رہا ہے۔ اس خطے میں انگریزی زبان کی اشاعت میں کیونکہ مسیحی مبشرین نے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس کو عیسائیت کی اشاعت و تبلیغ کا ایک موثر وسیلہ گردانتے تھے۔ چنانچہ ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں عیسائیت کی تعلیم تعلیمی نصاب کا لازمی جزو ٹھہری تھی۔ یہی وجہ علماء نے ان تعلیمی اداروں میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کی مخالفت کی تھی۔ انگریزی زبان سے علماء کی نفرت و بیزاری کا ایک سبب خود سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک اور ان کی دینی تعبیرات و تشریحات تھیں۔ سرسید نے مسلمانوں کو جدید مغربی تعلیم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید کی دعوت پرزور انداز میں دی تھی۔ چنانچہ علماء انگریزی تعلیم کو مغربیت (Westernization) کا موجب خیال کرتے تھے۔ جدید تعلیم ان کی نظر میں مسلمان کے عقیدہ و ایمان اور تہذیب و معاشرت کے غیر موافق تھی تاہم مسلمانوں کے بہت سے معاشی و سیاسی مصالح جدید تعلیم خصوصاً انگریزی دانی سے وابستہ ہو گئے تھے چنانچہ علماء زیادہ دنوں تک انگریزی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ خود نئی نسل میں اسلامی عقائد و تعلیمات کی تبلیغ کے لیے انگریزی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمود حسن، اور ندوۃ العلماء کے بانیوں نے بجا طور پر اس ضرورت کو محسوس کیا لیکن وہ عملاً انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کو جاری نہ کر سکے۔ گو ندوۃ العلماء اور علمائے فرنگی محل نے اپنی درس گاہوں کے نصاب کا جزو ضرور بنا دیا۔ لیکن اس کا معیار اس قدر کم تھا کہ وہ خاطر خواہ نتائج پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدرسہ نظامیہ عالیہ میں انگریزی کا جو نصاب رکھا گیا وہ فارغ التحصیل ہونے والوں میں اتنی استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا کہ وہ انگریزی میں تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ کا وظیفہ انجام دے سکیں۔ ایں ہمہ ان کا یہ اقدام انتہائی جرأت مندانہ ضرور تھا کہ انہوں نے آئندہ کے لیے انگریزی زبان کو دینی مدارس کے نصاب کا جزو بنانے کی نیک مثال قائم کی۔

حواشی

۱۔ ہارڈی، پی (Hardy, P)، ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۶-۳۲۸؛ مسرا، بی بی (Misra, B B)، ۱۹۵۹ء، ص ۳۲۹-۳۳۷؛ فیضی، آصف اے اے، ۱۹۵۵ء، ص ۳۷۔

۲۔ ہدایہ کا پہلے فارسی میں ترجمہ جو گورنر جنرل سر جان شور (Sir John Shore، ۱۷۹۳ء-۹۸ء) کے ... ء، قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین کاکوروی علوی (۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) نے کیا تھا۔ (دیکھیے سیٹھم سنڈمی

۱۹۹۳ء ص ۵۹-۶۰) اور پھر فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرایا گیا۔ مستشرق جیمز اینڈرسن (James Anderson) ہملٹن (Hamilton) کے قلم سے یہ ترجمہ پہلی بار ۱۷۹۱ء میں شائع ہوا۔ اس کا عکس لاہور سے بھی شائع ہوا ہے (۱۹۵۹ء)۔ یہ ترجمہ جو ہدایہ کے فارسی ترجمہ پر مبنی ہے ناقص خیال کیا جاتا ہے دیکھیے علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء ص ۹۱؛ میور رمزے (Muir, Ramsay)، ۱۹۷۸ء ص ۵۱-۵۴؛ کرم، ایس ایم، ۱۹۶۱ء ص ۲۱۹۔

۳۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء ص ۹۱؛ اکرام ۱۹۶۱ء ص ۲۱۹۔

۴۔ امین عزیز، ۱۹۹۷ء ص ۳۰-۳۹۔

۵۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء ص ۸۲؛ حسن، سبط، ۲۰۰۲ء ص ۱۱۹-۱۲۱۔

۶۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء ص ۱۰۳-۱۰۴، ۱۳۰؛ نظامی، خلیق احمد، ۱۹۷۱ء ص ۱۱۲؛ حسن، سبط، ۲۰۰۲ء ص ۱۰۲؛ پاول، ایورل این (Powell, Avril Ann)، ۱۹۹۳ء ص ۷۸-۷۹؛ ملک، اے آر، ۱۹۶۰ء ص ۶۸-۶۹۔

۷۔ دھرماراج، جیکب ای (Dharmaraj, Jacob E.)، ۱۹۹۳ء ص ۵۸؛ والبرج، لنڈا ایس (Walbridge, Linda S.)، ۲۰۰۳ء ص ۱۱؛ باسو، بی ڈی (Basu, B.D.)، ص ۷۰-۷۱؛ عزیز کے کے، ۱۹۷۵ء ص ۲۰۶-۲۰۹۔

۸۔ وارن ہیسٹنگز سے لارڈ منٹو تک کمپنی کی حکومت اسی پالیسی پر کاربند رہی۔ تبلیغ مسیحیت کے بارے میں لارڈ منٹو کی پالیسی کے بارے میں ملاحظہ ہو میور رمزے ۱۹۷۸ء ص ۲۵۱-۲۵۲۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۹۶-۲۹۷۔

۰۔ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء ص ۷۸-۷۹۔

۱۔ خان، سید احمد، سرو ۱۹۸۶ء ص ۱۲۴-۱۲۵۔

۲۔ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء ص ۲۸۹۔

۳۔ رضوی، سید محبوب، جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء "میرٹھ ڈویژن میں مسیحی مشن اور مسلمانوں کا ردعمل"، ص ۲۷؛ خان، سید احمد، ۱۹۸۶ء ص ۱۲۴-۱۲۵؛ ملک، اے آر، ۱۹۶۱ء ص ۱۹۲۔

۴۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء ص ۱۷۷-۱۷۸؛ سلیم، سید محمد، ۱۹۸۵ء ص ۱۷۹-۱۸۳؛ میور رمزے، ۱۹۷۸ء ص ۲۷۹، ۲۹۸-۳۰۱۔

۵۔ علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء ص ۱۷۸؛ سلیم، سید محمد، ۱۹۸۵ء ص ۱۷۳-۱۷۴؛ باسو (Basu)، بی ڈی، ص ۵۱-۵۲۔

۶۔ سلیم، سید محمد، ۱۹۸۵ء ص ۱۷۳-۱۷۴؛ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء ص ۱۰۲۔

۷۔ حالی، الطاف حسین، ۲۰۰۴ء ص ۳۱۶؛ ملک، اے آر، ۱۹۶۱ء ص ۲۰۴-۲۰۵۔

۸۔ صدیقی، عبدالحمید، ۱۹۶۵ء ص ۲۵-۲۶، ۲۹-۳۰؛ باسو (Basu)، ص ۱۰۵-۱۰۹؛ عزیز، کے کے، ۱۹۷۵ء

ص ۳۰۷-۳۰۸۔

۱۹۔ باسو (Basu)، ص ۱۰۸۔

۲۰۔ ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، ۱۹۳۶ء، ص ۲۵۱، ۲۶۱ و سوانح عمری؛ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء، ص ۲۸۹ خصوصی حاشیہ ۶ ۔

۲۱۔ ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، ۱۹۳۶ء، ص ۲۰۷۔

۲۲۔ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۵-۱۹۶، ۱۹۹۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی عبداللہ آتھم، ڈپٹی مولوی صفدر علی اور مولوی عماد الدین اور رجب علی وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں جو دولت اور عہدہ و منصب کے لالچ میں عیسائیت قبول کر کے اسلام کے خلاف زہر اگلنے لگے تھے۔ دیکھیے شہابی، مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء (دہلی دینی بکڈپو کمپنی)، ص ۳۱؛ اختر راہی، ''سید ناصر الدین ابو منصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظراتی ادب''، عالم اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد)، ۸، ۲ (اگست ۱۹۹۴ء)، ص ۵-۸؛ پادری اے ٹھاکر داس، خداوند مسیح کے نور (لاہور پنجاب رلیجس بک سوسائٹی ۱۹۲۵ء)، ص ۱۹-۱۲؛ گارسان دتاسی، مقالات گارسان دتاسی (دہلی انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۳ء)، ص ۷۹ و سوانح عمری؛ منشی محمد دین فوق، اخبار نویسوں کے حالات (لاہور رفاہ عام پریس، ۱۹۱۲ء)۔

۲۳۔ باسو (Basu)، ص ۱۸۲-۲۰۸۔

۲۴۔ دتاسی، گارسان، ۱۹۷۹ء، ص ۲۵۵۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۷۸۔

۲۶۔ خان، سید احمد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۱، ۱۲۷-۱۲۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۲۳-۱۲۵۔

۲۸۔ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۷-۲۷۸؛ ہنٹر، ۱۹۳۶ء، ص ۲۲۲-۲۳۵؛ ہارڈی پی (Hardy P)، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷-۳۸۔

۲۹۔ خان، سید احمد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۶-۱۲۷۔

۳۰۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، ۱۳۳۱ھ، ص ۱۸۵-۱۸۶؛ ہنٹر، ۱۹۳۶ء، ص ۲۵۵-۲۵۶۔

۳۱۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، ۱۳۲۲ھ، ج۱، ص ۱۲، ۹۳-۹۴؛ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ۱۹۶۰ء، ص ۳، ۴-۵، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۹۔

۳۲۔ ایضاً، ۱۹۶۰ء، ص ۲۲۵؛ ڈان، ثریا، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۸۔

۳۳۔ حکاک خاندان کے افراد دہلی میں مجسٹریٹ، ریذیڈنٹ اور آگرہ و قدیر کے محکمہ میں افسر تھے۔ ملاحظہ ہو خان، سید احمد، سن ۱۹۹۰ء، ج۲، ص ۱۵۲۔

۳۴۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ۱۹۶۰ء، ص ۲۱۲-۲۱۵؛ ڈان، ثریا، ۱۹۹۱ء، ص ۹۲۹؛ دیکھیے مسعود محمد خاں

دکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء ''شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی''، ص۵۷۔

۳۵۔ گیلانی، سید مناظر احسن، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت''، ج۲، ص۲۱۔

۳۶۔ صدیقی، افتخار احمد، ۱۹۷۱ء، ص۵۲۔

۳۷۔ خیر آبادی، محمد فضل حق، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء، ص۲۵۲-۲۵۷؛ خان، سید احمد، سر، ۱۹۸۶ء، ص۲۲-۲۳۔

۳۸۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، ''مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کی تصنیف 'اظہار الحق'''، ص۵-۳۰؛ ظفر، محمود احمد، حکیم، ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء، ص۱۱۷-۲۳۲۔

۳۹۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شہابی، انتظام اللہ، مفتی، ''مشاہیرِ جنگِ آزادی''، ص۱۳۹-۱۴۰؛ وہی مصنف، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، ص۲۸-۳۰؛ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۶ء ''دیباچہ''، ص۵؛ پوول (Powe)، ۱۹۹۳ء، ص۲۲۲-۲۲۸۔

۴۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے صابری، امداد، ۱۹۷۹ء، ص۱۹۸، ۲۱۲-۲۳۰؛ شہابی، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء''، ص۱۹، ۲۰-۲۳؛ وہی مصنف، مشاہیرِ جنگِ آزادی''، ۱۲۲-۱۲۶؛ سلیم، سید محمد، ۱۹۹۳ء، ص۸۳-۸۴؛ سعید اللہ محمد، ۲۰۰۲ء؛ امیر ادروی، س ن، ۲۰۰۳ء؛ پاول (Powell)، ۱۹۹۳ء، ص۲۲۹-۲۵۵۔

۴۱۔ رد عیسائیت اور تبلیغ اسلام کے باب میں مولانا سید ابوالمنصور دہلوی کی خدمات کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو دہلوی، بشیر الدین احمد ۲۰۰۱ء، ج۲، ص۲۱۶-۲۱۹؛ راہی، اختر، ''سید ناصر الدین ابو المنصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظراتی ادب''، ص۵-۱۲۔

۴۲۔ کاندھلوی، نور الحسن راشد، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی''، ص۴۰۹؛ دہلوی، بشیر الدین احمد ۲۰۰۱ء، ج۲، ص۳۱۷؛ گیلانی، سید مناظر احسن، ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت''، ج۲، ص۳۹۔

۴۳۔ حالی، ۲۰۰۲ء، ص۳۳۹۔

۴۴۔ ایضاً، ص۲۵، ۳۹۸-۴۰۱۔

۴۵۔ خان، سید احمد، سر، ۲۰۰۵ء، ص۱۹۲-۱۹۶؛ حالی، ۲۰۰۲ء، ص۲۳۵۔

۴۶۔ خان، سید احمد، سر، ۱۹۰۰ء، ص۳۹؛ وہی مصنف، ۲۰۰۵ء، ص۱۹۶۔

۴۷۔ حالی، ۲۰۰۲ء، ص۴۰۱۔

۴۸۔ ایضاً، ص۳۹۸۔

۴۹۔ ایضاً، ص۳۶۹۔

۵۰۔ لیلی ویلڈ، ڈیوڈ (Lelyveld, David)، ۱۹۹۱ء، ص۳۰۵-۳۰۷۔

۵۔ ایضاً، ص۳۰۷۔

۵۲۔ حالی، ۲۰۰۲ء، ص۳۹۶، ۳۹۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۸۲-۳۸۳، ۳۹۶-۳۹۹؛ سوانح عمری۔

۵۴۔ جین، ایم ایس (Jain, M.S)، ۱۹۷۹ء، ص ۶۷-۷۰، ۱۶۸-۱۷۰۔

۵۵۔ ندوی، سید ابوالحسن، ۱۹۸۱ء، ص ۹۵-۹۶۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۱-۱۰۲۔

۵۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے خیر آبادی، محمد فضل حق، مولانا، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء، ص ۲۱۶-۲۲۴؛ سنگوری، سید طفیل احمد، ۲۰۰۱ء، ص ۸۰-۸۳؛ مہر، غلام رسول، "پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی"، ص ۲۱۶-۲۳۸؛ رضوی، سید خورشید مصطفیٰ، ۲۰۰۷ء، سوانح عمری؛ ہارڈی (Hardy)، ۱۹۷۲ء، ص ۷۱-۷۷؛ الحق، سید معین، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۲-۲۳۸۔

۵۸۔ گیلانی، سید مناظر احسن، مولانا، "سوانح قاسمی"، ج ۲، ص ۲۸۱-۲۸۳۔

۵۹۔ رابنسن، فرانسس (Robinson, Francis)، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۰۔

۶۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے عنایت اللہ، محمد ۱۹۲۸ء، ص ۹۹؛ رابنسن (Robinson)، ۲۰۰۱ء، ص ۹۸-۹۹۔

۶۔ تاری محمود احمد، ۲۰۰۷ء، ص ۵-۶۔

۶۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے احمد قیام الدین ۱۹۷۶ء، ص ۲۶۲-۲۶۷، ۲۸۱-۳۱۶۔

۶۳۔ قادری، محمد ایوب، ۱۹۶۲ء "دیباچہ"، ص ۴۳۔

۶۴۔ تھانیسری، محمد جعفر، مولانا، ۱۹۶۲ء، ص ۱۷۵-۱۷۶۔

۶۵۔ دہلوی، سید محمد نذیر حسین محدث، مولانا، "فتاویٰ نذیریہ"، ج ۳، ص ۸۵۰۔

۶۶۔ بہاری، فضل حسین، مولانا، ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۶۔

۶۷۔ رضوی، سید محبوب، ۱۳۳۶ھ/۲۰۰۵ء، ج ۱، ص ۱۵۰-۱۵۱، ۱۵۵؛ اختر، سفیر، ۲۰۰۳ء، ص ۹۔

۶۸۔ فاروقی، ضیاء الحسن، ۱۹۶۳ء، ص ۲۸-۲۹؛ مٹکاف، باربرا ڈی (Metcalf, Barbara D)، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۲۔
دارالعلوم دیوبند میں رائج نصاب کی تفصیل کے لیے دیکھیے ندوی، سید سلمان حسینی، ۲۰۰۲ء، ص ۴۳، ۳۰۔

۶۹۔ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج ۲، ص ۲۷۹-۲۸۰؛ جالندھری، رشید احمد ۲۰۰۲ء، ج ۱، ص ۱۰۲، ۱۸، ۱۰۹؛ مٹکاف (Metcalf)، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۲؛ فاروقی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۸-۲۹، ۳۳-۳۵۔

۷۰۔ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج ۲، ص ۲۸۱۔

۷۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۸۲۔

۷۲۔ گیلانی، "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت"، ج ۲، ص ۳۹۔

۷۳۔ ایضاً، ج ۲، ص ۳۹؛ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج ۲، ص ۲۹۹-۳۰۰۔

۷۴۔ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج ۲، ص ۳۰۹۔

۷۵۔ گنگوہی، رشید احمد، مولانا، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۷۔

۷۶۔ سندھی، عبیداللہ، مولانا، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱۲-۳۱۳۔

۷۷۔ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج۲، ص ۳۱۱۔

۷۸۔ میاں، سید محمد، مولانا، "علماء حق"، ص ۱۲۱؛ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج۲، ص ۲۹۲-۲۹۵۔

۷۹۔ میاں، سید محمد، مولانا، "علماء حق"، ص ۱۲۱۔

۸۰۔ گیلانی، "سوانح قاسمی"، ج۲، ص ۲۹۶۔

۸۱۔ ایضاً، ج۲، ص ۲۹۳۔

۸۲۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، ۱۹۸۱ء، ص ۸۸۔

۸۳۔ شاہجہان پوری، ابو سلمان، ۱۹۸۸ء، ص ۹۹؛ میاں، سید محمد، "علماء حق"، ص ۲۱۲۔

۸۴۔ رضوی، سید محبوب، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ج۱، ص ۲۰۸۔

۸۵۔ تھانوی، محمد اشرف علی، مولانا، ۱۴۲۸ھ، ج۶، ص ۱۵۷-۱۵۸، محررہ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ۔

۸۶۔ ایضاً، ج۶، ص ۱۸۵-۱۸۶۔ علی گڑھ میں قیام سرسید احمد خان کے خیالات سے تاثر پذیری پیر علمی و تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل کے لیے دیکھیے اکرام ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۸-۱۲۹۔

۸۷۔ الہ آبادی، سید محمد غیاث الدین، مولانا، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۸-۲۳۱۔

۸۸۔ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰۸، حاشیہ ۱؛ اثری، ابو علی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۵-۱۹۶؛ بہاری، فضل حسین، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲۲۔ سید سلیمان ندوی اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں: "مولانا سید نذیر حسین کی درس گاہ سے جو نامور اُٹھے ان میں سے ایک مولانا ابراہیم آروی تھے جنھوں نے سب سے پہلے عربی تعلیم اور عربی مدارس میں اصلاح کا خیال قائم کیا اور مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ بحوالہ الفلاح، محمد عبدہ، مفتی، شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی"، ص ۱۱۱-۱۱۲۔

۸۹۔ نوشہروی، ابویحییٰ امام خان، "تراجم علمائے حدیث ہند"، ص ۳۶۱؛ اثری، ابو علی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۵-۱۹۶۔

۹۰۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، "حیات عبدالحی"، ص ۱۳۲-۱۳۳، ۱۹۳؛ الحسنی، سید محمد، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۶-۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۵؛ احمد عزیز، ۱۹۶۹ء، ص ۵۹؛ مٹکاف، ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۸-۳۲۹۔

۹۱۔ نعمانی، شبلی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۹۔

۹۲۔ الحسنی، محمد، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۵، ۱۵۸-۱۵۹۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴-۱۹۵۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۱۹۵-۱۹۶۔

۹۷۔ مٹکاف (Metcalf)، ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۴؛ ریاض، محمد قاسم، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۔

۹۸۔ ندوی، سید سلمان حسینی، ۲۰۰۴ء، ص۱۲۲،۱۲۴-۱۲۳، ۱۹۹-۲۲۲۔

۹۹۔ الحسنی، محمد ۱۹۸۴ء، ص۲۹۵۔

۰۰۔ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۶ء "دیباچہ"، ص۱۹-۲۰، مزید دیکھیے ص۱۳۱۔ دینی مدارس کے نصاب کی تدوین نو پر دینی مدارس میں انگریزی زبان کی تدریس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کے آراء و خیالات کے جائزہ کے لیے دیکھیے ضیاء الدین اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم (اعظم گڑھ دارالمصنفین، ۲۰۰۴ء)، ص۳۹-۸۲۔ مزید دیکھیے رحمان، ۲۰۰۴ء، ص۶۹-۷۳؛ اکرام ۱۹۹۲ء، ۱۸۲-۲۱۳۔

۰۔ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۶ء، ص۱۳۹-۱۴۰،۱۴۳۔

۰۲۔ ایضاً، ص۱۴۳۔

۰۳۔ ایضاً، ص۱۴۳-۱۴۴۔

۰۴۔ ایضاً "دیباچہ"، ص۱۹-۲۰۔

۰۵۔ ایضاً، ص۳۰۷، ندوی، شاہ معین الدین احمد "حیات سلیمان"، ص۳۷-۳۸، آزاد، ابوالکلام مولانا، ۲۰۰۳ء ص۳۵۵۔

۰۶۔ نعمانی، شبلی، ۱۹۸۹ء، ص۸۸-۸۹۔

۰۷۔ ایضاً، ص۸۶۔

۰۸۔ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۶ء "دیباچہ"، ص۲۰-۲۱۔

۰۹۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۰۔ ایضاً، ص۲۱۶۔

۔ ایضاً، ۲۲۷،۲۱۶، ۱۵۷۔

۲۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۳۔ ایضاً، ص۲۱۸۔

۳۔ ایضاً، ص۲۱۸-۲۲۰۔

۵۔ مجیب، ایم، ۱۹۶۷ء، ص۵۲۳۔

۶۔ ندوی، سید ابوالحسن علی، "حیات عبدالحی"، ص۱۵۱-۲۶۰، ۲۶۷-۲۶۸، ۲۷۰۔

۷۔ ندوی، سید سلیمان، ۱۹۵۲ء، ص۹۰-۹۱، حاشیہ۔

۸۔ روبنسن (Robinson)، ۲۰۰۱ء، ص۱۲۳۔

۹۔ عبدالحی، ابوالحسنات محمد مولانا، ۱۹۶۳ء، ص۵۵۹،۵۷۱-۵۷۲۔

۲۰۔ روبنسن، ۲۰۰۱ء، ص۱۲۲۔

۲۱۔ ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۲ء، ص۵۷۔

۲۲۔ ''بارہویں سالانہ رپورٹ مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل، لکھنؤ''، بحوالہ روبنسن، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۴-۱۲۵۔

۲۳۔ عنایت اللہ، محمد، ۱۹۲۸ء، ص ۱۱۹؛ عقیل، ۱۹۹۳ء، ص ۸۲-۸۳۔

۲۴۔ روبنسن (Robinson)، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲۵-۱۲۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۸-۱۲۹۔

فہرست اسنادِ محولہ

آزاد، ابوالکلام مولانا، ۲۰۰۳ء، ''خطباتِ آزاد''، مرتبہ مالک رام، بک ٹاک، لاہور۔

ندوی، ابوعلی، ۱۹۸۶ء، ''سید سلیمان ندوی''، دائرۃ المعارف، کراچی۔

احمد، عزیز، ۱۹۹۷ء، ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت''، مترجمہ جمیل جالبی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔

ـــــ، ۱۹۹۹ء، "An Intellectual History of Islam in India"، ایڈنبرا یونیورسٹی پریس، ایڈنبرا۔

احمد، قیام الدین، ۱۹۷۶ء، ''ہندوستان میں وہابی تحریک''، مترجمہ محمد مسلم عظیم آبادی، نفیس اکیڈمی، کراچی۔

اختر، سلیم، ۲۰۰۳ء، ''علماءِ دیوبند اور مطالعۂ مسیحیت''، دارالمعارف، لوسر شریف، واہ کینٹ۔

امیر ادروی، مولانا، ۲۰۰۲ء، ''مجاہدِ اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کے ایمان افروز علمی معرکے''، فرید بک ڈپو، دہلی۔

اصلاحی، ضیاء الدین، ۲۰۰۶ء، ''مسلمانوں کی تعلیم''، دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

اکرام، ایس ایم، ۱۹۹۱ء، "History of Muslim Civilization in India and Pakistan"، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور۔

ـــــ، ۱۹۹۴ء، ''یادگارِ شبلی''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔

الحسنی، سید محمد، ۱۹۸۲ء، ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء''، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی۔

ـــــ، سید عبدالحی، ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء، ''نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر''، نور محمد اصح المطابع [illegible]، تجارتِ کتب، کراچی۔

الفلاح، محمد عبدہ مولانا، جمادی الآخرہ ۱۴۱۷ھ/ اکتوبر ۱۹۹۶ء، ''شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی، ۱۲۲۰-۱۳۲۰ھ / ۱۸۰۵-۱۹۰۲ء''، مشمولہ ''محدث'' (لاہور)، ۹:۲۷، ص ۹۱-۱۲۶۔

الہ آبادی، سید محمد غیاث الدین، مولانا، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، "سوانح مسیح الامت"، جامعہ مفتاح العلوم، جلال آباد، مظفر نگر۔

باسو، بی۔ڈی، میجر (Basu, B D Major)، س ن، "History of Education Under the Rule of East India Company"، آر۔ چٹرجی، کلکتہ۔

بہاری، فضل حسین، مولانا، ۱۹۸۴ء، "الحیاۃ بعد المماۃ، سوانح حیات حضرت الامام سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی"، المکتبۃ الاثریہ سانگلہ ہل، شیخوپورہ۔

پاول، ایورل این (Powell, Avril Ann)، ۱۹۹۳ء، "Muslims and Missionaries in Pre-Mutiny India"، کرزن پریس، سرے (Surrey)، یو۔کے۔

تھانوی، محمد اشرف علی، مولانا، ۱۴۳۰ھ، "امداد الفتاویٰ"، مرتبہ مولانا مفتی محمد شفیع، مکتبۂ دارالعلوم کراچی۔

تھانیسری، محمد جعفر، مولوی، ۱۹۶۲ء، "تواریخ عجائب یعنی کالا پانی"، مرتبہ محمد ایوب قادری، سلمان اکیڈمی، کراچی۔

جالندھری، رشید احمد، ۲۰۰۴ء، "برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم: ایک ناقدانہ جائزہ (ج۱، دارالعلوم دیوبند)"، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

جین، ایم۔ایس (Jain, M S)، ۱۹۷۹ء، "The Aligarh Movement: Its Origin and Development, 1858-1906"، کریم سنز، کراچی۔

حالی، الطاف حسین، ۲۰۰۴ء، "حیات جاوید"، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

حسن، سہا، ۲۰۰۲ء، "[illegible]"، مکتبۂ دانیال کراچی۔

خان، سید احمد، سر، ۱۹۰۰ء، "مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید"، مرتبہ محمد امام الدین گجراتی، مصطفائی پریس، لاہور۔

خان، سید احمد، سر، ۱۹۹۰ء، "آثار الصنادید"، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی، دلی۔

خان، سید احمد، سر، ۲۰۰۵ء، "خود نوشت افکار سرسید"، مرتبہ ضیاء الدین لاہوری، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور۔

خان، سید احمد، سر، ۱۹۷۱ء، "اسباب بغاوت ہند"، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔

خیرآبادی، فضل حق، ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء، "باغی ہندوستان" (اردو ترجمہ "الثورۃ الہندیۃ")، مترجمہ عبدالشاہد خان شروانی، مکتبۂ قادریہ، لاہور۔

دہلوی، سید محمد نذیر حسین، س ن، "فتاویٰ نذیریہ"، دلی پرنٹنگ پریس، دہلی۔

دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، ۱۹۶۰ء، "ملفوظات شاہ عبدالعزیز"، مترجمہ و مرتبہ مولوی محمد علی لطفی و مفتی انتظام اللہ شہابی، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز، کراچی۔

دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، ۱۳۴۱ھ، "فتاویٰ عزیزی"، مطبع مجتبائی، دہلی۔

دھرماراج، جیکب ای (Dharmaraj, Jacob E)، ۱۹۹۳ء، "Colonialism and Christian Mission. Postcolonial Reflections"، انڈین سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچن نالج، دہلی۔
دناسی، گارساں، ۱۹۴۳ء، "مقالاتِ گارساں دتاسی"، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔
دتاسی، گارساں، ۱۹۷۹ء، "خطباتِ گارساں دتاسی"، مترجمہ محمد حمیداللہ و دیگر، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔
ڈار، ثریا، ۱۹۹۱ء، "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور اُن کی علمی خدمات"، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔
راہی، اختر، اگست ۱۹۹۴ء، "سید ناصرالدین ابو المنصور دہلوی اور مسیحی-مسلم مناظرتی ادب"، مشمولہ عالم اسلام اور عیسائیت" (اسلام آباد)، ۴:۸، ص ۵-۱۴۔
رضوی، سید خورشید مصطفیٰ، ۲۰۰۷ء، "تاریخ جنگ آزادی ہند"، یو پبلشرز، لاہور۔
رضوی، سید محبوب، جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء، "میرٹھ ڈویژن میں مسیحی مشن اور مسلمانوں کا رویہ"، مشمولہ عالم اسلام اور عیسائیت (اسلام آباد)، ۸:۱، ص ۷۹-۸۷۔
رضوی، سید محبوب، ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء، "تاریخ دارالعلوم دیوبند"، ادارۂ اسلامیات، لاہور۔
روبنسن، فرانسس (Robinson, Francis)، ۲۰۰۱ء، "The 'Ulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia" سی ہرسٹ اینڈ کمپنی، لندن۔
زمان، محمد قاسم، ۲۰۰۴ء، "The Ulama in Contemporary Islam Custodians of Change" آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی۔
سلیم، سید محمد، ۱۹۹۳ء، "مغربی زبانوں کے ماہر علماء"، ادارۂ تعلیمی تحقیق، لاہور۔
سلیم، سید محمد، ۱۹۸۵ء، "مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں"، ادارۂ تعلیمی تحقیق، لاہور۔
سندھی، عبیداللہ، مولانا، ۲۰۰۵ء، "افادات و ملفوظات امام عبیداللہ سندھیؒ"، مرتبہ محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔
شاہ جہان پوری، ابو سلمان، ۱۹۸۸ء، "شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی-ایک سیاسی مطالعہ مع سیاسی خطبات و فتاوی اور خطوط و بیانات"، مجلس یادگار شیخ الاسلام، کراچی۔
شہابی، انتظام اللہ، مفتی، سن ندارد، "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء"، دینی بک ڈپو، دہلی۔
شہابی، انتظام اللہ، مفتی، سن ندارد، "مشاہیر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء"، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔
صابری، امداد، ۱۹۷۹ء، "فرنگیوں کا جال"، کوہ نور پریس، دہلی۔
صدیقی، افتخار احمد، ۱۹۷۱ء، "مولوی نذیر احمد دہلوی- احوال و آثار"، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
صدیقی، عبدالحمید، ۱۹۶۵ء، "میکالے کا نظریۂ تعلیم"، دی ٹیکل ٹیچنگ لٹریری سوسائٹی، کراچی۔
ظفر، حکیم محمود احمد، ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء، "مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کے معاصرین"، تخلیقات، لاہور۔

عبدالحی، ابو الحسنات محمد، مولانا، ۱۹۶۴ء "مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی"، مترجم مولانا خورشید عالم، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

عبدالحی، ابوالحسنات محمد، مولانا، ۱۹۶۴ء "مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی"، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی۔

عبداللہ، محمد ۲۰۰۲ء "مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اُن کی دینی وعلمی خدمات"، مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی علوم اسلامیہ کلیۂ علوم اسلامیہ وشرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

عزیز، کے۔کے، ۱۹۷۵ء "The British in India. A Study in Imperialism"، قومی کمیشن برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد۔

عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ۱۹۹۲ء "تحریکِ پاکستان کا تعلیمی پس منظر"، ادارۂ تعلیمی تحقیق، لاہور۔

علی، عبداللہ یوسف، ۲۰۰۳ء "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ"، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور۔

عنایت اللہ، محمد ۱۹۳۱ء "تذکرۂ علمائے فرنگی محل"، لکھنؤ۔

غازی، محمود احمد، ۲۰۰۷ء "مغرب کا فکری و تہذیبی چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں"، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ۔

فاروقی، ضیاء الحسن، ۱۹۶۳ء "The Deoband School and the Demand for Pakistan"، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

فیضی، آصف اے۔اے، ۱۹۵۵ء "Outlines of Muhammadan Law" آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، لندن۔

قادری، محمد ایوب، ۱۹۶۴ء "مقدمہ"، مشمولہ مولوی محمد جعفر تھانیسری، "تواریخ عجائب یعنی کالا پانی"، سلمان اکیڈمی، کراچی۔

قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۸۷ء "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، مترجم ہلال احمد زبیری، شعبۂ تصنیف و تالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

کاندھلوی، نور الحسن راشد، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء "قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی"، صحیفہ نور۔خصوصی اشاعت (کاندھلہ، مظفر نگر)، شمارہ نمبر۱۔

گنگوہی، رشید احمد، مولانا، ۱۹۹۴ء "تالیفات رشیدیہ"، ادارۂ اسلامیات، لاہور۔

گیلانی، سید مناظر احسن، کیمن، "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت"، ندوۃ المصنفین، دہلی۔

گیلانی، سید مناظر احسن، کیمن، "سوانح قاسمی"، مکتبۂ رحمانیہ، لاہور۔

لیلی ویلڈ، ڈیوڈ (Lelyveld, David)، ۱۹۹۱ء "Aligarh's First Generation. Muslim Solidarity in British India"، بک ٹریڈرز، لاہور۔

مٹکاف، ڈی باربرا (Metcalf, Barbara D.)، ۲۰۰۲ء "Islamic Revival in British India,

"1860-1900" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی۔

مجیب، ایم، ۱۹۶۷ء "The Indian Muslims" جارج ایلن اینڈ آن ون، لندن۔

مسرا، بی بی (Misra, B B)، ۱۹۵۹ء "The Central Administration of the East India Company, 1773-1834" مانچسٹر یونیورسٹی پریس، مانچسٹر۔

مسعود، محمد خالد، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۵ء "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۷۴۶-۱۸۲۴ء)"، مشمولہ "المعارف" (لاہور)، ۳۸(۱۰-۱۲)، ص ۲۲-۶۲۔

معین الحق، سید، ۱۹۶۸ء "The Great Revolution of 1857"، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔

ملک، اے۔آر، ۱۹۶۱ء "British Policy and the Muslims in Bengal, 1757-1856"، ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان، ڈھاکہ۔

منگلوری، سید طفیل احمد، ۲۰۰۱ء "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، مکتبہ محمودیہ، لاہور۔

مہر، غلام رسول، س۔ن، "پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی"، غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

میاں، سید محمد، س۔ن، "علماء حق"، اسلامی کتب گھر، دیوبند۔

ندوی، سید ابوالحسن علی، س۔ن، "حیات عبدالحی"، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

ندوی، سید ابوالحسن علی، جولائی ۱۹۹۳ء، "مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ان کی تالیف 'اظہار الحق'"، مترجم عبداللہ عباس ندوی، مشمولہ "عالم اسلام اور عیسائیت" (اسلام آباد)، ۳(۷)، ص ۵-۱۳۔

ندوی، سید ابوالحسن علی، ۱۹۸۱ء "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش"، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

ندوی، سید سلمان حسینی، ۲۰۰۳ء "ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟"، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۳ء "یاد رفتگاں"، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۳ء "یاد رفتگاں"، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

ندوی، سید سلیمان، ۱۹۵۲ء "مکاتیب سید سلیمان ندوی"، مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ چراغ راہ، لاہور۔

ندوی، سید سلیمان، ۲۰۰۶ء "حیات شبلی"، دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

ندوی، شاہ معین الدین احمد، س۔ن، "حیات سلیمان"، دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

ندوی، محمد اسحاق و شمس تبریز خان، ۱۹۸۳-۱۹۸۴ء "تاریخ ندوۃ العلماء"، ۲ جلدیں، نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

نعمانی، شبلی، ۱۹۸۹ء "خطبات شبلی"، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور۔

والبرج، لنڈا ایس (Walbridge, Linda S)، ۲۰۰۳ء، The Christians of Pakistan. The Passion of "Bishop John Joseph"، روٹ لیج کرزن، لندن۔

ہارڈی، پی، ۱۹۷۲ء "The Muslims of British India"، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج۔

ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو، ۱۹۷۱ء "ہمارے ہندوستانی مسلمان"، مترجم صادق حسین، اقبال اکیڈمی، لاہور۔

Abstract

With the conquest of Delhi by the forces of East India Company in 1803, the military and political dominance of the British Empire on this region was complete. Now the cultural dominance of the ruling nation was inevitable. After the collapse of the War of Independence of 1857, the Ulama's stance towards Western culture, modern education and especially the English language was very hard. However, some of the 'Ulama' realized that to counter the Christian missionary activities, it is inevitable to acquire proficiencey in this language.

Maulana Shibli Nomani who advocated the idea of producing. This paper seeks to critically analyze the response of the 'Ulama' of Indo-Pakistan Subcontinent to the English language in its historical perspective. It endeavours to explore the caused of 'Ulama's' indifference towards the modern western education and English language especially their hostile attitude towards the teaching of English in madrassahs would be analyzed. In this paper the fatawa of the 'Ulama' dealing with the question of learning English language would be examined.

معیار ۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

'وزیر بیگم': کردار نگاری کی ایک مثالی جہت

شگفتہ حسین*

مشیل فوکو سے اُردو ادب کا تعارف اس وقت ہوا جب ساختیات، پس ساختیات اور رد تشکیل کا شہرہ ہوا۔ فوکو اس بات کا قائل ہے کہ حقیقت ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ ڈسکورس طاقت کے تشکیل میں بجائے متن کے ڈسکورس شامل ہے لہٰذا ڈسکورس فوکو کی تھیوری میں ایک وسیع نظام کے طور پر موجود نہیں ہے تاہم یہ اس کے کام کا نہایت اہم جز ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق ڈسکورس کے بارے میں سوچنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ڈسکورس علامتوں کا ایک گروہ نہیں بلکہ Practices کا نام ہے جنہیں ایک خاص نظام کے ذریعے کسی شے میں ڈھال دیا گیا ہو۔ جب ہم ڈسکورس کی بات کرتے ہیں تو ایک طرح سے ہم ڈسکورس سے پیدا ہونے والے اثرات کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں کئی قسم کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سچ کا اثر، طاقت کا اثر اور علم کا اثر وغیرہ وغیرہ۔ سچ سے فوکو کی مراد وہ نظریاتی اور خیالی خصوصیت نہیں ہے جس کا انسان صدیوں سے متلاشی ہے۔ فوکو کے نزدیک یہ سچ دنیاوی سچ سے ہٹ کر ہے۔ فوکو یہ سمجھتا ہے کہ ہر علاقے میں اپنا علاقائی سچ ہوتا ہے اور ہر علاقے میں سچ کی ایک عام سیاست ہوتی ہے اور اس علاقے کا ڈسکورس اسی سچ کے نظام کو بیان کرتا ہے۔ چنانچہ یک معاشرے کا سچ وہ ہے جسے معاشرہ قبول کرتا ہے۔ ۲

فوکو کے ہاں ڈسکورس میں طاقت ایک بہت اہم عنصر ہے۔ طاقت سے مراد کسی چیز پر قبضہ نہیں کسی کا حق چھیننا نہیں ہے جیسے مارکسسٹوں کے نزدیک طاقت کے تعلقات معاشی تعلقات سے متعین ہوتے ہیں ایسا بھی نہیں بلکہ فوکو کے نزدیک طاقت سے مراد کسی کو اپنی خواہش کے مطابق سوچنے سے روکنا یا کسی کی آزادی کو محدود کرنا ہے۔ ۳ سچ یہ ہے کہ طاقت اور طاقت کا استعمال انسان کے تمام رشتوں اور تمام رویوں میں موجود ہے۔

فوکو ڈسکورس سے مراد خیالات، رویے، موقف سبھی کچھ لیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جو ڈسکورس کی طاقت رکھتے ہیں وہ ان کو جو ڈسکورس کی طاقت نہ رکھتے ہوں اپنے حکم پر چلاتے ہیں۔ ۴

ایڈورڈ سعید اپنی کتاب شرق شناسی (Orientalism) میں مشرق پر نوآبادیاتی نظام مسلط کرنے والے سفید فاموں کے بارے میں لکھتا ہے

> ''سفید فام آدمی کے مصنوعی چہرے کے پیچھے ہمیشہ طاقت استعمال کرنے کے لیے آمادگی موجود ہوتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ مرنے مارنے کے لیے تیار رہتا ہے۔۔۔۔ سفید فام ہونا ایک تصور اور ایک حقیقت تھا اس حقیقت کا تقاضا یہ تھا کہ سفید اور غیر سفید دنیاؤں کے بارے میں ایک منطقی رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نوآبادیات میں ہوتے ہوئے ایک خاص طریقے سے بات کی جائے، قواعد کے ایک مجموعے کے مطابق طرزِ عمل

* صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، کچہری روڈ، ملتان

جسم، چالی، ریوں، حوتی، ایک ایک بات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے فاروقی صاحب بلا مبالغہ تین صفحے لے لیتے ہیں۔ وزیر بیگم کا جادو اُن پر ہر اس لمحے سر چڑھ کر بولتا ہے جب وہ کسی مرد کو گھائل کرنے کی تیاری میں ہوتی ہے۔ اس لمحے انھیں خود بھی اس امر کا احساس ہے کہ اس کے سوانی حسن کی گہرائیوں کو ناپنے کے لیے "تیر کا کلیجہ اور تیندوے کی بے حیائی" [34] درکار ہوتی ہے۔ عالم وصال کا نقشہ بھی اس خوبصورتی سے کھینچتے ہیں کہ سراپا بے ساختہ نہیں جاتا۔ چھوٹی بیگم سے ان کی محبت ہی انھیں اس بات پر بھی مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کا دفاع بھی کریں لاکھ بند مل سکیں کہ اس کے لالچی پن کو بیان کیا ہے لیکن حقیقت میں انھیں اس کا کھیل ہوا بُرا نہیں لگتا۔ وزیر بیگم کے دل و دماغ کی کشمکش، بچوں کے بے فکر ہونا، نکاح کے بارے میں سوچنا، پھر متشرع مولویوں کی مثالیں دینا کہ وہ بھی تو دو دو غیر منکوحہ بیویاں رکھے بیٹھے ہیں۔ بظاہر یہ وہ تسلیاں ہیں جو وہ وزیر خانم کو دے رہے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور اس حقیقت کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس شخص کی معتوبیت سے آگاہ ہوتے ہیں، کیوں کہ یہی شخص علامت ہے وزیر بیگم کے مردوں سے تعلقات کی۔

چھوٹی بیگم کی داستان حیات کے آغاز سے پہلے آپ کو اسی شخص سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ جس کی بڑی بڑی جادئی آنکھیں، سیدھی ناک ہے، جس میں بڑا سا بلاق اور بلاق میں سرمئی موتی، گردن اونچی اور کچھ اس طرح سے بلند ہے کہ اس رنگ کی کامدار ساری، چہرے سے سر ڈھکا ہوا لیکن ساری اس قدر باریک کہ سر کا ایک ایک بال، مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرے، ماتھے کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت ہیرے، گول سیدھا اور ناظرے صاف جھلکتے ہیں، کھلتا ہوا گندمی رنگ، منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ کی رمق ہے۔ یہ شخص، کوئی حقیقی لڑکی نہیں ہے کشن گڑھ کی شری رادھا ہیں جن کی دودھ جیسی بار اور شیریں انگلیوں میں پنکھڑیوں والا سرمئی کنول کی بڑی سی شاداب کلی ___ دل کی علامت ہے اور دوسری کرشن جی کا رنگ بھی نیلگوں یا سانولا ہی پیش کیا جاتا ہے۔ ماضی بعید سے کشن گڑھ کے مصور اسی شخص کے نام سے شری رادھا کی تصویریں ہی بناتے آئے تھے۔ وزیر خانم کے جد امجد میاں مخصوص اللہ بھی کشن گڑھ کے شبیہ ساز ہیں اور جب بستر مرگ پر ہیں تو ان کے بے جان ہاتھ اسی شخص کی شبیہ ہی تھامے ہوتے ہیں۔ ہندو دیو مالا میں عشق و محبت کا دیوتا ہے جس کے دو روپ ہیں ایک رام دوسرا کرشن۔ رام اور سیتا کا عشق میاں بیوی کی محبت کی نمائندگی کرتا ہے لیکن رادھا اور کرشن کا عشق ایک بیاہتا عورت کا دوسرے شادی شدہ مرد سے عشق ہے۔ یہ "Extra Marital Love" ہندو معاشرت میں آئیڈیلائز کیا جاتا ہے کراہیت کا باعث نہیں بنتا بلکہ تقدیس کا حامل قرار پاتا ہے۔ رادھا کی خیالی شبیہ ہی شخص کہلاتی ہے لیکن اگر آپ ایک لمحے کے لیے ایک طرف رادھا کی شبیہ اور دوسری طرف وزیر خانم کی تصویر رکھیں اور دونوں کو غور سے دیکھیں تو آپ کو ان میں بال برابر فرق دکھائی نہ دے گا بقول سہیل عباس ناول کے اختتام پر ایسا لگتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی خود مخصوص اللہ ہے اور یہ شخص اصل میں وزیر خانم ہے۔" [35] دونوں ہی بڑی بڑی جادئی آنکھوں والی ناک میں بڑا سا موتی سجائے، سر پر باریک آنچل ڈالے بیٹھی ہیں۔ رادھا اور کرشن کے جسمانی تعلقات کے حوالے سے چھوٹی بیگم کے مردوں سے تعلقات اور چھوٹی بیگم کے علاوہ بھی کئی دوسری ہندوستانی عورتوں کا انگریزوں، نوابوں، رئیسوں اور مولویوں کی بے نکاحی بیبیاں ہونا سمجھ میں آتا ہے گویا یہ وہ سچ ہے جو اس عہد کا سچ ہے جسے اس عہد کا معاشرہ قبول کر چکا ہے۔ نواب شمس الدین احمد خان کے ساتھ پہلی رات گزارنے کے بعد فجر کے وقت وزیر خانم خواب دیکھتی ہے کہ اس کی خواب گاہ ایک مرقع ہے جس میں شاہانہ انداز کی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر جگمگا رہی ہے گویا ابھی ابھی تیار ہوئی ہو لیکن کوئی تصویر سا[illegible] نہیں کہ ہوا کے جھونکوں سے مرقعے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ ایک ذرا دیر کو وہ ٹھہری تو اس کی نگاہ بھی ٹھہری، یہ تو اسی شخص کی تصویر تھی۔" [36] نواب صاحب کے وصال سے شاد کام ہونے کے بعد یہ خواب اسی شخص کی تصویر کی معتوبیت کی حامل ہے۔

فوکو کے ڈسکورس کے مطابق طاقت کا مرکز تبدیل ہوتا رہتا ہے چنانچہ وہ چھوٹی بیگم جو نسائی طاقت کے بل پر حکومت کرتی ہے جب سے وہ مضبوط سماجی اور سیاسی طاقتوں کے سامنے کمزور اور بے بس ہو جاتی ہے یہاں یاسمین حمید سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "اس زمانے میں عورت ہونا کس قدر مشکل اور خوف انگیز رہا ہوگا ۔۔۔۔ نہ کوئی تشخص اور نہ کوئی تحفظ اور سلامتی۔" [37] وزیر بیگم کے بچے چھین لیے جاتے ہیں وہ اپنی خواہش کے مطابق اسلامی طریقے سے ان کی پرورش نہیں کر سکتی۔ پیاں مارا گیا تو اسے سسرال سے نکلنا پڑا اگر دیا اس [illegible]

تو اس لیے کہ اس کا وعدہ تھا وہ اس کی تربیت سسرال کے مطابق کرے گی۔ پھر بھی بچہ اس کے ساتھ شاہی قلعے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ مگر اس پر کہ اس کی توجہ کا مرکز صرف اس کا شوہر میرزا فخرو ہے۔ وہ خوب سمجھتی ہے لیکن مجبور اور خاموش ہے اور اسی خاموشی کے ساتھ وہ میرزا فخرو کی وفات کے بعد شاہی قلعے سے بھی نکل جاتی ہے۔ تھامس ہارڈی کی ٹیس مجھے بہت پسند ہے۔ انگریزی ادب کا خوبصورت کردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہارڈی نے بڑے پیار سے اس کردار کو پروان چڑھایا، بنایا، سنوارا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ کردیا۔ وزیر بیگم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی المیہ پیش آتا ہے کہ وہ جو بڑے اعتماد سے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادی ہے آج پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں چھپی سر جھکائے بیٹھی کو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ اس لمحے اسے شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی تنہا چھوڑ دیا ہے۔

1 Sara Mills "Discourse", 1997, New York, Routledge, P 17
2 Miche Foucault "Power/Truth/Strategy", 1979, Sydney, Feral Publications, P 46
3 Sara Mills "Discourse", P 19

۴۔ گوپی چند نارنگ ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، ۱۹۹۴ء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۹۳۔
۵۔ ایڈورڈ سعید ''مشرق شناسی''، مترجم محمد عباس، ۲۰۰۵ء، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ص ۳۲۷۔
۶۔ احمد محفوظ ''اردو کا شاہکار ناول: کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (مضمون) مشمولہ ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی۔
File //D:\Download\Ilyas\Shamsur Rehman Faruqi
۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (ناول)، ۲۰۰۶ء، کراچی، شہرزاد، ص ۲۱۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔
۹۔ ایضاً، ص ۱۱۳-۱۱۴۔
۰۔ ایضاً، ص ۱۱۶۔
۔ ایضاً، ص ۱۷۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۳۱۔
۳۔ ایضاً، ص ۲۳۱-۲۳۲۔
۴۔ ایضاً، ص ۲۶۴۔
۵۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔
۶۔ ایضاً، ص ۵۶۱۔
۷۔ ایضاً، ص ۲۳۸-۲۳۹۔

۸ ۔ ایضاً، ص۲۷۷۔

۹ ۔ انتظار حسین، ڈان، کراچی، ۳۰ جولائی ۲۰۰۶ء۔

۲۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (ناول)، ص۱۲۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص۲۰۵۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۰۷-۱۰۸۔

۲۳۔ سہیل عباس خان، روزنامہ جنگ، ملتان، ۲۱ جولائی ۲۰۰۶ء۔

۲۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (ناول)، ص۳۳۲۔

۲۵۔ یاسمین حمید، مجلہ شب خون، الٰہ آباد، نمبر۲۹۰، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء، ص۳۔

Abstract

Michel Foucault and his discourse theory were introduced in Urdu literature when critics were enthusiastic ally discussing structuralism, post-structuralism and deconstruction. Foucault used the term 'Discourse' in his discussions of power, knowledge and truth and 'power' is a key element in his discussion of discourse. According to Foucault, it is power that decides discourse. Novel "Kayi Chand The Sare Aasman" by Shamsur Rehman Farooqi is one of the best novels in Urdu literature. It portrays the era of Mughal Empire which was declining and sub-continent was gradually becoming a colony of powerful Britain. Hind-European civilization was taking place of Hind- slamic civilization. Institution of marriage and social relations sti l existed but its santity was influenced by the keeps. Wazir Begum (Chob Begum) is the heroin of this novel who does not want to marry but desires and prefers to be a keep of any powerful man. She is well aware of her feminine power and enchanting beauty. According to Foucault's discourse theory power has its own

weaknesses, so after the death of Prince Mirza Fakhrou, powerful society forces her to submit before the powerful society and she leaves royal palace quietly

معیار، علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، شمارہ [illegible]، جنوری - جون [illegible]

ناصر کاظمی کی شاعری، کرب ذات سے آگے

یاسمین سلطانہ*

قیام پاکستان نے برعظیم کے عوام کی زندگی کی بساط پلٹ کر رکھ دی۔ آزادی کے بعد سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تقاضے بدل چکے تھے۔ سامراجی قوت کا تسلط ختم ہونے کے بعد سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر نئے فیصلوں کا وقت تھا۔ شاعروں اور مصنفوں کے لیے مخصوص روش کو چھوڑ کر نئے فیصلوں کا وقت تھا۔ شاعروں اور مصنفوں کے لیے مخصوص روش کو چھوڑ کر نئے راستے اختیار کرنا مشکل مرحلہ تھا۔ قیام پاکستان کے پر آشوب دور نے ادب پر خاص اثرات مرتب کیے۔ آزادی سے پہلے نئی تعلیم اور نئی تہذیب کا چرچا تھا۔ شاعروں نے تصوف اوہام پرستی، مافوق الفطرت عناصر قوتوں پر یقین، دہری اور دیوانگی کے تصورات سے کنارہ کشی اختیار کر کے کچھ نئے تصورات کو جنم دیا۔ وہ تصورات جن کا تعلق مادی زندگی کی فلاح و بہبود اور روز مرہ کے مسائل کا حل تلاش کرنے سے تھا۔ تقسیم ہند کے کچھ دنوں بعد تک ہمارے شعراء کے ہاں یہ تصورات یعنی جمہوریت، اشتراکیت، بغاوت اور انقلاب جیسے موضوعات موجود تھے۔ شاعر زندگی کی ان تلخیوں کو جھیل رہا تھا اس لیے شاعری میں ان کے بارے میں ردِ عمل کا اظہار کرتا تھا۔

بدلتے ہوئے وقت نے آزادی کے حصول کو ممکن بنایا لیکن اس تقسیم کے بعد جب خوابوں اور آدرشوں کا طلسم ٹوٹا تو شاعر حضرت اس احساس شکست سے خود کو بچا نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعراء ماضی قریب کے شعراء کی نسبت ماضی بعید کے شعراء کے قریب نظر آنے لگے۔ انھیں حالی کی اصلاحی شاعری، اقبال کی ملت پرستی، جوش کا نعرہ انقلاب، سردار جعفری کی اشتراکیت خاص حد تک پرانی لگنے لگی اور میر کی دردمندی، غالب کی تشکیک اور احساس شکست یگانہ و فراق کی نفسیاتی پیچیدگی کی کیفیت زیادہ سچی اور حقیقت سے قریب نظر آنے لگی۔[1]

تقسیم کے بعد اردو غزل میں کئی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں سب سے منفرد اور اپنا آپ منوانے والی آواز ناصر کاظمی کی تھی۔ ترقی پسند تحریک ہو یا حلقہ ارباب ذوق کی تحریک، سب کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ تقسیم کے تجربے کو انھوں نے اپنے اپنے نظریات کے تحت تجزیہ کیا جبکہ ناصر کاظمی کے پاس کوئی نظریہ نہ تھا۔ ناصر اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے اپنی اندرونی مضطرب شخصیت اور عصر کی ہیئت میں زبردست ہم آہنگی محسوس کی اور جو خارجی مسائل سمیت اپنے خیالات و تجربات کا بہتر اظہار غزل ہی میں کر سکتے تھے۔ شعراء کے اس گروہ میں جس میں ناصر کاظمی کے علاوہ منیر نیازی، عزیز حامد مدنی، ابن انشاء اور دوسرے شاعر شامل تھے، غزل کو محدود نظر ہونے سے [illegible] اور [illegible] میں قابل قدر اضافے کیے۔ ناصر نے غزل کا پرچم اس وقت بلند کیا، جب کہ سارے برعظیم میں اردو شاعری کا سب سے بڑا ہیئتی نظموں میں

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، محکمہ تعلیمات، حکومت سندھ، رہائش A-88 [illegible] کراچی

فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا ۱۰

رہ و رسم احباب سے کٹ گئے
ہم اپنی روایات سے کٹ گئے ۱۱

شاعروں اور ادیبوں کے شہر، شہرِ دلّی پر بار بار قیامت ٹوٹتی رہی۔ دلّی اجڑنے کا یہ درد ہر رنگ شعراء کے یہاں سے ہوتا ہوا ناصر تک آ پہنچا۔

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ ۱۲

جو شخص دلّی کے اجڑنے پر اتنا ملول نظر آرہا ہو وہ اپنے شہر کے اجڑنے پر کیسے کیسے نہ تڑپا ہوگا۔ اس کا وہ شہر لٹ گیا جہاں اس نے آنکھ کھولی، بچپن اور لڑکپن کے دن گزارے، جہاں اس کے سنگی ساتھیوں کی یادیں بکھری تھیں۔ ناصر اپنے شہر انبالہ کے لٹنے پر بڑے دلگیر نظر آتے ہیں۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی ۱۳

ناصر نے جب انبالہ سے لاہور ہجرت کی تو یہاں کی دنیا انبالہ سے الگ لگی۔ دراصل ہجرت سے ایک تو موجود رشتوں سے دوری ہوتی ہے اور نئے انسانوں سے تعلق جڑتا ہے دوسرے وطن سے اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کا احساس ابھرتا ہے۔ ناصر کے لئے یہ نقل مکانی ایک بھرپور تجربہ رہا۔ اس حوالے سے ان کی شاعری میں اداسی کی فضا، یادوں اور جدائی کے استعارے ایک کسک کے ساتھ ابھرتے ہیں۔

میں اس شہر میں کیوں آیا تھا
میرا کون یہاں رہتا تھا ۱۴

مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا ۱۵

ناصر بار بار ماضی کی طرف مراجعت کرتے نظر آتے ہیں۔ ماضی میں پہنچتے ہی ناصر کی یادوں کے گلاب کھل جاتے ہیں۔ وہ ان رونقوں کو، ان لوگوں کو یاد کرتے ہیں جن سے ان کے دل کے تار ملتے تھے۔

یاد آتی ہیں دور کی باتیں
پیار سے دیکھتا ہے جب کوئی ۱۶

بچپن میں بھی وہی کھلاڑی تھا ہے یاسیت

جس نے اونچی ڈال سے توڑے وہ دو شہرے پھیر چلے

دل ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے ۱۸؎

ناصر بے شک ہجرت کے دکھ پر نوحہ خواں نظر آتا ہے لیکن ان نوحوں کے بعد وہ ایک عزم کے ساتھ زندگی کا دامن پکڑتے ہیں۔ نئی منزل اور نئے موسموں کے حوالے سے زندگی کی بات کرتے ہیں اور زندگی بسر کرنے کی راہ سجھاتے ہیں۔ ان کے لہجے میں ہجرت کا درد تو نظر آتا ہے مگر مایوسی نہیں۔ وہ اردگرد کے مسائل سے نظر چرا کر کسی خواب میں پناہ نہیں لیتے بلکہ زندگی سے وابستہ حقائق کے ادراک کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر قبول کرتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی یہ احساس دلاتے ہیں کہ ماضی کی زندگی اپنے سارے حسن کے ساتھ حل کر رہ گئی ہے اور ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس خاکستر سے نئی زندگی پیدا کرنا پڑے گی۔ یوں ناصر شروع میں ہجرت کا المیہ اور اداسی اور آخر میں امید کی کرن دکھا کر زندگی کے دونوں رخوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

گئے دنوں کی لاش پہ پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آ گیا ۱۹؎

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی ۲۰؎

اندھیروں کی نگری میں پھوٹی کرن
مہکنے لگی خاک دامن کمن ۲۱؎

جس ملک کے حصول کے لئے بزرگوں نے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا، انہوں کی بیدرانی سی تھی، بے سرو سامانی کا عذاب جھیلا تھا، اس ملک کی فضا بہر آلودہ ہونے لگی وہ اس سرزمین سے وابستہ امیدیں دم توڑنے لگیں۔ سطحی ذہن کے سیاستدانوں کی بدولت اس ملک کا جو حشر ہوا اور اس کے شہروں میں جس قسم کے منتظم ذہن پیدا ہوئے، اس غیر حساس اور غیر ریشتی ذہن کے سامنے شاعر کا جواب دہ ہونا ہونا کہ عذاب تھا۔ ۲۲؎

اڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے ۲۳؎

نیا شور لے کر جو دریا اٹھے
سمندر گئے اور شوری اٹھے ۲۴؎

جنھیں زندگی کا شعور تھا انھیں بے زری نے بچھا دیا

جو گریں تھے سینہ خاک پر وہی بن کے بیٹھے ہیں معتبر ۱۵۵

جب بے یقینی پیدا ہوتی ہے اعتبار اٹھ جاتا ہے تو ایسے شکوک و شبہات کی فضا میں ڈر، خوف اور دہشت جیسے عناصر جنم لیتے ہیں۔ ناصر کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ کبھی اسے کوئی دور سے آواز دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو کبھی اندھیری رات میں مناظر دیکھ کے کچھ نظر آتے ہیں وہ خود سے بھی ڈر نے لگتا ہے کبھی ڈراؤنی شکل کی جادوگرنی اسے نظر آتی ہے حتیٰ کہ اس کی یاد بھی خوف اور وسوسوں سے خالی نہیں ہوتی۔ آنکھیں بند ہوتے ہی ڈراؤنے خواب اسے ستانے لگتے ہیں۔

دیکھ کے دو چلتے سایوں کو
میں تو اچانک سہم گیا تھا
ایک کے دونوں پاؤں غائب تھے
ایک کا پورا ہاتھ کٹا تھا ۱۵۶

ایک جادوگرنی وہاں دیکھی
اس کی شکل سے ڈر لگتا تھا
بڑی بوڑھی صاف عیاں تھی
پیٹ کمر سے آن ملا تھا ۱۵۷

آزادی کا سورج اپنے ساتھ بے شمار مسائل لے کر آیا۔ کہیں نئی آبادکاری کا مسئلہ تھا تو کہیں حصول روزگار کا۔ یہ ہجرت، ہجرت مدینہ نہ تھی کہ اپنے ملک کے ہم وطن و ہم مذہب بھائی ایک دوسرے کے لیے جان و مال کا بٹوارہ برداشت کر لیتے۔ یہاں تو یک نفسا نفسی کا عالم تھا۔ انسانی رشتوں میں خلوص، دردمندی، اپنائیت جیسے جذبوں کا فقدان تھا۔ ناصر کا حساس ذہن تخیل سے حقیقت کا فرق دیکھ کر اداسی اور محرومی میں ڈوبنے لگا۔ انسانی رویوں کی ناہمواری نے شہر والوں سے گلے شکوے بڑھا دیے۔ جبر اور مظالم کے مناظر انھیں بے قرار کرنے کے لیے کافی تھے۔ انھیں خاک نشینوں کے مسائل کا بھی علم تھا اور کج کلاہوں کی حکمت عملی کا بھی۔ ناصر اس تکلیف دہ صورت حال کا خاتمہ چاہتے تھے۔

شہر خلق خدا سے بیگانہ
کارواں میر کارواں سے دور ۱۵۸

یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ ۱۵۹

کب تک بیٹھے ہاتھ ملیں
چل ساتھی کہیں اور چلیں ۱۶۰
تمہیں دل گرفتہ نہیں دوستو

ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گلے ؎۱

کب سے کیوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں
کب سے پڑی ہے جو لو میں تربت شہر بے کفن ؎۲

جب انسان بے بس ہو جاتا ہے اس کے گلے شکوے سننے والے کان بند ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف مایوسی اور نا امیدی نظر آتی ہے تب بھی ایک در کھلا ہوتا ہے جو سب کی فریاد سنتا ہے اور انسان اسی پروردگار کے آگے فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ناصر کو جب زمیں و آسماں اپنے مخالف نظر آنے لگے تو اس کے لبوں پر فریاد آ گئی۔

اے میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا ؎۳

مسلمانوں کی غربت اور ظلم و ستم سے بھرپور معاشرے کی تصویریں ان کی آنکھوں میں تھیں۔ وہ اپنے وطن کے غریبوں کی حالت زار پر بے انتہا کڑھتے تھے۔ ان کے کرب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سارے زمینداروں کو جب زمینیں واپس ملنے کی امید ہوئی تو ناصر نے کہا "اگر سب لوگ اپنی زمینیں کاشتکاروں کو دے دیں تو میں بھی خوشی سے ایسا کروں گا۔ بھائی آپ کو پتہ ہے یہ کسان اور مزدور میرے قبیلے کے لوگ ہیں" ؎۴ وہ کہتے ہیں

؎ اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں ؎۵

کڑوے خواب غریبوں کے
میٹھی نیند امیروں کی ؎۶

جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا ایک دیا ؎۷

ناصر کاظمی کو اقبال کی طرح شہر لاہور سے بھی ہمیشہ انس رہا۔ انھوں نے اس شہر کے سناٹوں سے دوستی کی، اور حسن اور رعنائیوں سے دوستی کی، اس کی سڑکیں اور اس کی گلیاں اس کی یادیں بنیں۔ جب ناصر نے اس شہر کے روشن ستاروں کو ٹوٹتے دیکھا تو وہ خود ٹوٹ کر رہ گیا۔

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا
اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

بارہ بند ہوا رستے سنسان ہے چراغ ۳۸

شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو ۳۹

ناصر کاظمی نے اپنے اشعار میں لاہور کا نوحہ بیان کیا ہے۔ جب لاہور کی ٹھنڈی سڑک، مال روڈ سے اشجار کو بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا ناصر کو چونکہ درخت، پودوں، پھولوں سے عشق تھا اس لیے ان سے درختوں کا اجڑنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

پھیاں روتی ہیں سر پٹختی ہیں
قتل گل عام ہوا ہے اب کے ۴۰

۱۹۶۵ میں پاکستان کو ایک نئی جنگ کا سامنا تھا لیکن یہ جنگ کچھ حاصل کرنے کی جنگ نہ تھی بلکہ حاصل کردہ دولت کو بچانے کی جنگ تھی۔ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ہر اوں جیالے سرحد پر اپنا فرض نبھانے کے لیے گولہ کی جنگ لڑ رہے تھے تو اندرون ملک ادیب اپنے قلم کے ذریعے اپنے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اس موقع پر دیگر شعراء کی طرح ناصر نے بھی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اپنا کردار ادا کیا۔ اس سترہ روزہ جنگ میں انھوں نے سترہ ترانے لکھ ڈالے۔ ایسے ناصر نے ان ترانوں کے ذریعے اپنے ملک و قوم سے محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا۔

پاک فوج کے جوانو ہے عزم کا نشاں
تیری ایک ضرب سے کوہسار کٹ گئے
دشمنوں کے مورچے جھپٹ گئے الٹ گئے
زلزلے پلٹ گئے ۴۱

پاک فوج ہے تیری کافلہ ایک وار بس اور دکھا دے
اٹھ اور ناصل کالے کر دشمن کو مٹی میں ملا دے ۴۲

جنگ کے بعد اعزازات اور انعامات پانے والے، تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لوگوں کو ایک طویل فہرست کا اعلان ہو لیکن ناصر کا نام اس میں کہیں نہ تھا۔ بحیثیت شاعر ناصر کی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر کبھی نہیں کیا گیا۔ نہ تو ان کی زندگی میں اور نہ ہی ان کی وفات کے بعد۔ ۴۳

ناصر نے زمانے کی بے حسی اور بے قدری کے المیے کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔

میں ہوں ایک شاعر بے نوا مجھے کون چاہے مرے سوا
میں امیر شام عجم نہیں میں کبیر کو فہ و مصر نہیں ۴۴
گل دیہ میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ

گل چیں کا بس چلے تو یہ فن مجھ سے چھین لے ۴۶

بے حسی اور بے قدری کا احساس ناصر کے اندر تلخی اور غصے کا موجب بنتا گیا۔ انہیں یہ احساس ستانے لگا کہ زر پرست ظالم ان کی شاعری اور شاعرانہ عظمت و بڑائی کے درپے ہے۔ یہ احساس ان کے کلام میں غصے کی کیفیت بھر دیتا ہے۔

ممکن نہیں متاع سخن مجھ سے چھین لے
گو باغباں یہ کنج چمن مجھ سے چھین لے
سینچیں ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
کس کی مجال میرا چمن مجھ سے چھین لے ۴۷

انہیں اپنے فن کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ اس یقین نے ان کے اندر ایک احساس تفاخر پیدا کر دیا تھا۔ وہ لوگوں کو اس وقت سے ڈرانے لگے جب ان جیسا انسان اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ جن کا فن پارہ انہیں دیکھنے کو ملے گا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد زمانہ ان جیسا شاعر اور ان کے کلام کو یاد کر کے ترسے گا۔

زبان سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرز سخن کو ترسے گا
انہیں کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبت ارباب فن کو ترسے گا ۴۸

"تنہائی" ہمیشہ سے شاعروں اور ادیبوں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہونے کی وجہ سے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا ہے۔ حساس تنہائی انیسویں صدی کے شعراء کی طرح بیسویں صدی کے بھی اکثر شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ ناصر جیسے حساس شاعر نے تنہائی کو بہت گہرائی سے محسوس کیا ہے۔

او پچھلی رات کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں ۴۹
تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نور ۵۰

ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ ۵۱

ناصر نے اس تنہائی میں خود کو ڈوب کرتا ہوئے سے بچائے رکھا۔ اس تنہائی کو انھوں نے اپنے لیے محفل بنالی۔ یہی تنہائی کبھی کبھی ان کے دل کی وحشت بن جایا کرتی تھی۔

وہ وحشت میرے دل میں چھپی تھی

میں جسے ایر ڈھونڈ رہا تھا
تنہائی میرے دل کی جنت
میں تنہا ہوں، میں تنہا ہوں ۵۲؎

یہ تنہائی ہے جس اداسی کو جنم دیا اس اداسی نے ناصر کے کلام کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ان کی یہ اداسی اشعار میں ڈھلنے لگی اور سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی۔ ناصر اپنے گردونواح کے ماحول میں اداس ہوتا اور شاعری کے ذریعے یہ اداسی لوگوں کے دلوں میں اتار دیتا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے ۵۳؎

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ
اداسی بال کھولے سو رہی ہے ۵۴؎

رات تنہائی کا بھی سمبل ہے، اندھیرے کی اور اداسی کا بھی۔ ناصرؔ کے کلام میں تنہا بیٹھ کر آنسو بہانا تاریکی میں جاگنا اور اداسی کے ماحول میں نالاں اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرنا تنہائی کے رجحان کی علامتیں ہیں۔

بستی والوں سے چھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلے پہر
شہر والوں سے چھپ کر پچھلی پہر
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا ۵۵؎

ناصرؔ کے رتجگے اس کی اداسی کے غماز تھے۔ خلیل رو بی کہتے ہیں
رات ہوتے ہی ناصر کا غم تم ہو جاتے اور ایسے حالات میں تنہائی کے علاوہ انہیں کوئی ہم سفر نہیں بھاتا تھا"۔ ۵۶؎

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

عشق غزل کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ مختلف شعراء نے عشق کو مختلف زاویے سے دکھایا ہے۔ ناصرؔ کاظمی نے بھی اپنی غزلوں میں عشقیہ مضامین باندھے ہیں لیکن دوسرے شعراء سے ہٹ کر۔ ان کے عشق کی رنگینیوں میں غم کی آمیزش ہوتی ہے۔ وہ محبوب کی پرستش بھی کرتے ہیں لیکن اس کے نام سے انہیں کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے۔ ان کے لیے یہ اضطراب عشق ہی زندگی کی سب سے بڑی دولت ہے

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب

ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی ؎۷

عشق میں محبوب سے جدائی یا شب فراق جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے عاشق کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک کوئی بات نہیں ہوتی کہ اس نے جس سے محبت کی وہی اس کا دامن جھٹک کر نئے ہم سفر کے ساتھ نیا راستہ اپنا لیتا ہے یہی کیفیت ناصر کے کلام میں نظر آتی ہے

اک اجڑے اسٹیشن پر

تو نے مجھ کو چھوڑ دیا تھا ؎۸

ناصر کے محبوب کو نہیں بلکہ محبوب نے ناصر کو چھوڑ دیا تھا ناصر نے تو اسے ہمیشہ اپنی یادوں کی حویلی میں بسائے رکھا۔ ناصر کی وفائی زندگی کا المیہ یہ رہا کہ وہ جسے چاہتا تھا وہ کسی اور کا ہو گیا ؎۹

تیرے ساتھ تیرے ہمراہی

میرے ساتھ مرا رستہ تھا ؎۱۰

اور جب محبوب ہی ساتھ چھوڑ جائے تو دنیا سے رشتہ کیا معنی رکھتا ہے

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے ؎۱۱

لیکن کیا کیا جائے جب کسی کی یاد دل میں بے قراری بھر دے۔ یہ بے قراری ان کے دل کو روشنی و راحت سے دو چار کرتی۔ ویرانوں میں بھٹکتے رہنا، بھاری رات کا نہ کٹنا، بستی والوں سے چھپ کر گلی پھیر رہنا، دل کا ٹپ کا ٹپ اٹھنا، تنہا تنہا پھرنا محبوب کی یاد کے تلازمات ہیں۔

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر

بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی ؎۱۲

یاد آتا ہے روز و شب کوئی

ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی ؎۱۳

یاد کے بے نشاں جزیروں سے

تیری آواز آ رہی ہے ابھی ؎۱۴

ناصر تصور جاناں میں ڈوب کر بھی غم دوراں کو فراموش نہ کر سکے۔ خارجی حالات کا ان پر اتنا اثر تھا کہ عشق میں کیفیوں سے خیالات کے ساتھ ساتھ انہیں غم کا خیال بھی آتا ہے اور اس رونے میں بھی ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ زمانے کا غم انہیں گھیرے رہتا ہے اور وہ حسن و عشق کے لطیف معاملات و مسائل کو اس سے الگ کر کے نہیں رکھ سکے، اس لیے ان کے یہاں عشقیہ واردات سے ساتھ زمانے کے غم کا شدید احساس ملتا ہے اپنے اشعار میں کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ طور پر وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ؎۱۵

ایسا الجھا ہوں غم دنیا میں
ایک بھی خواب طرب یاد نہیں
رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں ۴۶

پھر شام وصال یار آئی
بہلا غم روزگار کچھ دیر ۴۷

ناصر پر زمانے کے غم کا اتنا شدید اثر رہا ہے کہ وہ خالص رومانی باتیں کرتے ہوئے بھی اس طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ ناصر نے چونکہ خود پر آشوب زمانہ دیکھا تھا، اس کی تمازت کو محسوس کیا تھا اس لیے ان کے کلام میں دکھوں کے بیان میں بڑی شدت نظر آتی ہے۔ یوں ناصر اس نئی نسل کے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں جو عشق کی رنگینیوں سے زیادہ زمانے کے غموں سے دوچار تھا۔

جدائیوں کے زخم درد زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آگئی مجھے بھی صبر آگیا ۴۸

ناصر کاظمی کا شعری سفر ایک تہذیبی آشوب سے شروع ہو کر دوسرے تمدنی المیے پر ختم ہوتا ہے۔ جس طرح صبح آزادی ہولہو تھی اسی طرح شام سقوط مشرقی پاکستان بھی خون آشام تھی۔ یہ سقوط اپنے اندر ۱۹۴۷ء کے واقعات سے زیادہ کرب رکھتا تھا کہ بوقت آزادی تمام تر دکھوں کے باوجود یہ امر باعث راحت تھا کہ ہم خود مختار ہو گئے لیکن اس شام تو وجود کے آدھے ہونے کا المیہ جنم لے رہا تھا۔ اس عظیم سانحے کا دکھ بھی ناصر کاظمی نے بڑی عمدہ تمثالوں میں اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مشرقی پاکستان کا لینڈ اسکیپ اپنے تمام تر ثقافتی حوالوں کے ساتھ پینٹ کیا ہے۔ دریا، ساحل، کشتیاں، کھیت، ماہی گیروں کے گیت اور ٹھنڈی راتوں کی تمثالیں جہاں مشرقی پاکستان کی سرزمین کی تصویر یں سامنے لاتی ہیں وہیں اس آشوب کے گہرے احساس کی آئینہ دار بھی ہیں جس نے آدھے وجود کے مستقل کرب کو جنم دیا۔ اس حوالے سے ناصر نے بعض مکمل غزلوں میں اس کی تمثال کاری سے دل کا درد بیان کیا ہے۔ ۴۹

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیروں کی
اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی
دیس سبز جھیلوں کا
یہ سفر ہے میلوں کا
راہ میں جزیروں کی
سلسلہ ہے ٹیلوں کا
کشتیوں کی لاشوں پر
جمگھٹا ہے چیلوں کا ۵۰

عمر کے آخری حصے میں ناصر کا شعور پختہ ہو چلا تھا۔ ان کے کلام میں جہاں ان کے ذاتی دکھوں کی کہانیاں، ماضی کی روداد ہے، یادیں، پرانی بستی اجڑنے کی داستان، نئی بستیوں کے مسائل، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور غم جاناں کی دردناک کہانیاں ملتی ہیں وہیں عمر رفتہ کے گزرنے کی صدا بھی سنائی دیتی ہے۔

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی [۱]

یہی وہ وقت ہوتا ہے جب گزری ہوئی زندگی کے سود و زیاں کا حساب کیا جائے۔ زندگی سے کیا کھویا کیا پایا اس کا محاسبہ کیا جائے۔ زندگی کو جبر کی طرح گزارنے والے ناصر کہتے ہیں

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی ناصر
بس ایک جبر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی [۲]
سائے کی طرح میرے ساتھ رہے رنج و الم
گردش وقت راس نہ آئی مجھ کو [۳]

تمام عمر ہم نے یوں ہی دکھ اٹھایا ہے
زیادہ خرچ کیا اور کم کمایا ہے [۴]

اردو شاعری میں یاس و دکھ، انتہائی کرب جب اپنی انتہا پر پہنچ کر فکر سے ہم کنار ہوتا ہے تو اکثر ایسا ہوا اور یہ فطری امر بھی ہے کہ زندگی کی ناپائیداری اور موت کی حقیقت کی آہٹ جیسے دہلیز پر سنائی دینے لگتی ہے۔ زندگی اور موت کی اصل حقیقت جب ناصر کے دل و دماغ پر منکشف ہو گئی تو اس نے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ میری بزم میں آ غور سے سن [۵]

موت سے پہلے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھنے والے شاعر نے آخر موت کو گلے لگا لیا لیکن جاتے جاتے پیچھے رہ جانے والوں کو یہ یقین دلا گیا کہ

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا [۶]

دنیا تو سدا رہے گی ناصر
ہم لوگ ہیں یادگار کوئی دم [۷]

فروری ۱۹۷۲ کو ناصر نے بستر مرگ پر دو اشعار ایسے کہے جن کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کو بہت پہلے سے علم ہو چکا تھا کہ اب وہ ہجر کی رات کا ستارہ ہے جسے بہت جلد ٹوٹ جانا ہے۔ انھیں اپنی زندگی میں اپنی موت کی خبر تو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق اور سننے کا اشتیاق تھا۔ اس لیے انھوں نے موت سے پہلے موت کی کہانی بیان کی

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس وہ ہم سخن ہمارا

سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ [۹]

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو وہ اداس شاعر ناصر حقیقتاً سب کو افسردہ چھوڑ کر ملک عدم کو روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ہے

ہارے جو کچھ کہہ گیا وہ کچھ یوں تھا

کہیں کہیں روشنی ہے　　　　جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے

کہاں ہے وہ اجنبی مسافر　　　　کہاں گیا وہ اداس شاعر [۲۰]

حواشی

۱۔ خلیل الرحمن اعظمی "جدید تر غزل" مشمولہ "فنون" جدید غزل نمبر، جلد نمبر ۸، لاہور جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۶۵

۲۔ سجاد باقر رضوی "ناصر کاظمی ایک جائزہ" مشمولہ "فنون" لاہور، جون، جولائی ۱۹۷۲ء، ص ۳۹

۳۔ ڈاکٹر حسن رضوی "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر، ناصر کاظمی، شخصیت اور فن" سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۸۲

۴۔ ناصر کاظمی "دیوان" مشمولہ "کلیات ناصر" جہانگیر بکس لاہور، ص ۱۷

۵۔ غالب احمد "ناصر کاظمی کا شہر غزل" مشمولہ "اسلوب" جلد ۸ شمارہ ۱، کراچی، جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۳۱۹

۶۔ ناصر کاظمی "برگ نے" مشمولہ "کلیات ناصر" ص ۱۳۵

۷۔ نشاط خواب" ، ص ۲۶

۸۔ ایضاً ص ۲۶

۹۔ "دیوان" ص ۹۲

۱۰۔ "برگ نے" ص ۱۱۶

۱۱۔ "نشاط خواب" ، ص ۳۷

۱۲۔ "برگ نے" ، ص ۵۹

۱۳۔ "نشاط خواب" ، ص ۱۷

۱۴۔ "پہلی بارش" ، ص ۱۰۳

۱۵۔ ایضاً ص ۱۱۷

۱۶۔ "برگ نے" ، ص ۱۷

۱۷۔ "دیوان" ، ص ۱۱۳

۱۸۔ "برگ نے" ، ص ۵۱

۱۹۔ "دیوان" ، ص ۱۱۱

۲۰۔ ایضاً ص ۲۷

۲۱۔ "نشاطِ خواب"، ص ۳۲

۲۲۔ ڈاکٹر حسن رضوی "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر"، ص ۳۲۲

۲۳۔ ناصر کاظمی "برگ نے"، ص ۱۳۶

۲۴۔ "نشاطِ خواب"، ص ۲۹

۲۵۔ "دیوان"، ص ۹۲

۲۶۔ "پہلی بارش"، ص ۸۱

۲۷۔ ایضاً ص ۳۱

۲۸۔ "برگ نے"، ص ۱۲۷

۲۹۔ ایضاً ص

۳۰۔ ناصر کاظمی "دیوان"، ص ۱۱۲

۳۱۔ "برگ نے"، ص ۲۱

۳۲۔ "دیوان"، ص ۱۱۷

۳۳۔ "برگ نے"، ص ۴۹

۳۴۔ ناصر سلطان کاظمی "ناصر کاظمی، فن اور شخصیت" اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء ص ۵۲

۳۵۔ ناصر کاظمی "دیوان" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۸۷

۳۶۔ ایضاً ص ۱۳۵

۳۷۔ ناصر کاظمی "برگ نے" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۴۹

۳۸۔ "دیوان"، ص ۳۸

۳۹۔ ایضاً ص ۷۹

۴۰۔ ناصر کاظمی "دیوان" ص ۴۱

۴۱۔ ناصر سلطان کاظمی "ناصر کاظمی فن اور شخصیت" ص ۵۷

۴۲۔ ناصر کاظمی "نشاطِ خواب" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۱۲۵

۴۳۔ ایضاً ص ۲۵

۴۴۔ ناصر سلطان کاظمی "ناصر کاظمی فن اور شخصیت" ص ۲۷

۴۵۔ ناصر کاظمی "دیوان" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۲۷

۴۶۔ ایضاً ص ۱۲

۴۷۔ ایضاً ص ۱۲

۴۸۔ ایضاً ص ۱۲۷

۴۹۔ ایضاً ص ۳۹

۵۰۔ ناصر کاظمی "برگ نے" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۴۱

۵۔ ایضاً ص ۵۹

۵۲۔ ناصر کاظمی "پہلی بارش" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۱۱۶

۵۳۔ "برگ نے" ص ۱۳۶

۵۴۔ "دیوان" ص ۱۶

۵۵۔ "برگ نے" ص ۱۵۱

۵۶۔ ڈاکٹر حسن رضوی وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر" ص ۷۵

۵۷۔ ناصر کاظمی "برگ نے" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۸۷

۵۸۔ "پہلی بارش" ص ۱۰۷

۵۹۔ ڈاکٹر حسن رضوی "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر" ص ۲۴۳

۶۰۔ ناصر کاظمی "پہلی بارش" ص ۱۱۰

۶۔ "دیوان" ص ۱۰۲

۶۲۔ "برگ نے" ص ۶۲

۶۳۔ ایضاً ص ۷۹

۶۴۔ ناصر کاظمی "دیوان" ـــــ ص ۳۶

۶۵۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی "ناصر کاظمی اور برگ نے" مشمولہ "جدید شاعری" ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۳ء ص ۴۰۹

۶۶۔ ناصر کاظمی "برگ نے" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۶۹

۶۷۔ ایضاً ص ۷۷

۶۸۔ ـــــ "دیوان" ص ۱۱۱

۶۹۔ طارق ہاشمی "اردو غزل نئی تشکیل" نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۲۰۰۸ء ص ۱۰۸

۷۰۔ ناصر کاظمی "دیوان" مشمولہ "کلیاتِ ناصر" ص ۱۲۳

۷۔ "برگ نے" ص ۱۵۶

۷۲۔ "دیوان" ص ۱۱۸

۷۳۔ "برگ نے" ص ۷۸

۷۴۔ "دیوان" ص ۱۵۷

۷۵۔ "برگ نے" ص ۱۰۹

۷۶۔ ایضاً ص ۱۳۸

۷۷۔ ایضاً ص ۷۵

۷۸۔ ڈاکٹر حسن رضوی "وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر" ص ۳۴۸

۷۹۔ ناصر کاظمی "دیوان" "مشمولہ" "کلیاتِ ناصر" ص ۱۳۵

۸۰۔ ایضاً ص ۱۶۰

Abstract

n past partition era, Nasir Kazmi had a unique identify in modern Urdu "Ghazal" Since He was not associated with any movement hence he had his own ideas in terms of poetry Nasir Kazmi had harmonized his external problem with his internal discontent which he portrayed in his poetry His verses depicts the combine experience of migration atrocities of the colonial forces, in justice of the rules, the pain of uncertainty the torture of the fall of Dhaka and the twinge of loneliness with full intensity Hence the poetry of Nasir Kazmi is a combination of both internal and external bitterness

معیار ۔ علمی و تحقیقی مجلہ شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، شمارہ ۱۱، جنوری–جون ۲۰۱۴ء

جدیدیت، وجودیت اور اُردو ناول

حمیرا اشفاق*

جدیدیت سے مراد وہ فکری رویے ہیں جو قدیم سے انحراف کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں۔ جدیدیت کی یہ تعریف اس کا صرف ایک پہلو تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی فلسفیانہ و فکری اساس کو نہیں چھو سکتی۔ شمیم حنفی جدیدیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "تجدد پرستی کا اصول آخر اپنے زمانی رشتوں کا پابند ہے اور اس اعتبار سے ہر وہ رویہ جو زندگی کی پرانی قدروں سے گریز اور نئی قدروں کی جستجو کا پتہ دیتا ہے، جدید ہے۔ دوسرے الفاظ میں تجدد پرستی معاصریت کی ہم معنی ہوئی اور گزرے ہوئے کل کی ہر وہ حقیقت جسے آج کی "ذہنی تائید" حاصل نہ ہو سکے، قدیم کی مترادف ہوئی"۔ ۱

جدیدیت کا دائرہ عمل سائنس اور مذہب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اولین مثال احیاء العلوم کی تحریک میں ملتی ہے، جس میں انسان اور کائنات کو خارجی ذرائع کے ذریعے سے معانی اور مفاہیم سے سمجھنے کی کوشش کی گئی، جس کے نتیجے میں سائنسی عقلیت پرستی" کو فروغ ملا۔ مذہبی تقلیدیت (Orthodoxy) میں عقل و منطق کے استعمال سے دو اہم فکری رجحانات پیدا ہوئے جن سے عالمگیر نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلا رجحان سیکولرازم اور دوسرا انسان دوستی کا ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں دونوں جڑواں اور لازم و ملزوم رویے ہیں اور دونوں کی بنیاد مذہبی عقائد میں تشکیک پر ہے۔ سیکولر اور عقلی رویے کے نتیجے میں جب مذہبی اعتقادات متزلزل ہونے لگے تو ایک نفسیاتی کشمکش کا پیدا ہونا لازم تھا۔ اسی کشمکش سے برآمد ہونے کی فکری کوشش اور جذباتی اخلاص کا نتیجہ ہیومنزم (Humanism) تھا"۔ ۲

ہیومنزم کو روشن خیالی کی تحریک بھی کہا گیا، اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عقل کے ذریعے تمام مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے اور دنیا کو تباہ کرنے والے تمام عناصر مثلاً جبر اور جہالت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ نظریہ عالمانیہ کی شکل اختیار کر گیا۔ یہی وہ بنیاد ہے جو جدیدیت کی اساس ہے۔ یوں جدیدیت نے بھی دنیا کے تمام مسائل کو حل کرنے کا بیڑا اٹھایا گو یہ سب ایک بہترین تخیل ہو سکتا تھا لیکن پورے عالم کو اپنے تصور کے مطابق ڈھالنا ممکن ہی نہ تھا، اس لیے یہ سب کچھ تصوراتی ثابت ہوا۔

یوں انسانی زندگی اور ادب کے مقاصد کو دوبارہ متعین کیا گیا نہ صرف ادب بلکہ تمام فنون لطیفہ اس تبدیلی سے متاثر ہو گئے۔ جدیدیت نے تین بنیادی باتوں پر اصرار کیا جس میں عقل پرستی کو فروغ ملا، اسی طرح انسان کے داخل کو اہم جانا۔ مزید یہ کہ انسانی سوچ اور فکر کی آزادی پر زور دیا۔ انہی عناصر کی ایک جھلک ہمیں نطشے کے سپرمین کے تصور میں بھی نظر آتی ہے گویا اس تصور سے جدید دور کے

* استاد، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سمجھنے کا سلسلہ بھی موجود ہے لیکن ناصر عباس نیئر سپر مین کے تصور اور جدید فرد کے تصور کی مزید وضاحت اور دونوں میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سپر مین دراصل کسی نظریے، مقصد اور ماورائی نصب العین کی غلامی پسند نہیں کرتا، آزاد، خود مختار اور شدید فرد ادبی پسند تھا، وجودیت کے فلسفے میں اسی تصورِ فرد اور اس کے منطقی مضمرات کو اہمیت ملی، (وجودیت، جدیدیت کا اہم جزو ہے) تاہم جدید ادب ہے جس فرد کی بالعموم عکاسی کی ہے وہ سپر مین کا بالکل برعکس بہر حال نہیں ہے جدید ادب کا فرد زندگی کی تلخیوں، غلاظتوں، محرومیوں اور نارسائیوں کا ادراک کرتا اور خود کو بے بس پاتا ہے۔۔۔۔۔۔ جبکہ سپر مین کے ہاں بے بسی کا کوئی شائبہ نہیں" ۲۳

جدیدیت میں فرد کے جذبات کی بجائے اس کو خارجی اور سائنسی فارمولوں سے پرکھنے کی کوشش کی گئی اور سائنس کو ہی صداقت کا معیار سمجھا جانے لگا اور عقل کو تمام مسائل کا حل جانا گیا اس طرح جو "فرد" پیدا ہوا جو تنہا اور سماج سے کٹا ہوا تھا، اور خارج سے ہٹ کر اپنے داخل میں گم ہونے والا تھا۔

جدید فرد کی اس داخلی کیفیت کو مریضانہ عمل یا سوچ بھی کہا گیا لیکن سارتر نے اس بات کو رد کر کے جدیدیت کی وضاحت میں کئی دلائل پیش کیے۔ جب جنگوں میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کی اموات واقع ہوئیں تو اس میں اجتماع کا نوحہ ملتا ہے لیکن کسی ایک فرد کی نہ تو کوئی پہچان تھی اور نہ ہی کوئی تشخص تھا۔ فرد کو اجتماع میں گم ہو گیا۔ یہاں تک کہ سائنس نے بھی فرد کے لیے کوئی بڑا نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ اس نے بھی اجتماع کو ہی مخاطب کیا ہے مثلاً اجتماعی لاشعور کا نظریہ، ڈارون کی تھیوری وغیرہ۔ اس طرح کے نظریات اور خیالات نے انسان کو بے بس اور تنہا کر دیا اس کی خوشیوں کو اجتماع کی خوشی کے ساتھ ملا کر مفروضہ قرار دیا اور اس کے غم میں وہ بے نام اور اکیلا تھا لیکن اس کی آواز اجتماع میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ جدید فرد سماج کو اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ تصور کرنے لگا اور پھر اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر گامزن ہوا۔ اپنے وجود کے تشخص کے لیے اس نے وجودی فکر کو اپنایا۔

وجودیت میں انسان کو اول اور اس کے جوہر کو ثانوی حیثیت دی گئی، جس نے انسان کو بطور "فرد" اہمیت کا احساس دلایا اور عملی صلاحیتوں کے ادراک اور انتخاب کی آزادی کے تصور نے انسان کو جینے کا حوصلہ عطا کیا۔ اس طرزِ فکر کی ابتدا پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور صنعتی انقلاب سے معاشرتی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہو گیا تھا، روایتی معاشرے میں انسان، ایک خاندان ایک کل ایک مرکز کا حصہ تھا، جب وہ اپنا گاؤں، بستی اور قبیلہ چھوڑ کر شہر آیا تو اسے احساسِ تنہائی نے آگھیرا، اسے احساس ہوا کہ جنگ میں لاکھوں، کروڑوں لوگ یونہی مر گئے ہیں اس کی کوئی شناخت، مذہب اور حوالہ نہیں ہے تو بھلا انسانی زندگی کا کیا حوالہ ہو سکتا ہے۔ یوں انسان، مذہب اور خدا کے تصور سے بھی باغی ہو گیا۔

وجودی فکر میں کچھ ادیبوں کے ہاں لادینیت کا تصور پایا جاتا ہے مثلاً سارتر اور کامیو کے ہاں مذہب سے بڑا مقام انسانیت پرستی کا نظر آتا ہے جبکہ کرکیگارڈ کے نزدیک مذہب ہی سب کچھ ہے لیکن ان اختلافات کے ساتھ ساتھ کچھ مشترک نظریات بھی ملتے ہیں جو قریباً سبھی وجودیوں کے ہاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً تمام وجودی فکر رکھنے والے عقلیت کی کلیت سے انکار کرتے ہیں، خدا سے ... کرتے ہیں سائنسی صداقت پر تشکیک کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں۔

"وجود جوہر پر مقدم ہے"

انسانی وجود کو تو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے وجودی فکر محض "فرد" کے وجود پر اصرار کرتی ہے وجودی ادب میں "مایوسی"، "کرب" اور "بے بسی" کے الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں، ان الفاظ کے پس منظر میں وجودی فلسفی کی اساس موجود ہے مایوسی سے مراد ہے کہ انسان تمام عمر یہ صورت حال سے گزرتا ہے وہ ایک کا خاتمہ کر بھی لے اور تو ایک نئی صورت حال اس کی منتظر ہوتی ہے گویا انسان تا عمر اس دیو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور یہی اس صورت حال سے آزاد ہو سکتا ہے۔

بے بسی سے مراد یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں تنہا ہے یعنی خدا نہیں ہے، خدا سے انکار کا مطلب مذہب کی اجارہ داری سے انکار ہے یعنی انسان اپنے فعل کا سر چشمہ تو خود ہو لیکن اس کی توجیہات مذہب میں تلاش کرے اور خیر و شر میں انتخاب کی ذمہ داری دوسری ذات پر لاد دے اور خود بری الذمہ ہو جائے جبکہ وجودیت کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے جذبات کا خود ذمہ دار ہے اور جذبے کی قدر کا تعین عمل ہی سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وجودیت انسان کو بے چارگی سے نکال کر انسان کو وقار عطا کرتی ہے وجودی فکر میں ہر لمحہ خوشی، غم، حسد یا جسم کا تعین انسان کا عمل کرتا ہے۔ اس فلسفے کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی وقفے میں حد درجہ مقبولیت حاصل ہوئی، خاص طور پر فرانس اور جرمنی میں سے حد درجہ قبول عام حاصل ہوا۔

اس فکر نے مغرب کے ادب کو متاثر کیا اس کی جھلک اس عہد کی تحریروں میں واضح نظر آتی ہے سارتر جس کو وجودی فلسفے کا سب سے بڑا علم بردار بھی کہا جاتا ہے اس نے اپنے نظریات کی ترسیل اپنے ناولوں اور اپنی تحریروں میں بڑے موثر انداز میں کی ۱۹۳۸ء میں اس کا ناول Nausea شائع ہوا، اور ۱۹۴۳ء میں اس کی فلسفے کی کتاب Beings and Nothingness منظر عام پر آئی، ان دونوں کتابوں میں وجودی نظریات کی وضاحت بھی ملتی ہے اور وجودی فکر پر اٹھنے والے اعتراضات کے مدلل جوابات بھی ملتے ہیں اس کے علاوہ سارتر کے اہم ناول

- ☆ Road to Freedom
- ☆ The Age of Reason
- ☆ The Repneve
- ☆ Iron in the Soul

بھی ہیں لیکن جس ناول کو سب سے زیادہ اہمیت ملی وہ Nausea ہی ہے اس ناول کا مرکزی کردار کوئی ایک ادیب ہے جو کائنات کی تمام شیا کو محسوس کرتا ہے اس لغویت میں معنی کی تلاش میں وہ ناول تحریر کرتا ہے اس کو ہر چیز بے ہیت، بے مقصد نظر آتی ہے۔ سارتر کے ہاں متلی کا رشتہ براہ راست اس کے شعور سے ہے جہاں چیزوں کو وہ ہضم (Digest) نہیں کر پاتا اور باہر اگلنا (Vomit) رہتا ہے جس سے ایک طرح کی لغویت پیدا ہوتی ہے جو وجودیت کا ایک اہم عنصر ہے

سارتر کی اس فلسفیانہ فکر نے بیسویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں کو بہت متاثر کیا۔ البرٹ کامیو نے اس فلسفہ لغویت کو وسعت دینے کی کوشش کی، اس کے نزدیک واحد سنجیدہ مسئلہ خودکشی ہے اس کا خیال ہے کہ انسان دائمی طور پر بے معنویت کا شکار ہے سسی فس (Sisyphus) کی طرح بے مقصد اور بے سود کہ وہ کا المیہ قبول کر لینا چاہیے۔ یہی فلسفہ ان کے ناول The Outsider میں نظر آتا ہے اس کا مرکزی کردار "مرسو" ایک بے معنی اور لغو آدمی ہے جس کے اندر ماں کے مرنے پر بھی کوئی احساس نہیں جاگتا۔ مرسو ایک قتل کا مرتکب ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اسے احساس نہیں ہوتا، یہاں تک کہ پھانسی بھی اس کے اندر کوئی بڑا ہیجان پیدا نہیں کر سکتی وہ موت کو گلے لگا کر زندگی

ی معنویت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ The Plague کامیو کا ایک ناول ہے اس کا موضوع یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو اس کا مقابلہ کس طرح اور کیوں کیا جانا چاہیے۔ اس کے پس منظر میں کامیو کا مدافعت کی تحریک کا تجربہ نظر آتا ہے، جو اسے فرانس پر جرمنی کے قبضے کے بعد حاصل ہوا تھا۔

کامیو کا نوبل پرائز یافتہ ناول The Fall ہے۔ اس ناول میں کامیو کا یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ انسانی وجود گناہ آلود ہے کیونکہ دریائے سین میں عورت کی خودکشی کے واقعے کو بنیاد بنا کر وہ اس ناول کے مرکزی کردار کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ یہ وجود اور گناہ کی اس آمیزش سے اس ناول کی اثر پذیری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وجودی مفکرین میں سیمون دی بووار، کولن ولسن، اٹالو کیلوینو (Italo Calvino) الڈس ہکسلے، ارنسٹ ہیمنگوے کے ناول بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں اسی طرح انگریزی ناول نگار David Lindsay اور امریکی ناول نگار Ayan Rand کے ناول بھی وجودی فکر کے عکاس ہیں۔

دنیائے ادب میں جتنی بھی تحریکیں مغرب سے ابھریں ان میں سے بیشتر کا تعلق فرانس سے ہے لیکن فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو تک کا یہ سفر کسی نہ کسی حد تک متاثر کن تھا اس طرح کے اثرات کی جھلک ہمیں جدید اردو ادب کے نت نئے بدلتے فکری اور ہیئتی رویوں میں نظر آتی ہے۔ ان ہی رجحانات میں ایک رجحان وجودیت کا بھی ہے جو اردو ادب پر اثر انداز ہوا لیکن اس کی شکل قدرے بدل گئی کیونکہ یہ صورت حال پر زور دیتا ہے اور اس کی تعبیر یا اشتراک کی ایک صورت تصوف سے ملا کر بھی کی گئی لیکن مذہب کے خدا سے انکار کو ہمارے یہاں تسلیم نہ کیا گیا تاہم ہمارے ادیبوں نے وجودیت کے فلسفے میں دلچسپی لی اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں

> ''اس فلسفے نے بیسویں صدی کے ذہن انسانی کو نا امیدی، بے یقینی، عدم اعتماد اور بحران سے نجات دلا کر اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔ اس نے خیر و شر کی ساری ذمہ داری فرد کے کاندھوں پر ڈال دی اور بتایا کہ آدمی اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ خود کو بناتا ہے۔ ذات کے عرفان کا مسئلہ ہم مشرقیوں کے لیے کوئی ایسی نئی چیز نہیں لیکن یورپ میں جہاں سائنس کی ترقی نے فلک افلاک کو چھو لیا تھا۔۔۔۔ عرفان ذات کے اس فلسفے نے بحران زدہ انسان میں زندگی کی روح پھونک دی''۔[۲۵]

جب کہ محمد حسن عسکری اس فلسفے کو مغرب کی مذہب پر یلغار قرار دیتے ہوئے اس کی توجیہہ یوں پیش کرتے ہیں۔ ۔۔۔۔ مرد کو ہر لمحے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ہر فیصلے کے ساتھ وہ اپنے جوہر اور اپنی ماہیت کا تعین کرتا ہے لیکن چونکہ ہر لمحے نئی قسم کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اس لیے ماہیت کا تعین بھی مستقل طور سے نہیں ہو سکتا۔ ہر فیصلے اور ہر لمحے کے ساتھ جوہر اور ماہیت کا تعین بدلتا رہتا ہے۔

اس سارے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ اپنی ماہیت کا تعین انسان خود کرتا ہے خدا نہیں

۲۔ اس ماہیت کا تعین عمل کے ذریعے ہوتا ہے

۳۔ یہ ماہیت مستقل چیز نہیں، بلکہ بدلتی رہتی ہے

ظاہر ہے کہ یہ سارے خیالات دین کی نفی کرتے ہیں لیکن آج کل بہت سے مغربی مفکر عیسوی دینیات کو بھی اسی رنگ میں رنگ رہے ہیں اور رہا سے

مل جائیں گے۔ [10]

قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کے آغاز میں درج ایلیٹ کی نظم کے جو مصرعے درج کیے گئے ہیں اس میں وقت اور موت سے انسان کی بے بسی کا نوحہ ملتا ہے۔ ساتھ کے خدا کے تصور کو رد کر کے زندگی کی لایعنیت کا نوحہ ہے۔ قرۃ العین کے ہاں یہ تصور اس طرح سے ملتا ہے کہ گوتم کہتا ہے

"خدا ہر جگہ قائم و کوئی وجود نہیں دیا لیکن ہے اور اپنے وجود پر قائم اور مادہ اور روح اور جسم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے صرف یہی ایک حقیقت ہے" [11]

اور چمپا کہتی ہے

خدا اور ایمان، حقیقت محض یہ ہے کہ جو موجود ہیں سامنے فلسفے اور دنیا کے اصول ہیں محبت بے کار ہے فلسفہ بیکار ہے سب ہیں جو ہے سب ہی ہے سب دھوکہ ہے شروع میں جو خدا تھا اور بعد میں خود ہر شے خلائی غیر حقیقی ہے۔ [12]

اس ناول میں یہ بتایا گیا ہے کہ وقت در حقیقت آگ کا دریا ہے جس کے سامنے انسان بے بس ہے اور اپنی تمام تر قوت برداشت، عقلیت، ذہانت، فہم اور شعور کے باوجود ایک حقیر تنکے کی طرح ہے جو تاریخ کی جبریت کے سامنے بے بس ہے۔ [13]

آگ کا دریا میں وجودیت کے بنیادی عوامل وقت اور انسانی وجود کی اس میں شرکت، زندگی کا انجام یعنی موت اور انسانی نسل کی مسلسل بقا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ایک اور ناول "گردش رنگ چمن" میں بھی زندگی کی جبریت کا شکار افراد اور ان کے ذہنی انتشار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کی ہیروئین "عندلیب" ایک (Absurd) کردار ہے۔ حالات کی جبریت نے اسے اس پیشے کو اختیار کرنے پر مجبور کیا ہوا ہے جو اس کے داخل سے میل نہیں کھاتا لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے اس کی یہ بغاوت اس کے مکالموں میں کئی جگہ جھلکتی ہے۔

"نہ میں آپ کا دین قبول کرتی ہوں نہ آپ کا خدا اور نہ آپ کا پیشہ" [14]

خواہ وہ پوش کے کردار میں بھی لایعنیت جھلکتی ہے۔ قرۃ العین کے ناول "سیتا ہرن" میں اس کی مرکزی حیثیت کا حامل کردار سیتا میر چندانی ہے جو جمیل سے شادی کر کے خود کو ایک نئے کلچر میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے ٹھکرائے کے بعد بکھر جاتی ہے اور اپنے وجود کے عدم تحفظ کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ مختلف مردوں کے ہاں پناہ ڈھونڈتی ہے لیکن کوئی بھی اس کی محوری حیثیت کو نہیں مانتا۔ اس کی صورت حال پر ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں۔

ممکن ہے یہاں مرد کے کردار کے استحصالی رویے کی وہ شدت نظر نہ آئے جس کی طرف سیتا ہرن کا استعارہ اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ یہاں مردوں کی طرف رغبت و جھکنے میں اسطوری سیتا کے برعکس ناول کی سیتا میر چندانی کا اپنا انتخاب بھی شامل ہے لیکن پھر بھی اس کے المیے کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو "وجودیت" کے سیاق و سباق میں آزادی عمل کے ساتھ بروئے کار آتا ہے اور اسے تنہائی کے کرب شکست خواب اور جلاوطنی کے احساس میں غرق کر دیتا ہے یہاں آشوب ذات کی تہہ میں جو بنیادی عنصر ہے وہ وہی قرۃ العین حیدر کے نظام فکر کا مرکزی تصور ہے "یعنی تہذیبی اور ثقافتی تشخص کا شعور" یہ اسی شعور کی گمشدگی ہے جو سیتا میر چندانی کو منزل منزل بھٹکاتی پھر رہی ہے" [15]

قرۃ العین نے محض موت کے احساس کی شاعری ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک ایسے بے چین نفس کی عکاسی کی ہے جسے وقت کی جبریت نے اپنے فطری اور جذباتی رشتوں سے دور کر دیا ہے گویا وہ وجودی سطح پر جبریت کے شکار کرداروں کی عکاسی کر رہی ہیں۔ وجودی نقطہ نظر کے مطابق اگر انسان اپنے داخل کے ساتھ ہو تو وہ صادق کہلاتا ہے۔ انتظار حسین کی حقیقت نگاری کے پس منظر میں تخیل اور داخل کو جو اہمیت دیتے ہیں وہ موجود ہے اگرچہ رویہ ہی ان کے فن پر غالب ہے۔

وجودی فکر کوئی ایسی معین فلسفیانہ فکر نہیں ہے کہ ہر ہر سطر میں آشکار ہو جائے بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ افسانہ نگار یا ناول نگار (Art Lies in Concealing Art) کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر فکری پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے یہاں یہ صورت ابھرتی ہے کہ وہ وجود کے مسئلے پر ایک فلسفی کی حیثیت سے بحث نہیں کرتے بلکہ اسے فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔" ۱۶

انتظار حسین نے اپنی تخلیقات میں ہجرت، تقسیم اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیاتی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا ناول "چاند گہن" بھی اسی موضوع کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے کردار تو جی، ان کا بیٹا سبطین، کالے خان اور خیاط وغیرہ جو حسن پور (یوپی کا ایک قصبہ) میں صدیوں سے آباد تھے ان کو فسادات کی وجہ سے دلی آنا پڑا اور دلی کو بھی غیر محفوظ پا کر وہ لاہور پہنچ جاتے ہیں۔ لاہور میں ابتدائی دنوں کے اندر تقسیم پر جو کشاکش ہے وہ اس ناول میں ایک ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے جو انسان کو مسلسل کرب کا شکار کر دیتی ہے ایک ایسا کرب یا درد جس کا مداوا نہ دین کے پاس ہے اور نہ ہی مذہب کے پاس۔ سبطین دلی کے اس خوف کے سائے میں پلنے والی بھیانک رات کا بیان یوں کرتا ہے۔

''ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے، جس نے پوری دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ رات محلہ کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہو گا مگر نہیں ہوا۔ قیامت سر پر آ کر ٹل جاتی ہے یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے قیامت کو اگر ٹوٹنا ہی ہے تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی ہے یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے اور جلاد کہیں کہ ہم حقہ پی کر آتے ہیں۔ پھر تجھے پھانسی لگائیں گے۔ یہ پورا محلہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے گلے میں نہیں آتا۔'' ۱۷

ناول اپنے اختتام تک ایسی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس میں گھٹن اور اداسی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس ناول کے تمام کردار زندگی کی بے معنویت، لغویت، بے مقصدیت اور فرد کی اپنی ذات کی تنہائی کا شکار ہیں۔ یہی عدم تحفظ کا احساس اس ناول کے مرکزی کردار "سبطین" کو "(Nausea)" کے مرکزی کردار کے مشابہ کر دیتا ہے وہ ناول کے آخر تک اضمحلال کے بوجھ تلے دبا ہوا کسی بھی قسم کی آرزو یا انتخاب کے بغیر مایوسیوں میں کھو جاتا ہے۔

انتظار حسین کا ناول "آگے سمندر ہے" کراچی کی موجودہ صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس ناول میں بھی تمام کردار ماضی اور حال کی کشمکش کا شکار ہیں اور خوف کی فضا ہے جو تمام ناول میں یاسیت کی فضا کو جنم دیتی ہے۔ مثلاً آغاز ہی میں مجو بھائی کہتے ہیں۔ "مل بڑے ہوئے ہو، سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی گلیوں میں جو پیدا ہوا کرتی ہیں وہ تو پانی پہ تیرنا ہے۔" ۱۸

اس پورے ناول کی فضا میں زندگی کی بے معنویت اور بے یقینی کی کیفیت موجود ہے جانے کس لمحے کیا ہو جائے۔ یہی صورت حال میں نفسیاتی کشمکش یا زندگی کی جبریت کا احساس افراد کی ذہنی ہیجان کا باعث بنتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت اور زیادہ گہرا ہو جاتی ہے جب غازی عطاء اللہ کے جلسے میں بم پھٹتا ہے اور مجو بھائی بھی مر جاتا ہے۔

> مجو بھائی کا غائب ہو جانا علامت ہے بیرونی دنیا کے ساتھ جو ادو کا رابطہ ٹوٹنے کی، اب اس کے اپنے جسم کا
> ایک حصہ غائب ہو گیا ہے اب وہ ہے اور اس کا ماضی قدیم تاریخ" ۱۹

زندگی کی لاحاصلیت کا تصور ہی انتظار حسین کے ناولوں میں وجودی کرب پیدا کر دیتا ہے جب حالات کی جبریت اس کے کرداروں کو مجبورِ محض کا شکار کر دیتی ہے تو فضا وجودی صورتِ حال کی عکاس بن جاتی ہے۔

خالدہ حسین کے ناول "کاغذی گھاٹ" پر کافکا اور سارتر کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس ناول میں بکھرے ہوئے موضوعات میں انسانی تنہائی، عدم ابلاغ، خود شناسی، موت کا دہشت بھرا خیال، ذات کا آشوب، اجنبیت، آگہی کا کرب بھی شامل ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

> موت کی خاموش دہشت اندر ہی اندر اس کے دل میں بیٹھتی جا رہی تھی یہ زندگی کا ایک غیر ضروری، اتفاقی نا وقت اختتام جو تلوار کی طرح سر پر لٹکتا ہی رہتا ہے اور سایہ کی طرح پیچھا کرتا ہے اور ہونے کا احساس شدید کرنے والا اور نہ ہونے کا "بی نوئی نا" اس کے احساس میں بری طرح جکڑ چکا تھا اور کسی فلم کی پس منظر موسیقی کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتا" ۲۰

ڈاکٹر سہیل احمد خان خالدہ حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "خالدہ حسین کا فنی سفر تو شروع ہی سادہ منطق کی لکیروں کے پار سے ہوتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں ان کہانیوں کے کرب اور ان کی احساساتی شدت نے لوگوں کو چونکا دیا، ان کا رشتہ وجودی کرب سے جوڑا گیا۔ ۲۱

اس پورے ناول میں ہونے اور نہ ہونے کا کرب دکھائی دیتا ہے اس احساس نے تمام کرداروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ان کرداروں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر پسپائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سونا کا کردار تو مکمل طور پر ایک "وجودی فرد" کا کردار ہے سارتر کے انتخاب کا مسئلہ اسے الجھاتا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ انتخاب تو پہلے سے طے ہے لیکن حسن اسے کہتا ہے

> "یہ انتخاب اتنے آسان نہیں۔ سارتر نے اسی آزادیٔ انتخاب کی آزادی کو زندگی کی اساس بتایا ہے یعنی انسان ہر لمحہ انتخاب کرتا ہے اور اذیت میں گرفتار رہتا ہے۔ زندگی بلیک اینڈ وائٹ نہیں اس کا اکثر حصہ گرے ہے مجھے دیکھو میرے اندر ایک تخلیقی آدمی دن رات دھوم مچاتا ہے میں سوچتا ہوں ابھی میں اس کی تشکیل کا سامان کروں گا مگر میں دو ٹکے کی نوکری میں اپنے آپ کو ضائع کرنے پر مجبور ہوں ــــــ جابر نظام کی غلامی مجھ میں اپنے آپ سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ ۲۲

اس تمام صورتِ حال میں سونا کو کچھ بھی نظر نہیں آتا سوائے حنی کے "دنیا میں کچھ بھی نہیں، کہیں کچھ بھی نہیں، سوائے ایک کھوئی حنی کے" ۲۳

ان ناولوں میں وجودی صورتِ حال کی وجہ قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے حالات، تیسری دنیا میں اہم سیاسی اور معاشی مسائل اور ایسے حالات میں فرد کی شکست و ریخت بنتی ہے۔ خالدہ حسین نے اسی فضا میں کرداروں کے نفسیاتی اور فکری پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" فرد ہی کا نہیں بلکہ نسلوں کا نوحہ ہے جاگیرداروں کا استحصال، غربت، ہجرت، سیاسی و قدامت اور پھر ان کے انسانی معیارات پر اثرات انہیں ذہنی اور خارجی سطح پر بے معنویت کا شکار کر دیتے ہیں۔ وسیع پیمانے پر اموات، تلخ تجربات، وقت و تاریخ کا کرب، جبر اور ایسے عناصر ہیں جو اس ناول کو وجودیت کے قریب کر دیتے ہیں۔

"باگھ" میں بھی جبر و تشدد کے ذریعے انسان کو Absurd دکھایا گیا ہے اس ناول کے مرکزی کردار اسد کا بھی سب سے بڑ

مسئلہ Alienation نظر آتا ہے اس کا انجام بھی کافکا کی کہانیوں کی طرح کا دکھایا گیا ہے۔

ڈاکٹر حامد اشرف لکھتے ہیں کہ

> باگھ" کے اسد علی کی گرفتاری، رہائی اور دوبارہ گرفتاری کافکا کے "دی ٹرائل" کی یاد تازہ کر دیتی ہے جہاں ایک بے گناہ شہری کو بغیر کسی قانونی شکنجے یا فردِ جرم کے ایک دن اچانک چند اہلکار گرفتار کر کے لے جاتے ہیں کہ کل اس کو عدالت میں پیش ہونا ہے۔ اسد بھی "دی ٹرائل" کے ہیرو کی طرح بے گناہ ہے کسی سیاسی تحریک یا مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں ہے بلکہ کافی حد تک مجہول نوجوان ہے جو سماج میں تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ نہایت معمولی قسم کی شخصیت کا مالک ہے" ؎۲۴

عبداللہ حسین کے ناول قید میں بھی انسان کو کہیں حالات کی، کہیں عشق کی، کہیں استحصال کی، کہیں غلامی کی اور کہیں ضمیر کی قید میں دکھایا گیا ہے۔ ناول ایک ایسے کنارے سے جڑا ہوا ہے جس میں ایک نوزائیدہ بچے کو مذہب، اخلاقیات اور تقدس کے نام پر مسجد کی سیڑھیوں پر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اس ناول میں معاشرے کے استحصالی رویے اور سماجی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ انسان کی بے بسی اور خواہشات کی عدم تکمیل سے پیدا شدہ مسائل کو وجودی انداز میں دیکھتے ہیں۔" ؎۲۵

داستان، باگھ اور قید میں عبداللہ حسین نے شعوری یا غیر شعوری دونوں طرح سے وجود کا مسئلہ ابھارا ہے ان کی تحریروں میں دستاؤ، ہیمنگوے، ٹی ایس ایلیٹ اور کافکا سے متاثر ہونے کی بنا پر وجودی عناصر در آتے ہیں۔

نثار عزیز بٹ کا ناول "کاروانِ وجود" خالصتاً وجودی ناول ہے اس میں وجودیت کی حمایت میں دلائل اور مباحث کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اقبال کی نظم "ساقی نامہ" کے اشعار اس کے موضوع کا تعین کرتے ہیں۔ اس ناول میں کہانی دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن میں سے ایک ثمر اور دوسرا سارہ کا ہے ثمر کا کردار وجودی عناصر اور سارہ کا کردار جینیت پسندی کے نظریے کو اجاگر کرتا دکھائی دیتا ہے ثمر کا کردار اپنے اندر سحر انگیزی اور پراسراریت سموئے ہوئے ہے ناول کے ابتدا سے اختتام تک اس کی دلکشی، سحر اور آزادی افکار کو کھلی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

ثمر کے کردار میں انتخاب و عمل کی آزادی کا عنصر وجودیت کا مظہر ہے وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارتی ہے وہ جمیل سے محبت کے باوجود اس کا معروض بننا پسند نہیں کرتی۔ اسی طرح جب حسن رضا سے شادی کرتی ہے تو بھی تنسیخ نکاح کا حق اپنے پاس رکھتی ہے۔ وجودی مفکرین جو سیاسی مادیت پرستوں کی طرح لذتیت کے حامی نہیں ثمر کا کردار بھی اس لذتیت کا عکاسی کرتا ہے ثمر کے نزدیک زندگی کی ہر راہ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں اور ہر چیز یہاں تک کہ کوئی خوشی بھی ملتی ہے تو بھی اس کی کوئی نہ کوئی قیمت چکانی پڑتی ہے یہی وجودی فکر کی اساس ہے۔

> "چیت بھی قیمت، ہنسی بھی قیمت اور یک مشت نہیں ایک ساتھ نہیں لخطہ لخطہ ہر آن، قسط در قسط، قیمت، قیمت، قیمت، بچپن کا حساب دو، جوانی راستے گزرتی دیکھو، بڑھاپے کا سامان کرو، پھر بڑھاپے کا نشتر سہو۔ اس کٹھن راہ کے اختتام پر جانکنی کا عذاب اور ابدی دوزخ کا ہول اتنی بڑی قیمت چند سانسوں، چند رنگوں، چند ذائقوں کے لیے؟؟" ؎۲۶

ثمر نے داخل میں اس قدر گم ہے کہ اس کو گرد و پیش سے کوئی غرض نہیں وہ اڑتے ہوئے پرندے، بادل اور فطرت میں خود کو جذب ہوتی ہوئی نظر آتی ہے وہ گہری کی جون میں خود کو دیکھ کر سرشاری اور آزادی کی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہے۔

انیس ناگی نے اپنے ناولوں میں جدید عہد کے سیاسی و سماجی بحران کو وجودی فکر سے ہمکنار کیا ہے انہوں نے اردو ناول کو دوستوفسکی، کافکا، آندرے ژید، سارتر اور کامیو کی روایت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے فن پر مغربی ناول کے اثرات نمایاں ہیں۔۔۔۔ان کے ناول اپنے گرد و پیش پاکستان کی صورت حال کو اپنے داخلی کرب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال، ایک گرم موسم کی کہانی، ایک لمحہ سوچ کا، قلعہ، محاصرہ، چہروں کی کہانی، پتلیاں، کیمپ، ۳۱۳ بریگیڈ اہم ہیں ان کے ناولوں کے موضوعات چھوٹے اور متنوع ہیں۔

ان کا ناول ’’دیوار کے پیچھے‘‘ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں فرد کے وجودی بحران اور کرب کا اظہار ملتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار پوری سچائی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن معاشرے میں اس سچے آدمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا سامنا ایسے نظام سے ہوتا ہے جو غیر جمہوری، غیر منصفانہ اور منافقت سے پُر ہے اس ناول کے حوالے سے قاضی جاوید لکھتے ہیں۔

> ’’دیوار کے پیچھے‘‘ اس مردہ شہر میں فرد کی سرگزشت ہے جس کی ساخت میں فرق آچکا ہے، جس میں عظمت اور امان نہیں محض سفلہ پن اور طمع ہے جس میں جاننا جرم کے مساوی ہے جہاں تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے وہ کنسنٹریشن کیمپ میں اپنے نمبر کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے اس میں بہتا ہوا فرد اپنے تئیں عضویاتی کل بھی محسوس نہیں کرتا اپنے آپ سے بے بس اور حالات کے جبر کا شکار ہے۔ یہاں زندگی مطلق کے افق اور ابدیت کے افق کے بغیر بسر ہوتی ہے اس کا الہیاتی احساس بھی فنا ہو چکا ہے۔ ہلاکت پسندی اس شہر کا حوالہ ہے۔ [۱۷]

اس ناول کا مرکزی کردار حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ مرنے پر بھی بے اختیار اور بے بس ہے۔ وہ اس زندگی کو جینا نہیں چاہتا لیکن اس کو جینا پڑ رہا ہے۔ ’’میں اور وہ‘‘ انیس ناگی کا دوسرا ناول ہے اس کا موضوع بھی جبریت ہے اور مرکزی کردار قنوطیت اور معاشی ناہمواری کا شکار نظر آتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی داخلی اضطراب کا شکار ہے۔ اس اضطراب کی وجہ ماحول سے عدم مطابقت، معاشرے کی بیگانگی کا احساس اور داخلی انتشار ہے۔

> ’’۔۔۔۔ میں کسی لغو سوچ میں کھو گیا ہوں، ماضی؟ یہ مجھے کیا دے سکتا ہے؟ اس طرح تو مستقبل بھی لغو ہے کہیں بھی روشنی کی کرن نہیں ایک مایوسی ہے اداسی کی ہے ہر ایک سے خوف آتا ہے حال نے کون سی مشکل آسان کر دی ہے کہ میں زمانوں کا گلہ کروں، ہر زمانہ مجھے وقت کے درمیان چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور میں وقت کے لمحات گنتا گنتا زندگی میں کچھ کیے بغیر، عمر کی اس دہلیز پر محو سوچ ہوں جس کے آگے زوال، بیماری اور انہونے خوف نہیں۔۔۔۔ [۱۸]

اس سارے ناول میں کشمکش کی صورت حال عدم مفاہمت کی وجہ سے ہے اگر مرکزی کردار ماحول سے مفاہمت کرے تو وہ معاشرت کے حبس سے نکل سکتا ہے لیکن مفاہمت اس کی ذات کی نفی کا نام ہے اس کا شعور ہی اس کی سزا بن جاتا ہے۔

انیس ناگی کے ناول ’’زوال‘‘ کی کہانی ذہنی، جذباتی اور فکری زوال کی کہانی ہے۔ اس ناول میں اپنے عصر کی گھٹن کو پیش کیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر ’’زوال‘‘ کے ہیرو کی کہانی ’’فرانز کافکا‘‘ کی کہانی ’’کایا کلپ‘‘ کے مرکزی کردار ’’گریگر سامسا‘‘ سے بہت ملتی ہے۔ کافکا کی سمت، انیس ناگی نے علامتوں کو تجسیم کے قریب قریب رکھا ہے۔

جہاں اردو ناول کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے وہاں قاری اور ادب کے درمیان میں کچھ فاصلے در آئے ہیں، جس کا ختم ہونا ضروری ہے مگر ادیب اور قاری کے درمیانی فاصلے سے جس قسم کا ادب تخلیق ہوگا وہ زوال آمادہ ادب ہوگا۔

نور سجاد نئی جدید ناول نگاروں میں اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے تین ناول رگِ سنگ، خوشیوں کا باغ اور جنم روپ اپنی انفرادیت کی بنا پر دور حاضر کے ناول نگاروں میں خاص مقام رکھتے ہیں انسان کی تنہائی، اضطراب، تشویش، تقدیر کی ستم ظریفی اور لایعنیت خاص موضوع ہیں ان تمام موضوعات میں تشخص کی تلاش کا مقصد سرگرداں نظر آتا ہے۔

نور سجاد کا ناول "رگِ سنگ" کا موضوع بھی انسان کی تنہائی اور اس کی بے بسی ہے وہ اپنے اردگرد انسانوں کو اپنے مشاغل میں گم دیکھتا ہے جس میں کئی انسانوں کی زندگیاں بھی جونکیں جاری ہوتی ہیں۔ اسی قسم کے معاشرے سے اس ناول کا مرکزی کردار جنم لیتا ہے اس کی بے چینی کے بے ہر حد سے گزر نے نہیں دیتیں اسی کشاکش میں اس کے جذبوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب وہ اللہ میاں سے بھی زیادہ اکیلا تھا۔ کیونکہ اللہ میاں کی تو بہت سی دنیا ئیں ہیں
مگر اس کی دنیا تو ایک ہی تھی جسے وہ اپنا سمجھتا" ۲۱

جنم روپ" بظاہر تو ایک عورت کی کہانی ہے جس نے ایک ایسے معاشرے میں آنکھ کھولی جس کی بنیاد غیر انسانی قدروں پر تھی۔ انور سجاد اس عورت کو ایک ایسی علامت بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے پوری تاریخ کیا پوری زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں پر تشدد دنیا میں تخلیقی رویوں کی صورت حال کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے عورت کے اس تصور کے بارے میں ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں

"انور سجاد اپنے ناولوں میں عورت کے اندر جھانک کر اس کے دکھ اور کرب کی تہہ تک پہنچتے ہیں اس کرب کا ذمہ دار مرد کا جبر اور اس کی حاکمیت ہے وہ اس کے فطری جذبات کی رعنائیوں کو روندتا ہے اور اس کا تمام اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت معاشی اور نفسیاتی مسائل کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ ۲۲

اس ناول میں عورت کے کرب کی داستان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ کرب اپنی پہچان کے کھونے، اپنی ذات پر اختیار نہ ہونے کا ہے جو اس عورت کے کرب کو وجودی کرب میں ڈھال دیتا ہے۔

خوشیوں کا باغ" انور سجاد کا اہم ناول ہے۔ اس ناول کا ابتدائی جملہ اس کے موضوع کا تعین کر دیتا ہے۔

"پوش کے خوشیوں کے باغ کا پیرپٹنگ ایک دنیا ہے اور تیسرا پینل تیسری دنیا" ۲۳

استحصالی رویوں کے خلاف اس ناول میں احتجاج اور مزاحمت کا رنگ نمایاں ہے۔ ناول میں تیسری دنیا کے سب سے بڑے مسئلے "غربت" کو ایک چیف اکاؤنٹنٹ کے کردار کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول میں صرف غربت کو ہی موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان تضادات کو پیش کیا گیا ہے جس میں سیدھی قانون بناتا ہے اور سیدھی قانون توڑتا ہے۔ اس طریقے سے پیدا ہونے والی داخلی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ داخلی حقیقت پسندی اور حتمی جذبات کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کی بے معنویت، انسانی زندگی کے بارے میں وجود کے بارے میں ابھرنے والے کی بے معنویت، انسانی زندگی کے بارے میں، وجود کے بارے میں ابھرنے والے سوالات اس ناول کو وجودی بنا دیتے ہیں۔

نعیم عظمی اردو ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ کامیو کا Absurdity کا تصور ان کے دونوں ناولوں جنم

لنڈی'' اور ''نائی ٹین ٹین ہول'' پر واضح اثر رکھتا ہے۔

جنم لنڈی'' کشکول ایک علامت بن کر ابھرتا ہے۔ جسے سرمایہ دار طبقے کی ہوس کی علامت کہا جا سکتا ہے اور یہ کشکول کبھی بھرتا نہیں ہے۔

> ''اس کو کشکول خالی ہونے کا ڈر ہمیشہ ستاتا رہا اور اس کا کشکول پوری طرح کبھی نہ بھرا''۔ ۳؎

کشکول کی علامت کے حوالے سے انجم اعظمی لکھتے ہیں۔

> کشکول اس عہد کی بنیادی علامت ہے جو اس ناول کے موضوع کی مرکزیت کو قائم رکھتی ہے ایک اور اعتبار سے دیکھا جائے تو موضوع کی انفرادیت اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔۔۔۔ کہ کلاسیکل شعراء نے کشکول کو پیالے کو صرف تشبیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جبکہ نسیم اعظمی نے زندگی کے کشکول کو بطور علامت منتخب کر کے اس کے ابھرنے کی داستان میں اس عہد کے آدمی کی بے پناہ تشنگی کا اظہار کیا ہے۔ اس تشنگی میں صدیوں کی تشنگی، اس عہد کے سینکڑوں تضادات سے مل کر سمندر کی طرح اندر ہی ہے'' ۵؎

جنم کنڈلی' پر وجودیت کے اثرات نمایاں ہیں اس میں سارتر کے تصورات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار Nausea کے ہیرو سے مشابہ ہے یہاں تک کہ سارتر کے ناولوں میں بعض کردار مرگی کے مریض نظر آتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی مرگی کا مریض ہے مرگی لاتعلقیت اور بے معنویت کی علامت ہے۔

> ''عمارت دوسری گلی میں تعمیر ہو سکتی تھی اور بار بار کھڑی ہو سکتی تھی اور کوشاں اس سے اونچا ہو سکتا ہے یہ تو اسی منزل پر ٹھہر گئی اور وہ اس سے اوپر نہیں جا سکتا وہ اس کے تکبر پر غصہ آیا اور پھر اس نے چپل اٹھائی اور اپنی بے بسی پر ہنستا رہا اور گزرے وقتوں کو یاد کرتا رہا اور آج آپ ڈیرن کو گالیاں دیتا رہا۔۔۔ اور اس پر دورہ پڑتا رہا اور وہ اس حالت میں کاریج لیمپ پر پیشاب کرتے کرتے لگا اور ڈاریزن ہاؤس آکسائیڈ سونگھنے لگا اور بہت سے کتے جمع ہو گئے اور اسے ہار پہنانے لگے اور اس کی تے چاٹنے لگے لیکن وہ سوچتا رہا ''کیا یہی میری منزل ہے؟'' ۶؎

اس ناول میں انسان کی بے دلی اور بے ثباتی کا نوحہ بھی ملتا ہے بطور خاص اس کا مرکزی کردار بے معنویت اور لاتعلقیت کے دائروں میں بھٹک رہا ہے۔

ہم جس عہد میں زندہ ہیں وہ دور بلا شبہ محرومیوں اور نارسائیوں کا دور ہے اس لیے جب بھی ادیب گہری نظر سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ دے گا تو وہ وجودی فکر کا حامل ضرور نظر آئے گا۔ اپنی وجودی عناصر کی ایک مختصری شکل فاروق خالد کے ناول ''سیاہ آئینے'' میں بھی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں بھی زندگی بے معنویت، بے لطف، دکھی اور مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ناول کے تمام کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس طبقے کو غربت، بیماری اور لاچاری کے خلاف جس طرح جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ اس ناول میں دکھایا گیا ہے اسی غربت کی بنا پر عزیر ''اپنا خون بیچ آتا ہے۔

> ''منیر صاحب، میرا جسم میرا جسم نہیں، میں نے اسے ڈاکٹر یعقوب کے پاس جا کر بیچ دیا تھا اور سارے پیسے لے کر آپ کے پاس آ گیا تھا اب میں آپ سے کہتا ہوں مجھے گھر چھوڑ آئیں اور میرے ابا سے کہیں کہ عزیر کا جسم اس کا اپنا جسم نہیں ہے'' ۷؎

عزیر کی بے معنویت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے محبت بھی اس کو پناہ نہیں دے سکتی تو وہ خود کو نشے کے دھوئیں میں گم کر لیتا ہے یہ بیا گی اس وقت بڑھ

جاتی ہے جب اس کے باپ پر چوری کا الزام آتا ہے یہ واقعات اسے مزید موت کے قریب کرتے چلے جاتے ہیں اور وہ خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

ایسی ہی صورت حال کا شکار دوسرا خاندان کلثوم کا دکھایا گیا ہے جہاں غربت کے ساتھ معذوری بھی موجود ہے مجموعی طور پر اس ناول میں بے بسی اور مجبوری کا نوحہ ہے جہاں تمام کردار مجبوریوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اپنے وجود کا اثبات چاہتے ہیں۔ سارتر کے الفاظ میں اس [illegible] کا [illegible] ہے۔

> قانون بچے کے ساتھ بندھا ہوا آتا ہے وہ اور نزدیک جاؤ گے تو یہ تمہیں کاٹ لے گا بلاوجہ تم پر منڈلا رہے گا تو تمہیں اپنی وحشت زدہ آوازوں سے ڈرانے کی کوشش کرے گا۔ یاد رکھو کہ قانون خود نہیں مرتا بلکہ دوسروں کو مارتا ہے۔ یہ زندگی نہیں بخشتا بلکہ زندگی چھین لیتا ہے معاشرے کو چاہیے کہ وہ انسان کو انسان بننے کا موقع دے۔ انسان پر کیوں اعتبار نہیں کیا جاتا؟ کاش کہ انسان کی خصلت پر اعتبار کیا جائے، اور اگر انسان بُرا ہے تو ہر کسی کو خودکشی کر لینی چاہیے۔" ۲۸

رحیم گل کا ناول 'جنت کی تلاش' ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو مسلسل اضطراب میں ہے۔ اس کے مرکزی کردار "امتل" کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف اس ناول کے کرائسس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> 'یہ کرائسس امتل کا نہیں، آج کی اس نسل کا ہے جو ایک عہد کی پیداوار ہے جس کی Values اور قدریں اس کی اپنی وضع کردہ ہیں۔ تشکیک اور بے یقینی ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکی ہے زندگی کی بے معنویت ایک مسلمہ حقیقت کا روپ اختیار کرتی جا رہی ہے زندگی اور انسان کی تخلیق بھی بے مقصد دکھائی دینے لگی ہے۔ امتل کا یہ قلق نئی نسل کا قلق ہے۔" ۲۹

وجودیت تعقل پسندی کا ردعمل ہے۔ سائنس کی یلغار میں انسان کی از سر نو بازیافت وجودیت نے ہی کی۔ مادیت پرستی کو رد کرتے ہوئے انسان کے وجود کو اہمیت دی۔ اس ناول کی ہیروئن بھی واپس غاروں میں رہنا چاہتی ہے فطرت کے قریب رہنا چاہتی ہے۔

> ''دنیا مادی ترقی میں بہت آگے نکل گئی ہے مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ سائنسی ترقی نے انسان کو شیشوں کا پرندہ بنا دیا۔۔۔۔ آپ کی طرح میری طرح میرے ساتھیوں کی طرح شعور نے اسے غاروں سے نکالا اب شعور ہی اسے واپس غاروں کی طرف دھکیل رہا ہے۔" ۳۰

یہ پورا ناول وجودی عناصر سے بھرا پڑا ہے اس کا موضوع ہی انسان کی خوشیوں کے لیے راحت کے لیے جستجو کا سراغ دیتا ہے۔ جس میں وہ کسی جنت کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن یہ جنت کہیں نہیں ہے بلکہ ایک دوزخ ہے جس میں انسان کی زندگی، اس کی خواہشات، اس کے جذبات اور تصورات سب جل رہے ہیں۔

جوگندر پال کا ناول 'نادید' اور انور سن رائے کا ناول 'چیخ' بھی وجودیت کے بعض عناصر رکھتے ہیں۔ ان ناولوں میں بھی معاشرتی رویوں میں بے حسی، بصارت و بصیرت دونوں سے عاری لوگ جو صحیح صورت حال کو سمجھ نہیں پاتے اور اگر سمجھ جائیں تو نکل نہیں پاتے۔ یہ سب اجزا مل کر ان ناولوں کے تار و پود بنتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حنفی، شمیم، ص۲۱
۲۔ نیر، ناصر عباس، ص۳۵
۳۔ ایضاً، ص۳۹
۴۔ جالبی، جمیل ڈاکٹر، ص۲۱۵
۵۔ عسکری، حسن، ص۸۰،۸۱
۶۔ ناگی، انیس، ص۷۸
۷۔ منفی، شاہین ڈاکٹر، ص۴۷
۸۔ احمد، ریاض، ص۳۳۶
۹۔ کاردس، اے ڈاکٹر، ص۱۱۲
۱۰۔ اختر، وحید، ص۲۶۷
۱۱۔ حیدر، قرۃ العین، ص۴۷
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ اختر، وحید، ص۲۶۷
۱۴۔ حیدر، قرۃ العین، ص۵۶
۱۵۔ عثمان، فاروقی، ص۵۹۶
۱۶۔ مجتبیٰ، اختر جمیل، ص۲۵۹
۱۷۔ حسین، انتظار، ص۱۵۱
۱۸۔ حسین، انتظار، کراچی ۱۹۸۲ء، ص۸۸
۱۹۔ اشعر، مسعود، ص۱۲۵
۲۰۔ حسین، خالدہ، ص۷
۲۱۔ احمد، کنول ڈاکٹر، ص۱۱۱
۲۲۔ حسین، خالدہ، ص۱۲۶
۲۳۔ ایضاً
۲۴۔ اشرف، خالد ڈاکٹر، ص۲۷۰
۲۵۔ خان، مختار احمد، ص۱۰۱

۲۶۔ بٹ، نثار عزیز، ص ۱۷۲
۲۷۔ جاوید، قاضی، ص ۱۰۵، ۱۰۶
۲۸۔ ناگی، انیس، ص ۱۷
۲۹۔ صدیقی، محمد علی، ص ۳۹
۳۰۔ ناگی، انیس، ص ۲۷۷، ۲۷۸
۳۱۔ سجاد، انور، ص ۹
۳۲۔ جاوید، عقیل، ڈاکٹر، ص ۳۳۸
۳۳۔ سجاد، انور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵
۳۴۔ اعظمی، نسیم، ص ۱۱۲
۳۵۔ اعظمی، انجم، ص ۱۰
۳۶۔ اعظمی، نسیم، ص ۱۲۹
۳۷۔ خالد، فاروقی، ص ۴۷
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۰
۳۹۔ اشرف، اے بی، ص ۱۸۱
۴۰۔ گل، رحیم، ص ۱۷۹

فہرستِ اسنادِ محولہ

۱۔ احمد، ریاض، ۱۹۶۳ء، ''وجودیت کیا ہے''، مشمولہ ''ادبی دنیا''، شمارہ پنجم دور دہم بیان، لاہور
۲۔ احمد، سہیل، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، ''طرفین''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۳۔ اختر، وحید، ۱۹۹۴ء، ''آگ کا دریا اور وجودیت''، مشمولہ قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ (مرتبہ ارتضیٰ کریم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۴۔ اشرف، اے بی، ڈاکٹر، ۱۹۸۷ء، ''جنت کی تلاش یا نئی نسل کا کرائسس''، مشمولہ مجلّہ فنون، شمارہ ۱۷، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۵۔ اشرف، خالد، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، ''برصغیر میں اُردو ناول''، فکشن ہاؤس، لاہور
۶۔ اعظمی، نسیم، ۱۹۸۲ء، ''جنم کنڈلی''، الباقر پبلی کیشنز، کراچی
۸۔ بٹ، نثار عزیز، ۱۹۸۹ء، ''کاروانِ وجود''، ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی

۹۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، ۱۹۸۸ء، ''تنقید اور تجربہ''، یونیورسل بکس، لاہور
۰۔ جاوید، عقیلہ، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، ''اُردو ناول میں تانیثیت''، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
۔ حسین، انتظار، ۱۹۵۲ء، ''چاند گہن''، مکتبہ کارواں، لاہور
۲۔ ـــــ، ۱۹۸۲ء، ''آگے سمندر ہے''، سنگ میل پبلی کیشنز
۳۔ حسین، خالدہ، ۲۰۰۵ء، ''کاغذی گھاٹ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۴۔ حنفی، شمیم، ۲۰۰۵ء، ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس''، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی
۵۔ حیدر، قرۃ العین، ۱۹۸۵ء، ''آگ کا دریا''، قوسین، لاہور
۶۔ ـــــ، ۱۹۸۷ء، ''گردشِ رنگِ چمن''، مکتبہ دانیال، کراچی
۷۔ سہیل، عامر، ڈاکٹر، ۲۰۰۲ء، قرۃ العین حیدر ''خصوصی مطالعہ'' (مرتبہ)، بیکن بکس، ملتان
۸۔ خالد فاروقی، ۲۰۰۲ء، ''سیاہ آئینے''، سانگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۹۔ خان، ممتاز احمد، ڈاکٹر، ۱۹۹۷ء، ''آزادی کے بعد اُردو ناول، ہیئت، اسالیب، رجحانات'' (۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۷ء)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
۲۰۔ سجاد، انور، ۱۹۸۵ء، ''خوشیوں کا باغ''، قوسین، لاہور
۲۱۔ ـــــ، ۱۹۹۶ء، ''رگِ سنگ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۲۔ عسکری، حسن، ۱۹۷۹ء، ''جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ''، عصمت پبلیکیشنز، راولپنڈی
۲۳۔ علی، نوازش، ڈاکٹر، ۱۹۹۷ء، عبارت (اُردو ادب کے پچاس سال) مرتبہ، دھنک پرنٹرز
۲۴۔ قادری، سی۔ اے، ڈاکٹر، ''وجودیت''، مشمولہ فلسفہ جدید اور اس کے دبستان، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی، لاہور
۲۵۔ گل، رحیم، ۲۰۰۶ء، ''جنت کی تلاش''، دی القمر بک ہاؤس اُردو بازار، لاہور
۲۶۔ مجتبیٰ، جمیل اختر، ڈاکٹر، ۲۰۱۲ء، ''فلسفہ وجودیت اور جدید اُردو افسانہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۲۷۔ مسعود، زاہد، ۱۹۹۷ء، ''انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار''، حسن پبلی کیشنز، لاہور
۲۸۔ مفتی، شاہین، ڈاکٹر، ۲۰۰۱ء، ''جدید اُردو نظم میں وجودیت''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۹۔ ناگی، انیس، ۱۹۹۶ء، ''میری ادبی بیاض''، جمالیات، لاہور
۳۰۔ ـــــ، ۱۹۸۹ء، ''میں اور وہ''، فیروز سنز، لاہور
۳۱۔ ـــــ، ۲۰۰۱ء، ''۱۳۰ بریگیڈ''، جمالیات، لاہور
۳۲۔ نیر، ناصر عباس، ۲۰۱۲ء، ''جدید اور مابعد جدید تنقید مغربی اور اُردو تناظر میں''، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی

Abstract

Modernism is a complex, multidimensional term that lends a few of its marked features to Existentialism. Existentialism is a philosophy that focuses on man's existence and views the universal perspectives with reference to subjective notions and internal states of mind. Modernism and Existentialism both have influenced the literature in the twentieth century world wide. Urdu novel has also absorbed the impact of this global trend and many of our renowned novelists, Quratulain Haider, Intzar Hussain, Khalida Hussain, Abdullah Hussain, Nisar Azeez Butt, Anees Nagi and Anwar Sajjad have been influenced by these philosophies and have shown the arks in their novels. This article analyses and reviews the impact of these literary trends in Urdu Novel.

معیار ۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

عین القضات ہمدانی کی فکر میں تصوف اور تشابہ کا لسانیاتی مسئلہ

توشی ہیکو ازتسو
محمد عمر میمن[*]

[اردو ادب میں جب غزل کا ذکر چھڑ جائے تو ممکن نہیں کہ "عشقِ حقیقی" اور "عشقِ مجازی" بار بار سامنے نہ آئیں۔ عشقِ الٰہی "حقیقی" قرار پاتا ہے اور گوشت پوست کے کسی انسانی محبوب (جیسے کوئی حسینہ یا رسوان، یا نعیم یا اللہ دیا، یا عطار کے لونڈے ہی سہی جس سے ہمارے میر صاحب دوا لیتے تھے) سے شاعر کی محبت "مجازی" کہلاتی ہے۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز سامنے ہو، جسے آپ دیکھ رہے ہوں، اور اگر وہ اجازت دے تو، یا اگر ایسی طاقت کا زعم ہو تو زبردستی ہی، اسے چھو بھی سکتے ہوں، اس سے اپنے عشق کو مجازی (غیر حقیقی) کہا جائے، اور وہ ہستی جو سرے سے "شے" کی ذیل ہی میں نہ آتی ہو — اس کا آنکھوں سے دیکھ لینا اور ہاتھ سے چھو لینا تو خیر دور کی بات ہے — اس سے اپنے تعلق کو "حقیقی" قرار دیا جائے۔ اگر کسی متشرع سے اس کی عقدہ کشائی کے لیے کہا جائے، تو وہ کہے گا "میاں، تصوف سے واقفیت کا ڈول ڈالو۔" یہ بڑی عام سی بات ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب اسے پہلے ہی سے جانتے ہیں، جیسے یہ پیدائش سے ہمارے خون میں شامل ہو، گو اس کی وضاحت کرنے کے لیے کہا جائے، تو ہم میں سے اکثر بغلیں جھانکنے لگیں۔

تصوف کی سند سے یہ مسئلہ یقیناً حل ہو سکتا ہے۔ اور اس ترجمے سے میرا مقصد یہی ہے۔ بارہویں صدی کے متصوف اور فلسفی عین القضات ہمدانی نے عشق و عاشق کے حوالے سے تو بات نہیں کی تھی (یہ تو تصوف میں پہلے ہی سے متفق علیہ مان لیا گیا ہے، یاد کیجیے وہ حدیثِ قدسی جس میں اللہ میاں فرماتے ہیں کہ وہ ایک مخفی خزانہ تھے اور ایسے

[*] پروفیسر، شعبۂ ثقافت و زبان ہائے ایشیا و افریقہ، یونیورسٹی آف وسکانسن

اسلامی فکری تاریخ میں عین القضات ہمدانی (۱۰۹۸ - ۱۱۳۱) ایک دور انگیز ہستی کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ اپنے عظیم پیش رو منصور الحلاج (۸۵۷ - ۹۲۲) کی طرح، جس کے "انا الحق" (میں مطلق ہوں!) کی بابت اس نے اپنی غیر مشروط پسندیدگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی، عین القضات کی "آزادفکری" اس کے ہم عصر تکبر کے تقصیر کفر دینی علما اور فقہا کی نظر میں رشک اور نفرت کا باعث بنی۔ نتیجے میں اسے اپنے ہی وطن ہمدان میں ۳۳ سال کی عمر میں عراق کے ایک سلجوقی وزیر کے ہاتھوں نہایت وحشتناک سفاکی کے ساتھ مجرم قرار دے کر مار دیا گیا۔ وہ بے حد عمیق روحانی تجربات کا حامل متصوف تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا مفکر بھی جسے تجزیے کی غیر معمولی تیز عقلی قوت حاصل تھی۔ عارفانہ شعور اور عقلی تفکر کے اس مبارک امتزاج کی بنیاد پر اسے بالکل جائز طور پر فلسفہ "حکمت" کی طویل ایرانی روایت کا پیش رو کہا جا سکتا ہے جس کا افتتاح اس کی موت کے بعد جلد ہی سہروردی (۱۱۵۳-۱۱۹۱) اور ابن العربی (۱۱۶۵ - ۱۲۴۰) کے ہاتھوں ہوا۔ یہاں میں فلسفے کے اس شعبہ کی فکر کے بے حد انوکھے معنیاتی (semantic) پہلو کا تجزیہ کروں گا جسے ابھی حال تک مستشرقین نے بالکل بے جا طور پر نظر انداز کیا ہوا تھا۔

ہمدانی کی فکری حد میں پایا جانے والا پورے کا پورا جو بنیادی اصول ہے اسے اگر بالکل ابتدائی شکل دی جائے، تو یہ بلاواسطہ ذاتی تجربے کی بنیاد پر کسی شے کی حقیقت کی تفہیم اور اس کے بارے میں کچھ جانے کے درمیان قاطع فرق قائم کرنے پر مشتمل نظر آئے گا۔ شہد کے بارے میں یہ جاننا کہ ایک میٹھی چیز ہے ایک بات ہے، لیکن تجربے کے ذریعے شہد کی مٹھاس کا عرفان ایک اور ہی بات ہے۔ ان دو قسم کے علموں کا بنیادی درمیانی فرق مذہبی زندگی کی ارفع سطحوں پر بھی کارفرما ہوتا ہے۔ چناں چہ خدا کے بارے میں کچھ جاننا اس سے بالکل مختلف ہے کہ شے کے الوہی نظام کے رابطے سے اسے جانا جائے۔

عین القضات کی توجہ اس فرق پر ایک ذاتی، بل کہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک وجودی تجربے کے ذریعے مرکوز ہوئی۔ شروع شروع میں وہ دینی تفاوتات کے بے حد وسیع مطالعے میں غرق رہا۔ لیکن الہیات کے مطالعے نے اس کے ذہن میں پراگندگی و انتشار، حواس باختگی، اور مایوسی کے علاوہ کچھ اور پیدا نہیں کیا۔ وہ ایک روحانی بحران کا شکار ہو گیا۔ صرف ابو حامد الغزالی (۱۰۵۸ - ۱۱۱۱) کی تصانیف کے مطالعے سے ہی، جس پر اسے چار سال لگے، وہ اس بحران پر غالب آ سکا۔ وہ وقتی طور پر غزالی سے نہیں ملا تھا، لیکن موخر الذکر کی روحانی راہ نمائی کے نتیجے میں وہ عقلی قوتوں کی انتہا تک پہنچ گیا یا بل کہ تقریباً اس سے بھی آگے۔ اگرچہ وہ اس بات سے شعوری طور پر آگاہ نہیں تھا، لیکن وہ آہستہ آہستہ اسرار الہی کے فوق العقلی (supra-intellectual) منطقے میں داخل ہوتا جا رہا تھا۔ اسی اثنا میں، بالکل اتفاقیہ، اس کی ملاقات ابو حامد کے بھائی، مشہور و معروف متصوف شیخ احمد الغزالی (وفات: تقریباً ۱۱۲۶) سے ہوگئی۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ احمد الغزالی کی ذاتی راہ نمائی ہی تھی جس کے طفیل وہ عقلی فکر کی تمام حدود کے ماورا خود اقلیم الہی میں بڑی دور تک نکل گیا، وہ اقلیم جہاں انسانی عقل اور اس کی منطقی کارکردگی کی تمام تر قوت زائل ہو جاتی ہے۔

ہمدانی کے نزدیک انسان کا اقلیم الہی میں قدم رکھنا بڑی فیصلہ کن اہمیت کا واقعہ ہے۔ یہ اس آگہی پر مشتمل ہوتا ہے کہ اس کے باطنی شعور میں ایک نئی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ حیاتی اور عقلی تفکراتی سطح سے آگہی کی ایک بالکل مختلف سطح کی طرف انتقال ہے۔ وہ حدوث کر یہ وقفہ مکانی کا اشارہ ہے۔ ہمدانی اس وقوع پذیری کو "انفتاح عین البصیرہ" یا "عین المعرفہ" کے طور پر بیان کرتا ہے۔ وہ اس کی طرف یہ کہہ کر بھی اشارہ کرتا ہے "تمھارے باطن میں ایک کھڑکی کھل گئی ہے جس کا رخ اشیا کے فوق حیاتی نظام کی اقلیم کی طرف ہے" (... عالم الملکوت)۔ اسے یوں بھی بیان کیا گیا ہے "باطن میں روشنی کا ظہور" (ظہور نور فی الباطن)۔ یہ وجودی انقلاب ہے۔

یہ کسی (subjective) ''روشنی'' اس نقطے کو منور کر دیتی ہے جسے ہمدانی ''اقلیم ماورائے عقل'' (الطور وراء العقل) کا نام دیتا ہے یہاں یہ کہ ہمدانی عقل اور عقلی فکر کی اہمیت کو منفی گردانتا ہے یا اسے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بے شک اس کی دانست میں آدمی اس وقت تک کاملیت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک عقلی قوتوں کی انتہا کو پہنچنے کے بعد ''ماورائے عقل خطے'' میں داخل نہیں ہو جاتا۔ شے کے اس بعد میں جو عقل کے پار واقع ہے (trans-rational dimension of things)۔ اس کے تصور میں خود عالم وجود کی پوری وضع (structure) کچھ اس طور پر ہے کہ عملی تجربات کے حلقے کی آخری منزل ''ماورائے عقل خطہ'' ہی کے اولین پڑاؤ سے بہ راست طور پر جڑی ہوئی ہے۔

ان تمہیدی ملاحظات کے بعد اب ہم بجا طور پر ان مخصوص مسائل کے فطری کردار پر بحث کر سکتے ہیں جو ہمدانی نے انسانی بیان کی معنیاتی وضع کے اعتبار سے اٹھائے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے تصرف میں جو لفظ اور ان کے مرکبات ہیں وہ عموماً اس طرح پر ہے ہیں کہ انہیں روز مرہ کی بات چیت میں بے حد سہولت کے ساتھ اور حسب ضرورت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہماری زبان اپنا کام اس وقت بہ حد خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے جب ہم اسے اپنی عملی دنیا کے تجربات کے اظہار اور بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں ہمارے حواس اور عقل اپنے فطری عمل بجا لاتے ہیں۔ لیکن اس حد میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اس احساس سے پریشانی ہونے لگتی ہے کہ وہ چیز جو ہم محسوس کر رہے ہیں یا جسے جانتے ہیں اس کے اور وہ جو ہم بیان کر سکتے ہیں کے درمیان ایک خاصی کشادہ خلیج حائل ہے۔ جیسا کہ لڈوگ وٹگن سٹائن (Ludwig Wittgenstein) نے خیال ظاہر کیا ہے اگر کسی کو یہ تو معلوم ہو کہ کوہ بلانک کی بلندی کتنی ہے تاہم وہ بیان کرنے سے عاجز رہے تو فطری بات ہے کہ ہم اس پر تعجب کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جانتا ہے کہ کلارنٹ کی آواز سننے میں کیسی ہے لیکن وہ بیان نہیں کر پاتا تو اس پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ کلارنٹ کی آواز کیسی سنائی دیتی ہے ایسی چیز نہیں جسے ہمارے تصرف میں جو الفاظ ہیں ان کی یک عام قسمت و بہ خاصت سے بیان کیا جا سکے۔ [۱] یقیناً یہ صورت اس وقت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے جب انسانی تجربے کے عملی دائرے کے علاوہ ہم روحانی یا متصوفانہ آگہی کے ماورائے عمل بعد کے استناد کے بھی قائل ہوں۔ جب ایک صوفی اپنے اظہار کی یا اپنے ذاتی مشاہدات کو بیان کرنے کی کبھی خواہش بھی کرتا ہے تو اس کے لیے ان تمام لسانیاتی مسائل سے برآمد ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے جو اس کے تمام ذاتی کے اور جو وہ فعلاً بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس کے درمیان عدم توافق سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ [۱۱]

تو پھر وہ کون سا کارگر ذریعہ ہو سکتا ہے جو ایک صوفی اپنے لسانی اور فکری خلقی کم مائیگی کے ازالے کے طور پر استعمال کر سکے؟ یا یسے اور کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ علامتیت (symbolism) شاید سب سے پہلے ذہن میں آئے۔ حقیقت میں تمام ادوار کے بیش تر متصوف شعراء نیل کر متصوف فلاسفہ نے علامات کے نظام وضع کیے ہیں اور ان میں پہلو داری ڈھونڈی ہے لیکن یہ علامتیت نہیں جس سے ہمدانی رجوع کرتا ہے۔ اس کے بجائے وہ یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ایسے موقعوں پر آدمی کو الفاظ کا کثیر الجہتی (multi-dimensional) استعمال کرنا چاہیے، جیسے وہ ''متشابہ'' یا ''ابہام گوئی'' (equivocation) کا ہوتا ہے۔ درحقیقت، ہمدانی کے مطابق، اسلام کے دینی فلسفے کی کثیر کلیدی اصطلاحات کی تفہیم ''متشابہ'' کے ذریعے ہی ہونی چاہیے۔

بہر حال کسی لفظ کے کلی معنی کی تفہیم کے لیے جو بہ طور متشابہ استعمال ہوا ہے ان موقعوں سے قطع نظر جب ہم خود ہی لفظ کو اس طرح استعمال کر رہے ہوں یہ ضروری ہے کہ ہم ایک لفظ اور اس معنی کے درمیان جو وہ ادا کرنا چاہتا ہے معنیاتی بعد کے لحاظ سے میں ایک انتہائی لچک دار ہو گویا کہ قابل تغیر یا متحرک (mobile) رو یہ کی پرورش کریں۔

کر سکتا جس ہی اس کے ذریعے ترسیل معانی ہو۔ یہ کسی لفظ کے سانچے میں ڈالے گئے اس معنی پر خاص طور پر صادق آتا ہے جس کے پیچھے یہ عمیق ماورائے تجربہ کارفرما ہو۔ جب معنی اس قسم کی غیر تجربی نوعیت (non-empincal nature) کا ہو تو اس کو اجاگر کرنے والا لفظ لامحالہ تشابہ کی انتہا (غایۃ التشابہ) کو پہنچ جاتا ہے۔[۱۲]

ان صورتوں میں، اجاگر کیے جانے والے معنی کی بے کم و کاست بصیرت کے حصول کے لیے، آدمی کو دلائرہ بکر ہے وہ لفظ کی بابت بڑا لطیف، وہ بے انتہا ادراک کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہاں آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی مخصوص لفظ کو اس نتیجے کی طرح استعمال کرے جس سے چھلانگ لگا کر معنی کی گہرائی میں اتر جایا جا سکے۔ آدمی جب تک یہ کوشش کرتا رہے گا کہ لفظ کے ذریعے معنی کو سمجھے تو وہ کبھی بھی کامیابی کی امید نہیں کر سکتا۔ بلکہ لفظ سے وہ لین اور ابتدائی تماس کے ساتھ ہی آدمی کو چاہیے کہ اسے وہیں چھوڑ چھاڑ کر سیدھے معنی کی اقلیم کا رخ کرے۔ ۵۵
لیکن، ہم جملوں کی حقیقی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے ہمدانی کے مطابق تشابہ کی وضع پر روشنی ڈالنی ہوگی۔

عام طور پر "تشابہ" کسی لفظ کے استعمال میں غیر یقینی، عدم تعیین، اور ابہام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس قسم کی خصائص کا سرچشمہ اکثر لا مرکثیر معنویت (polysemy) ہے جو ایک مصالحاتی مظہر ہے جس میں ایک لفظ اپنے بنیادی ڈھانچے میں متعدد مختلف معنی کا حامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر عربی لفظ عین کو سیاق و سباق کی وضاحت کیے بغیر یا کافی سیاق و سباق کی حدود میں استعمال کیا جائے، تو کہا جائے گا کہ آدمی لفظ کو تشابہ کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ عین کے بہت سے مختلف معنی نکل سکتے ہیں جیسے "آنکھ"، (پانی کا) "چشمہ"، "ذات"، "خلائی ٹکڑا"، "اخیانی بھائی" وغیرہ۔

لیکن ہمدانی کے تصور میں جو تشابہ ہے وہ اس قسم کی کثیر معنویت سے یکسر مختلف ہے کیوں کہ عین سے متعلق سبھی مختلف معنی کا قیام ایک یک سانی بُعد میں ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ افقی کثیر معنویت کا معاملہ ہے لیکن ہمدانی کا سروکار عمودی کثیر معنویت سے ہے۔ موخر الذکر معنی کی کثیر الجہتی وضع ہے جس کا دارومدار لفظ کے کثیر الجہتی استعمال پر ہے۔

چناں چہ جس طرح ہمدانی نے تشابہ کا تصور کیا ہے اس کا تعلق ان موقعوں سے ہے جن میں بالکل ایک ہی لفظ — بالکل ایک ہی فقرہ — بہ اہمیت طور پر اور ایک ہی وقت میں بیان (discourse) کی دو یا دو سے زائد سطحوں پر استعمال ہوا ہوتا ہے۔ بیان کی اس قسم کی بہت سی سطحیں ہیں جن کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن ہمدانی بہ طور خاص ان میں سے دو سے علاقہ رکھتا ہے [الف] یعنی عقلی غور و فکر کی سطح، اور [ب] یعنی اس اقلیم کی سطح جو ماورائے عقل ہے اور جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

لسانیاتی طور پر سطح [الف] انسانی تجربے کے عملی بُعد میں عام طور پر بولی جانے والی زبان کی منطقی توسیع near extens on, کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس خاص سیاق و سباق میں جس سے ہمیں بلاواسطہ سروکار ہے [الف] بہ طور مثال ان لسانیاتی فقروں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کا تعلق الہیاتی تصورات و فکر سے ہے۔ مثال کے طور پر، علمائے الہیات اکثر انسان کے خدا سے "قرب" اور "بعد" کا ذکر کرتے ہیں۔ چناں چہ، مثلاً وہ لوگ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے "دور" ہیں، جب کے مومنین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے "نزدیک" یا "قریب" ہیں۔ بہ ظاہر، یہ الفاظ کا بالکل بے اہمیت استعمال ہے۔ اس سیاق و سباق میں "قرب" اور "بعد" کے تصورات صرف محض حسیاتی اشیا کے، جن سے ہم اپنی روزمرہ کے عملی تجربات میں دوچار ہوتے ہیں، "قرب" اور "بعد" کی دنیاوی صراحت کا نتیجہ ہیں۔ نتیجتاً اس سطح پر، ان دونوں تصورات کی تفہیم بنیادی طور پر ایک ذہنی تصور یا مکانی فاصلے spatia distance, کے خیال کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

لیکن یہی الفاظ، قرب اور بُعد دوسری طرح بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں اور حقیقت میں اہلِ تصوف اپنے مخصوص وجدانات کو بیان کرنے کے لیے، خواہ یہ مذہبی ہوں یا مابعد الطبیعاتی، اکثر انھیں استعمال کرتے بھی ہیں۔ اس صورت میں، الفاظ تجربے کی اس بیرونی سطح کے مطابق جو ہم نے اختیار کی ہے سطح [ب] پر استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ سطح [ب] کی بابت یہ نکتہ خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس مقام پر جو معنی متشکل ہوتا ہے اس تک اس معنی کے ذریعے رسائی ہرگز نہیں ہو سکتی جو سطح [الف] پر دستیاب ہوتا ہے۔ چاہے ہم سے کتنی ہی وسعت کیوں نہ دے لیں۔ اور یہ اس لیے کہ تمام الفاظ کے سطح [ب] پر اجاگر ہونے والے معنی کی اساس ماورائے تجربات (cogn tive experiences) پر ہوتی ہے اور یہ اس سے قطعاً مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں جس کا تجربہ عقلی تفکر کے بُعد میں کیا جاتا ہے روزمرہ کی زندگی کے بُعد کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ یہ اس لیے کہ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے سطح [ب] پر معنی کا احساس "اقلیمِ ورائے عقل" میں صرف "چشمِ بصیرت" سے ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ، مثال کے طور پر، ہمدانی کی دانست میں اس سطح پر قرب کا مطلب ایک مخصوص ہوتی انتہائی تعلق ہے جو تمام موجودات اور سرچشمۂ وجود کے درمیان (between all existents and the Source of existance) حاصل ہوتا ہے یک بے حد خاص اتصالی تعلق، جس کی وضاحت کا بھرپور تجزیہ بعد میں کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے اس مقام پر "قرب" کا مطلب مطلق وجودی مساوات سے متصف وہ تعلق ہے جو تمام اشیا کو خدا کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔ لفظ "بُعد" کو لامکانی مفہوم میں استعمال کرتے ہوئے، ہمدانی اکثر یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ تمام اشیا خدا سے مطلق مساوی فاصلے پر مقیم ہیں۔ ۱۱ اگرچہ خود ہمدانی سطح [ب] پر "بُعد" کے معنی کا تجزیہ صراحتاً نہیں کرتا، پھر بھی یہ واضح ہے کہ چوں کہ اس اقلیم میں کوئی مکانی حوالہ شامل نہیں ہے "بُعد" کے بھی بے کم و کاست وہی معنی ہیں جو "قرب" کے ہیں، یعنی تمام اشیا خدا سے ایک ہی (غیر مکانی) فاصلے پر ہیں۔

اگرچہ، اس طرح، ایک ہی لفظ، "قرب"، کے دو بالکل مختلف معنی نکلتے ہیں، ہمیں اس غلطی کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے کہ [الف] کے معنی اور [ب] کے معنی کا ایک دوسرے سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ معنی [الف] اور معنی [ب] کے درمیان تعلق اس نوعیت کا بالکل نہیں جو مشترک الفاظ میں کے ممکنہ معنی "چشمہ"، "آنکھ"، "خلا"، "جوہر" وغیرہ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ سطح [ب] پر بھی، قرب کے معنی "نزدیکی" ہی ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ فوق الحسیاتی بُعد میں جو "قرب" متشکل ہوتا ہے اس کی وضع اس "قرب" سے یکسر مختلف ہوتی ہے جو تجربے کے حسیاتی یا عقلی بُعد میں عیاں ہوتی ہے۔ اسی بات کو دوسری طرح سے کہیں تو انسانی شعور میں رونما ہونے والی تکمیلی تبدیلی (qualitative change) کے مطابق "قرب" کے معنیاتی مظروف مکانی سے غیر مکانی میں بدل جاتے ہیں۔ لیکن اس تبدیلی سے یہ بات غیر متاثر رہتی ہے کہ ایک ہی لفظ باہمیت اور بہ معنی طور پر دو مختلف سطحوں [الف] اور [ب] پر کام کر رہا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ دونوں میں سے کون سا معنی — [الف] یا [ب] — اصلی اور حقیقی ہے؟ (یا کون سا مجازی اور استعارتی؟)۔ دونوں ہی مساوی طور پر مستند اور حقیقی ہیں، ہر ایک اپنے مخصوص بُعد میں، کیوں کہ ہر ایک کے عقب میں ایک مستند تجربہ کار فرما ہے۔ مثال کے طور پر، جب میں یہ کہتا ہوں، "میں ایک پھول دیکھ رہا ہوں" تو تجربی سطح پر میرے مشاہدے کا ایک مستند معنی ہے جو ایک مستند حسیاتی تجربے پر مبنی ہے۔ اسی طرح جب میں کہتا ہوں، "کل اپنے اجزا میں ہر ایک سے بڑا ہے" تو عقلی غور و فکر کی سطح پر میرے بیان کا یہ مستند معنی ہے (سطح [الف])۔ اسی طرح جب منصور الحلاج انا الحق، "میں مطلق ہوں" کہتا ہے تو فوق الحسیاتی اور فوق العقلی تجربی سطح (یعنی سطح [ب]) پر بیان کا مستند معنی ہے۔ ۱۲ واحد اہم نکتہ یہ ہے کہ تینوں جملوں میں سے ہر ایک کی تفہیم اسی بُعد میں کی جانی چاہیے جس سے اس کا تعلق ہے۔ سطح [ب] سے متعلق الفاظ اور جملوں کی اس نوع کی تفہیم کا حصول ناممکن نہ بھی سہی انتہائی مشکل ضرور ہے کیوں کہ [illegible]

انا الحق اور [بایزید] بسطامی کا سبحانی، اور اسی قسم کے دوسرے شطحیات، یہ سب کے سب ارفع ترین روحانی کیفیت کے حامل متصوفین کے وہ الہامی بول ہیں جو آگہی کی غیر معمولی کیفیت میں ان سے صادر ہوئے — وہ کیفیت جس میں ان کی قوتِ تعقل زائل ہو چکی تھی اور وہ "ربانی علم آور روشنی کی تاب نہ لاکر بے خود" ہو چکے تھے۔

اب یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اگر کوئی اس قسم کے بولوں کے معنی خاص سطح [ب] کی حدود میں، جس سے ان کا تعلق ہے سمجھنے کے قابل ہو سکے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی اس نوع کے عارفانہ تجربے سے گزر چکا ہو۔

> یہاں اب اور کوئی موضوعِ دانش نہیں رہا ہے، فعلِ دانش خود فنا ہو چکا ہے، اور ہر شے موضوعِ دانش میں بدل گئی ہے (حق اگر یہ کہم وکاست کہا جائے تو، اب اور موضوعِ دانش نہیں رہی، کیوں کہ اسے جانے والا موضوع ہی نہیں رہا)۔ بس اسی کیفیت میں یہ باقی ماندہ فقط خود کو خالص اور مطلق الوہیت (جبروت) کی فضا میں عیاں کرتا ہے تو یہ "میں حسین (الحلاج) انا الحق" کے علاوہ اور بھی کیا کہا جا سکتا ہے یا یزید (بسطامی) "سبحانی" کے علاوہ اور کیا۔ ۵۳

اب یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اگر کوئی اس قسم کے بولوں کے معنی خاص سطح [ب] کی حدود میں، جس سے ان کا تعلق ہے سمجھنے کے قابل ہو سکے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی اس نوع کے عارفانہ تجربے سے گزر چکا ہو۔

نتیجتاً، ایسے افراد کو جنھیں اقلیم ورائے عقل کا بلاواسطہ تجربی علم نہیں، سطح [ب] پر لفظوں کا استعمال — اگر وہ نظریاتی طور پر لفظوں کے اس استعمال کے روا ہونے کا اعتراف کرتے بھی ہوں — اگر پر اسراری نظر آئے گا۔ ۵۴ مختصراً، سطح [ب] پر استعمال ہونے والے الفاظ انسانوں کی کثرت کے لیے استعارے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً لفظ "نور"، "روشنی"، جب خدا کو نور کہا جاتا ہے تو یہاں ان کے لیے صرف ایک استعارہ ہی ہوتا ہے۔

لیکن وہ افراد جو "اقلیم ورائے عقل" میں ہو آئے ہیں تو ان کے نزدیک یہ سطح [الف] ہو لا معنی (یعنی نور طبیعیاتی روشنی کے مفہوم میں) ہی استعاراتی ہے۔ یہ اس لیے کہ [ب] کا حد ٹھیک وہی مقام ہے جہاں حقیقت کا تجربہ اس کی اصلی، مطلق حالت میں ہوتا ہے۔ اس مخصوص سیاق و سباق میں زبان کا [الف] استعمال استعاراتی ہے جب کہ [ب] استعمال حقیقی۔ ۵۵

[الف] اور [ب] سطحوں پر زبان کی معنیاتی وضع کی وضاحت کی ایک ٹکسالی مثال کے طور پر ہم علم کے لفظ کو لیتے ہیں جیسا کہ یہ "خدا کا علم" فقرے میں استعمال ہوا ہے اور جس کی بابت ہمدانی خود بڑی تفصیل سے کام لیتا ہے۔ سابقہ متن کی طرح [الف] دنیاوی اور [ب] فوق العقلی یا عارفانہ پیچیدگی کی سطح کی نمائندگی کرتا ہے۔

سطح [الف] پر جیسا کہ پہلے نشان دہی کی جا چکی ہے زبان کے عام استعمال کی دنیاوی توسیع سے، یہ وہ کچھ نہیں، "خدا کچھ جانتا ہے" کو ظاہر ہے "آدمی کچھ جانتا ہے" پر قیاس کر کے سمجھا جاتا ہے اور اس تفہیم کی حدود میں علما مذہبی مختلف دینیاتی مسائل کو "صفاتِ الٰہی" کے تحت اٹھاتے اور ان پر بحث کرتے ہیں، کیوں کہ اس سیاق و سباق میں علم کو خدا کی صفات میں سے ایک صفت تصور کیا جاتا ہے۔

چوں کہ جس طرح ایک لفظ کا معنی سطح [الف] پر سمجھا جاتا ہے وہ بنیادی طور پر اور آخر الامر اسی لفظ کی تجربی قبل دینیاتی تفہیم کی نظریاتی توسیع اور وضاحت کے ماسوا نہیں، اسی لیے علم کو بھی قدرتی طور پر اسی معنی پر قیاس کر کے سمجھ لیا جاتا ہے جو اس لفظ کے عام روزمرہ میں ہوتے ہیں۔ اجمالاً عام تجربی سطح میں "علم" کی اپنی مخصوص وضع ہے جس کی بنیاد ذہن (عالم) اور شے (معلوم) کے درمیان ایک دو عددی، دو عنصری (two-term) تعلق پر استوار ہوتی ہے اور اس تعلق مدرک میں جو عجیب بات ہے وہ یہ کہ یہاں ذہن منفعل ہے، وہ یقین دلاتی ہے۔

تصنیف صحیح ہاؤں) اسے لکھنے سے پہلے ہی میرے ذہن میں موجود تھا۔ اور میرا علم اس مکتوب کے وجود کا سبب بنا۔ اگر میرا علم نہ ہوتا، تو یہ مکتوب لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی بابت تمہارا علم، اس مکتوب کے وجود کے بعد آیا۔ اور یہ مکتوب تمہارے علم کے وجود کا سبب تھا۔" ۲۵ اللہ عد ے علم اور جزیات کے درمیان تعلق کو اسی وضع کا سمجھنا چاہیے جو اس مثال میں "میرے علم" اور "میرے اس مکتوب" کے مابین ہے۔

اس طرح دو طرح کے علموں کے درمیان بنیادی فرق قائم کر کے ہمدانی کی فکر اشیا کے مابعد الطبیعاتی وحدت کے تقریب پہنچتی ہے۔

علم اول یعنی سرچشمۂ وجود" (سرچشمۂ وجود) ہے تمام موجودات کی، چاہے وہ تجربی دنیا کی ہوں یا فوق التجربی دنیا کی ہوں اس کے اول علم کی لامتناہی وسعت سے ٹھیک وہی نسبت ہے جو اس مکتوب کے نقش (ایک واحد لفظ کے) ایک واحد حرف کو میرے علم اور استعداد کی وسعت سے ہے۔ ۲۶

یہ نتیجہ نکالتے اور بیان کی ارفع ترین سطح (سطح [ب]) کے درمیان صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف، سطح [ب] اور گزشتہ سطحوں کے درمیان، چاہے [الف] یا درمیانی ایک قابل ذکر فرق بھی نظر آتا ہے کیوں کہ درمیانی سطح پر بھی، جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے اور جو وضع طور پر بہت زیادہ مابعد الطبیعاتی اور وجودی نوعیت کی ہے لفظ "علم" ہنوز کسی قدر علمیاتی تعبیر (epistemological connotation) کا حامل ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، "علم" کی اصطلاح کے استعمال میں ہنوز کچھ حوالہ، چاہے یہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو، انسان کی عام ذہنی فاعلیت کی طرف بھی موجود ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ معروضی اشیا کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ اس کے برعکس، سطح [ب] پر استعمال ہونے کی حالت میں، "علم" کسی علمیاتی تعبیر کا مطلق حامل نہیں ہوتا۔ اس کا مفہوم خالص مابعد الطبیعاتی ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہاں خدا کے علم کا مطلب خدا کی معیت (لفظاً "ساتھ ہونا") یعنی تمام اشیا سے مطلق عدم انفصال) ہے، اور نتیجے میں تمام اشیا کا اپنے انتہائی وجودی سرچشمے سے مساوی فاصلے پر قیام۔ یہ ایک دلچسپ نکتہ ہے جس کی کسی قدر تفصیلی وضاحت ضروری ہے کیوں کہ ہمدانی بذات خود یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ اس کا اپنا طبع زاد خیال ہے اور اس مسئلے کے ضمن میں اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کا اظہار نہیں کیا ہے۔ ۲۷

بحث کا آغاز کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہ بات عام مشاہدے میں آتی ہے کہ ہم تجربی دنیا میں اشیا کو مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ تقدم و تاخر کے رشتے میں گھرا دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر شعاعوں کا ظہور طلوع آفتاب کے بعد ہوتا ہے جہاں موخر الذکر اول الذکر کا سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس قلم کی حرکت جس سے میں یہ لفظ لکھ رہا ہوں میرے ہاتھ کی حرکت کی تابع ہے جو اپنی باری میں لکھنے والے کی حیثیت سے خود میرے بعد آتی ہے۔

تاہم خود الٰہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے پر اس قسم کے واقعات کی وضع ایک بالکل ہی مختلف روشنی میں نظر آئے گی۔ اس نقطۂ نظر سے، آفتاب اور اس کی شعاعیں دونوں ہی مطلق سے یکساں فاصلے پر کھڑے نظر آئیں گے۔ اسی طرح (۱) قلم جو وہ آلہ ہے جس سے میں لکھ رہا ہوں، (۲) خطوط جو میں نے لکھے ہیں، اور (۳) لکھنے والا (یعنی خود میں) ایک واحد سطح پر مطلق سے یکساں فاصلے پر کھڑے ہیں۔ اور یہ سب اس لیے کہ اب ہم ایک مابعد الطبیعاتی منطقے میں ہیں جہاں اشیا کے درمیان کوئی زمانی تواتر (علی الخصوص، منطقی طور پر، مسلسل "عمودی نظام") نہیں ہوتا۔ یہاں سب چیزیں وجود کی ایک بے کراں اور بے پایاں پہنائی (عرض، منطقی طور پر، "چوڑائی"، "افقی نظام") میں [illegible] [ہم زیست] تصور کی جاتی ہیں۔

ہمدانی ابن سینا کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موخر الذکر نے اشیا کے درمیان جب سببی تعلق کے ذریعے خدا کے وجود کے بارے میں اپنی دلیل قائم کی تو اس وقت اس نے تجربی وحدت کو وحدت الٰہی سے خلط ملط کر دیا تھا۔ ایک چیز، الف، کو وجود میں آنے کے لیے، کسی اور

نہیں۔" ۲۴ چناں چہ، ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں خدا اشیا کے ساتھ ہے لیکن ہم اس ترتیب کو الٹ کر یہ نہیں کہہ سکتے شیا خدا کے ساتھ ہیں۔ ۲۵ یہ اس لیے کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جو خدا کے روبرو کھڑی ہو سکے۔ یہ خدا ہی ہے جو اپنا رخ (وجہ) تمام اشیا کی طرف کرتا ہے اور یہی اس قول کا حقیقی مطلب ہے کہ خدا کو سب چیزوں کا علم ہے۔ ۲۶ خود اشیا کا کوئی رخ نہیں جسے وہ خدا کی طرف پھیر سکیں۔

چوں کہ عام حالات میں ہمارے لیے کسی ایسی نسبت کا تصور کرنا ممکن نہیں جس میں طرفین میں سے ایک "لاشے" ہو، ہم "لاشے" کو کوئی شے تصور کر لیتے ہیں اور دونوں کے درمیان ایک دوطرفہ نسبت فرض کر لیتے ہیں (الف ← → ب)۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشیا خدا کے سامنے کھڑی ہیں، اپنا رخ اس کی طرف کر رہی ہیں (مقابلہ)۔ ۲۷

لیکن، دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ اشیا ایک خاص نوعیت کی حقیقت کی حامل ہوتی ہیں جو خدا کی ان کی طرف توجہ سے ماخوذ ہوتی ہے۔ اس مفہوم میں اشیا اور خدا کے درمیان ایک دوطرفہ نسبت کا وجود ہوتا ہے۔ اور اس تناظر میں دنیا کے موجودات میں سے ہر موجود ایک ہی وقت میں "موجود" بھی ہوتا ہے اور "معدوم" بھی۔ یہ عجیب و غریب وجودی صورت حال ہے جو لفظ "علم" بیاں کی سطح [ب] پر بیان کرتا ہے۔ جس طرح ہمدانی تشابہ کے مظہر کو سمجھتا ہے وہ ایک کثیر الجہتی وضع پر مشتمل ہے جو دو یا دو سے زیادہ معنی سے تیار کی جاتی ہے (جیسے لفظ "علم" کے سطح [الف] اور [ب] پر معنی)، جو مشاہدے کے گہرائی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ایک وحدت یافتہ اصل (entity) میں ایک دوسرے کے ہم کنار کر دیے جاتے ہیں۔

حواشی

۱۔ اس مطالعے کی بنیاد ہمدانی کی تین اہم تصانیف ہیں جو تہران میں ایڈٹ اور شائع ہوئی ہیں۔ زبدۃ الحقائق (عربی)، ایڈٹ کردہ عفیف عسیران، ۱۹۶۲ء تمہیدات (فارسی)، ایڈٹ کردہ عفیف عسیران، ۱۹۶۲ء؛ نامہ ھای عین القضات ہمدانی [رسائل] (فارسی)، ایڈٹ کردہ عفیف عسیران اور علینقی منزوی، ۱۹۶۹ء۔ میں مسرت کے ساتھ یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس مقالے کی تیاری کے دوران میں نے ادارۂ مطالعات اسلامیہ، میکگل یونیورسٹی کے پروفیسر ہرمس لینڈولٹ کے مفید مشوروں سے استفادہ کیا ہے۔

۲۔ عین القضات نے خود روحانی ارتقا کا یہ سارا عمل بڑے خوب صورت تمثیلی تشابہ کے ساتھ اپنی زبدۃ الحقائق میں بیان کیا ہے ۔۶۰۔

۳۔ ایضاً، ۷ اور متفرق مقامات پر۔

۴۔ ایضاً، ۳۰۔

۵۔ ایضاً، ۵۸۔

۶۔ ایضاً، ۳۶۔

۷۔ ایضاً، ۲۷، اور متفرق مقامات پر۔ یہ ایک تکنیکی اصطلاح ہے جو ہمدانی کی نگارشات میں مسلسل سامنے آتی ہے۔ یہ تعلیم ح

عقل کے بعد آتی ہے" (الطور الذی بعد العقل) بھی بیان ہوا ہے۔

۸۔ مذکورہ کتاب میں دیکھیے، ایضاً، ۱۰۔

۹۔ مذکورہ کتاب میں دیکھیے، ایضاً، ۳۵۔

۱۰۔ Ludwig Wittgenstein, *Philosophical Investigations* Translated by G E M Anscombe (New York MacMillan, 1953)، ۲۱۔

۱۔ زبدۃ الحقائق، ۸۸۔

۲۔ نامہ نمبر ۱۰، ج ۲، ۵۳، ۲۵۴۔

۳۔ نامہ نمبر ۵۳، ج ۲، ۱۱۶، ۴۹۵۔

۴۔ زبدۃ الحقائق، ۲۰۔

۵۔ ایضاً، ۸۵۔

۶۔ ایضاً، ۷۷-۷۸۔

۷۔ حلاج کے مشہور بیان کے تجزیے کے لیے دیکھیے، مشکوۃ الغریب، ایڈٹ کردہ عفیف عسیران (تہران، ۱۹۶۲)، ۲۳، ۲۶؛ آربری کا انگریزی ترجمہ *A Sufi Martyr* (London, 1969)، ۳۶، اور تمہیدات، ج ۳۴۸-۳۴۶، ۷۷، ۸۰؛ ج ۳۱، ۷۵۔

۸۔ ایضاً، ج ۳۴۸، ۱۲۰۔ مذکورہ کتاب میں دیکھیے، نامہ نمبر ۳۳، ج ۲، ۵۱۰، ۳۵۵، جہاں "سطح جبروت" کے بجائے "سطح ملک" (یعنی عملی وجود) کا فقرہ استعمال ہوا ہے۔ دونوں فقرے بالکل [صحیح] ہیں کیونکہ زیر بحث متصوفانہ تجربے کا تعلق جبروت کے وجود سے ہے لیکن لسانیاتی اظہار صرف عملی دنیا میں ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔

۹۔ زبدۃ الحقائق، ۱۳۰۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۱-۲۲۔

۱۱۔ نامہ نمبر ۲۱، ج ۲، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷۔

۱۲۔ زبدۃ الحقائق، ۲۲، ۲۵۔ متصوفانہ فکر میں "نور و ظلمت" کی بحث کے لیے اس کتاب کا دوسرا باب "The Paradox of Light and Darkness in the Garden of Mysteries of Shabastan," 38-66 بھی دیکھیے۔

۱۳۔ نامہ نمبر ۸، ج ۲، ۱۴۹، ۱۵۰۔

۱۴۔ عین القضات ہمدانی خود [الف] اور [ب] کے درمیان ایک "درمیانی منطقے" کا ذکر نہیں کرتا۔ نظریاتی طور پر یہ دونوں سطحوں کے درمیان فرق ہی پر قائم ہو جاتا ہے چنانچہ خود اس کے بیان کے مطابق یہاں تجزیہ اور درمیانی فکری حدود ہی میں معلوم ہوگا لیکن وضاحت کی خاطر میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ ہم اسے کوئی الگ شے سمجھیں جو حد [الف] سے ماورا جاتی ہو۔

۱۵۔ نامہ نمبر ۸، ج ۲، ۱۵۰، ۱۵۱۔

۲۶۔ ایضاً، ۹۱، ج۲، ۱۵۲، ۲۶۱۔

۲۷۔ ایضاً، ج۲، ۲۳، ۳۰۔

۲۸۔ ایضاً، ج۲، ۲۳، ۳۱۔

۲۹۔ ایضاً۔

۳۰۔ بعد کے ادوار کے اہل عرفانیات کی اصطلاح میں اس نوع کی نسبت کو اضافہ اشراقیہ کہا جاتا ہے۔

۳۱۔ زبدۃ الحقائق، ۳۱۔

۳۲۔ ایضاً، ۲۵۔

۳۳۔ ایضاً، ۶۲-۶۳، ۷۰۔

۳۴۔ ایضاً، ۲۰، ۲۶۔

۳۵۔ ایضاً، ۲۲۔

نوٹ: یہ مضمون توشی ہیکو ایزتسو (Toshihiko Izutsu) کی کتاب *Creation and the Timeless Order of Things. Essays in Islamic Mystical Philosophy* (Ashland, Oregon White Cloud Press, 1994) سے لیا گیا ہے جہاں یہ کتاب کا چوتھا باب ہے (صفحہ ۹۸-۱۱۸)۔

Abstract

This article has been written by a renowned Japanese Scholar Toshihiko Izutsu (d. 1993), who had studied Islamic, Far Eastern and Comparative philosophies and had marvelous linguistic abilities. He knew at least three languages very well and his subjects of study consisted of texts in Arabic, Persian, Chinese, Pali, Sanskrit, Greek and European Languages.

The Translator has chosen the article "Mysticism and the Linguistic Problem of Equivocation in the Thought of Ayn

al-Qudat Hamdani" from the book, "Creation and the Timeless Order of Things. Essays in Islamic Mystical Philosophy", (Ashland, Oregon 1994) In this article the writer has discussed the semantic dimensions of a Muslim philosopher and mystic Ayn al-Qudat Hamdani (1098 1131) a predecessor of Suharwardi and Ibn-ul Arabi. He has analyzed the role and importance of the linguistic factor of equivocation in the thought of al-Qudat Hamdani.

معیار - علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد [illegible]

تدوین کے نقطۂ نظر سے فارسی مخطوطات کی قرأت:
معاون اصول و ضوابط

سی-ای-ولسن
ترجمہ و حواشی: محمد عارف*

[معروف برطانوی مستشرق سی-ای-ولسن کا یہ مضمون جریدہ "اسلامی کلچر" کے شمارہ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ولسن نے خواجہ فرید الدین عطار کی مثنوی "الہی نامہ" کے مختلف مخطوطات کے تقابلی مطالعے کی مدد سے ان عمومی اغلاط کی طرف اشارہ کیا ہے جو اکثر محققین سے مخطوطات کی قرأت کے دوران سرزد ہو جاتی ہیں۔ اپنے تجربات کی بنیاد پر انھوں نے مخطوطات کی قرأت کے کچھ عمومی اصول دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو فارسی مخطوطات کی قرأت کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ تاہم انھوں نے جن اغلاط کی طرف اشارہ کیا ہے اور جو ان کے خیال میں کاتبوں کی ناتجربہ کاری کا نتیجہ ہیں، خود ان سے بھی اس مضمون میں سرزد ہوتی ہیں۔

راقم الحروف نے ولسن کے اس مضمون کا ترجمہ کرتے ہوئے اس امر کی دریافت کو پیش نظر رکھا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں فارسی متون کی ترتیب و تدوین کا جو کام مغرب میں ہوتا رہا ہے اس میں زبان و بیان کے کیسے کیسے مسائل درپیش آتے رہے۔ ولسن کے مشاہدات و تجربات کو پرکھنے کے لیے "الہی نامہ" کے اس مطبوعہ نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے جسے فواد روحانی نے ۲۱ مخطوطات اور مطبوعہ نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد مرتب کیا ہے۔ جہاں جہاں فواد روحانی کے مرجح متن اور ولسن کی قرأت کے درمیان جتنے بھی اختلافات موجود ہیں، ان سب کو حاشیے میں بیان کر دیا گیا ہے۔ دیگر کئی امور کی تفصیل اور مترجم کی آرا بھی حواشی میں درج ہیں۔ م-ع]

* استاد، نگران شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

فارسی مخطوطات کی قرأت کے دوران کاتب کے مزاج کو پیش نظر رکھنا ایک بہت ضروری امر ہے تاکہ اس کے مجموعی کام کا بغور جائزہ لے کر اسے شناخت کیا جا سکے۔ ہر کاتب کے اپنے خاص اوصاف اور لکھنے کا طریقہ ہوتا ہے جس سے قرأت کے دوران بغور مشاہدے اور تقابلی جائزے کی مدد سے ہم واقف ہو سکتے ہیں۔

فارسی مخطوطات میں عام طور پر واقع ہونے والی اغلاط کے متعلق مشاہدے میں آیا ہے کہ ان میں سے بیشتر کاتب کی لاپرواہی اور عربی رسم الخط سے بدرسے میں غلط فہمیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ رسم الخط ایسا ہے جو غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہی ہے کہ ان متعدد مثالوں کی طرف اشارہ کیا جائے جن میں بے پروائی اور غلط فہمیوں کے باعث ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کے استعمال سے ابہام پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اغلاط کا یہ میلان بلاشبہ اتنا عام ہے کہ اس پر مسلسل نظر رکھنے والوں کے لیے چند عمومی اصول یا متبادلات فراہم ہو سکتے ہیں جو کچھ معاملات میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔

بہت سے ایسے عمومی نکات اور اشارے بھی اس مضمون میں شامل کیے گئے ہیں جن کی مدد سے کاتبوں کی عادتاً ہونے والی ظاہر ہونے والی خصوصیات سے باخبر رہنے میں مدد مل سکتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی اقتباس کے حوالے سے، یہ اصول اور اشارے ایک اضافی معاونت کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاق و سباق کے عمیق مشاہدے، مصنف کی فکر اور دلائل کے عمومی رجحان سے واقفیت اور دیگر متون سے تقابلی مطالعے کا بدل نہیں ہو سکتے۔

درج ذیل نکات "الٰہی نامہ" کے دو نسخوں (ایک، جو برٹش میوزیم میں ہے اور خط نسخ میں ہے اور جس پر ۱۰۱۷ھ کی تاریخ ثبت ہے اور دوسرا جو لیڈن لائبریری میں ہے اور خط نستعلیق میں ہے اور جس پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن غالباً یہ سترہویں صدی کا ہے)، انڈیا آفس اور برٹش میوزیم میں موجود مخطوطات اور ایک ۱۸۷۲ء کے ہندوستانی (لکھنو) لیتھوگراف نسخے پر مبنی ہیں۔

"الٰہی نامہ" عطار کی سب سے دلچسپ اخلاقی اور صوفیانہ مثنویوں میں سے ایک ہے۔ عطار تین عظیم صوفی شعرا میں سے دوسرے ہیں جب کہ پہلے سنائی اور تیسرے رومی ہیں۔ یہ نظم عطار کے اس مخصوص طرز نگارش کی حامل ہے جسے اس نے منطق الطیر میں بھی برتا ہے اور جس کے تحت نظم میں، اخلاقی اور صوفیانہ تعلیم دینے کے لیے شاعر کے بجائے ایک فرضی کردار متعارف کروایا گیا ہے۔ الٰہی نامہ میں یہ کردار چھ بیٹوں کا باپ خلیفہ ہے جو ان میں سے ہر ایک کو کسی دلچسپ کہانی کے ذریعے حکمت و دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔

"الٰہی نامہ" کے علاوہ تصوف کے موضوع پر عطار کی تیس سے زیادہ تصانیف ہیں اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ان میں سے صرف دو "منطق الطیر" اور ایک مختصر رسالہ "پند نامہ"، متن اور تراجم کی صورت میں شائع ہوئی ہیں لیکن ان میں سے پہلی انتہائی غیر تسلی بخش صورت میں اور دوسری اپنے دعوے سے بہت آگے کے فاضل محقق بارون سلویسٹر دی ساسی کی بدولت یادگار۔

اب اپنے موضوع پر واپس آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت پرانے اور خصوصاً خط نسخ میں تحریر شدہ مخطوطات کے مطالعے کے دوران ہمیں تحریر کے بہت سے پرانے طریقوں سے واسطہ پڑتا ہے جو بعد کے مخطوطات میں نہیں ملتے۔ زمانہ حاضر کے کاتب کو شاید ہی دقت ہو ان کے اظہار پر صاف کیا جا سکے کیوں کہ اس قدیم طرز تحریر کو ایک طبع شدہ متن میں قائم رکھنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ الجھن کا باعث بھی بنتا ہے۔

اس قدیم طرز تحریر میں خاص طور پر جن صورتوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں: بعض صورتوں میں حرف "دال" کے اوپر ایک نقطہ کا ہونا، اکثر لفظ کے آخر میں "علامت سکون" کا استعمال، "آ گی" کے بجائے "آ یک" کا لفظ، اور حرف علت کی آواز سے پہلے آنے والی "ء" ساکن پر "ہمزہ" کی علامت تا کہ ظاہر ہو سکے کہ حروف علت سے پہلے "ء" کی آواز نہیں بلکہ اس سے پہلے آنے والے حرف کی آواز سنائی دے

چاہیے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جو Would کا املا جانتا ہو 'ڈ' کی آواز نہیں نکالے گا اور یوں امر مجہول ایک تجسس کا باعث ہی سے گا کیوں کہ قاری اسے زیادہ اہم علامت کے طور پر لے سکتا ہے۔

اب تک ہم زیادہ تر الفاظ میں ہونے والی اغلاط پر غور کرتے رہے ہیں۔ تاہم ایک تسلی بخش متن ترتیب دینے کے لیے، ہمیں کاتب سے عمومی طور پر اس کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنا کام سرانجام دینے کے لیے کس حد تک موزوں تھا۔ اس بات کی ضرورت کا احساس اس امر سے ہوتا ہے کہ بہت سی صورتوں میں کاتب، خود کو مدون بھی سمجھ لیتا ہے اور اپنے ذاتی فہم (یا کم فہمی) کی بنا پر، ایک ایسا متن مرتب کرنے کے لیے جسے وہ خود درست سمجھتا ہو، ذاتی فیصلوں پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال وہاں ملتی ہے جہاں وہ کسی نظم میں، بہت سے مقامات پر اشعار میں اضافہ کر دیتا ہے۔ جب مصنف نے اپنے افکار کو بھرپور اور واضح طور پر بیان کر دیا ہو، اور جہاں مزید اشعار کا اضافہ اصل متن کو محض ہلکا اور کمزور بنا سکتا ہو، کاتب اپنی عقل کے مطابق سمجھ بیٹھتا ہے کہ ابھی مزید کچھ پھیلاؤ اور وضاحت کی ضرورت ہے اور اپنے کچھ اشعار اس میں شامل کر دیتا ہے۔ تاہم کوئی بھی تجربہ کار اور سمجھ دار مدون ان الحاقی شدہ اشعار کو آسانی سے الگ کر سکتا ہے۔

بہرحال متذکرہ معاملہ میں، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، ہم خاص طور پر الفاظ کی غلطیوں کو دیکھیں گے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس برٹش لائبریری اور بادلین لائبریری کے دو مستند نسخے موجود ہیں، کیوں کہ ان نسخوں کی عمومی صحت، ہمیں ایسے اضافوں کو شناخت کرنے اور ہٹا دینے یا اغلاط ظاہر ہونے والی اغلاط کی تصحیح میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

حافظ کی تخلیقات کے مخطوطات مجموعی طور پر بری طرح مسخ ہو چکے ہیں۔ میں نے اس کے "ساقی نامہ" کا جو ترجمہ کیا ہے اس کے لیے زیادہ تر انھی دو نسخوں سے مدد لی ہے اور ان دونوں میں سے بھی برٹش میوزیم کا ۱۴۱۰ء کا نسخہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ جن مزید مخطوطات سے مدد لی گئی ہے ان میں سے کچھ برٹش میوزیم کے ہیں اور بہت سے انڈیا آفس کے۔ ۱۸۶۲ء کا ہندوستانی (لکھنؤ کا) نسخہ بھی، جو میرے زیر استعمال رہا ہے نمایاں ہے کیوں کہ وہ زیادہ تر برٹش میوزیم کے ۱۴۱۰ء کے نسخے سے قریب تر ہے لیکن اس میں کئی غیر یقینی قرأتیں بھی ہیں جو اکثر ہندوستانی لیتھوگراف نسخوں میں عام ملتی ہیں۔

بادلین کا مخطوطہ کچھ مقامات پر (خاص طور پر تعارف کے حصے میں) برٹش میوزیم والے مخطوطے سے کسی حد تک مختلف ہے لیکن انڈیا آفس کے مخطوطات عموماً اتنے مختلف اور واضح طور پر مسخ شدہ ہیں کہ متن کی تدوین کے لیے کسی کام کے نہیں، اگرچہ وہ اس مقالے کے مقاصد حاصل کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتے ہیں: خستہ حالت کے مخطوطات بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنے اعلیٰ مخطوطات۔

قرأت یا تدوین کے لیے درج ذیل نکات میں سے کسی ایک کو اصول کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں زیادہ تر اتفاقی طور تدابیر ہیں جنھیں اس وقت ذہن میں رکھنا ضروری ہے جب اچھی طرح پڑھنے کے باوجود بھی کسی اقتباس کا مطلب واضح نہ ہوتا ہو۔ میرا خیال ہے اس پر پورے اعتماد سے عمل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہاں صرف ایسے متبادلات فراہم کیے گئے ہیں جو قرین قیاس ہیں۔

اس بات کی توثیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جن متبادلات کو میں نے اپنے "ساقی نامہ" (غیر مطبوعہ) کے متن میں ترجیح دی ہے ان کا مطلب خوب صاف ہے جب کہ رد کردہ متبادل الفاظ مطلب واضح نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ، جو متبادلات یہاں پیش کیے گئے ہیں (ایک دو ترمیمی اصلاحات کے سوا) کسی طور بھی قیاسی نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کو زیر نظر مخطوطات کے اقتباسات سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ اقتباس طویل ضرور ہیں کہ قاری انھیں بآسانی سمجھ سکے اور میرے اختیار کردہ متبادلات کی تائید کر سکے۔ اقتباسات کی طوالت بھی میرے خیال میں اس موضوع کو دلچسپ اور عمومی طور پر قابل قبول بنا دے گی۔

اس شخص نے اپنی زبان کھولی اور کہا: اے بادشاہ میں ایک اجنبی ہوں اور میرا کوئی گھر نہیں۔
بادشاہ کی دہلیز کے سوا میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ بادشاہ کی خدمت کے سوا میری کوئی راہ نہیں۔
جب تک میرے جان و تن باہم رہیں گے میرا سر وہاں ہوگا جہاں بادشاہ کے قدم پڑیں گے۔"

"آین" کے بجائے "آی"

[اسکندر اعظم آب حیوان کی تلاش میں اور ظلمت میں بھٹک رہا ہے کہ اسے ایک بڑا تاب دار لعل ملتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ یہ تاریکی میں اس کی رہنمائی کے لیے ہے لیکن غیب سے ایک آواز سنائی دیتی ہے کہ یہ لعل دراصل چیونٹیوں کے ایک بڑے لشکر کے لیے ہے کہ اگر وہ راستہ بھول جائے تو اس کی طرف ان کی رہنمائی کرے اور یوں اسے خود اپنے بے وقعت ہونے کا حوصلہ شکن سبق ملتا ہے]۔

B M (مقالہ ۱۲)

خطاب آمد که آی شمع فروران

B L, L E

چو شد عاجر در ان تاریکی راه — بماندهم سپه حیران و هم شه
بدید آمد توی یکپاره یاقوت — که دروی خیره گردد مرد و مبهوت
هراران مور را میدید هر سوی — که می رفتند هر یک از دگر سوی
چنان پنداشت کان یاقوت پاره — برای عجز او گشت آشکاره
خطاب آمد که آین شمع فروران — برای خیل موران است سوران
که تا بو نور آن موران گمراه — شوند از جایگاه خویش آگاه
مگر نومید گشت آنجا سکندر — که چون شد بهر موری سنگ گوهر؟

جب وہ راہ گم کر بیٹھنے کے باعث مایوس ہو گیا اور بادشاہ اور لشکر دونوں سرگرداں پھرنے لگے
تو ایک بڑا سا لعل دکھائی دیا جسے دیکھ کر انسان خیرہ و مبہوت ہو جائے۔
اس نے دیکھا کہ ہر طرف سے ہزاروں چیونٹیوں کا ایک لشکر امڈا چلا آتا ہے۔
اس نے سوچا کہ اس کی درماندگی کے باعث لعل اسے تاریکی میں رستہ دکھانے کے لیے نظر آیا ہے۔
خطاب ہوا کہ یہ شمع فروزاں چیونٹیوں کے لشکر کو رستہ دکھانے کے لیے تھی۔
تا کہ جب چیونٹیاں بھٹک جائیں تو اس کی روشنی میں اپنے گھر کا راستہ تلاش کر سکیں۔
اب اسکندر یہ سوچ کر مایوس ہو گیا کہ کیسے ایک چیونٹی کے لیے پتھر ایک جوہر میں بدل گیا"

"آین" کے بجائے "آی" کی ایک اور مثال

درج ذیل حکایت، زندگی کی ناپائداری کے بارے میں ہے کہ کیسے یہاں سب کو ساری بہت عزیز ہوتے ہیں۔]

B M (مقالہ ۷)

که بیست آی بس عجب از گوسفندان

BL ,LE

چنین گفت آن امیر دردمندان　　　　که دیست این بس عجب از گوسفندان ۱۳

که می آرند ایشان را بخواری　　　　که تا برند سر شاهان براری

که بی عقلند ایشان می ندانند ۱۴　　　　ازان سوی قصاب چون دوانند ۱۵

ازان قصاب می باید عجب داشت　　　　که او هم علم داشت و هم طلب داشت ۱۶

چو میداند که او را نیز ناگاه　　　　بخواهندش بریدن سر درین راه

چگونه فارغ و ایمن نشسته　　　　نمی جنبد ولی ساکن نشسته ۱۷

دردمندوں کے سردار نے کہا بھیڑوں کے بارے میں یہ کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں

کہ وہ انھیں شرمناک طریقے سے ہانک کر لے جاتے ہیں تاکہ بے دردی سے ان کے سر کاٹ ڈالیں،

چوں کہ وہ عقل سے محروم و نا سمجھ ہیں اس لیے مذبح کی طرف دوڑتی ہوئی جاتی ہیں۔

لیکن ہمیں قصاب پر تعجب ضرور ہے جسے علم ہے اور اس کی جستجو بھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اچانک اس راستے پر اس کا سر بھی کاٹ ڈالیں گے

(میں کہتا ہوں، ہمیں تعجب ہونا چاہیے کہ) وہ کیسے فکر سے آزاد ہو کر ایک پرسکون دل کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے یوں جیسے وہ

(بالکل) محفوظ ہو۔

"کز" کے بجائے "کان"

[یہ حکایت اسکندر کے اس سفر کے بارے میں ہے جو اس نے آبِ حیواں، طلسمی طبل اور سرمے کی تلاش میں کیا تھا۔ درج ذیل اشعار

سرمے کے بارے میں ہیں۔]

LE (مقالہ ۱۴):

کسی کان سرمه میلی در کشیدی　　　　زماهی تا بساق عرش دیدی

BM., BL

کسی کز سرمه میلی در کشیدی ۱۸　　　　زماهی تا بساق عرش دیدی

[جس شخص نے یہ سرمہ ایک خاص طریقے سے لگایا وہ مچھلی سے لے کر ستونِ عرش کی ساقوں والے تک سب کچھ دیکھ سکے گا۔]

"پوسیدن" کے بجائے "توسیدن"

[اس حکایت میں یہ درج ہے کہ کس طرح حجر دوکو، جب وہ شیر خوار بچہ تھا، ایک بکری جبار کی تباہی کے بعد محفوظ رکھا جاتا ہے اور بعد

ازاں بہت طاقت عطا کی جاتی ہے لیکن اس کا غرور حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور وہ خدا کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔ پھر اس اور اس کے

دیوی مصوبوں کی ناپائیداری کا تذکرہ ہے۔]

350 IO (مقالہ ۱۴):

چه می توسی کان لم تغن بالا مس

B M., B L., I.O 559 L E

نگه از چرخ بر تر رو در آمور	که او هم سر نگون گردد شب و روز ۲۰
همه کار جهان از ذره تا شمس	چه می پرسی کان لم تغن بالامس ۲۱

(عربی قول کے لیے قرآن دیکھیے۔ 25 X، یہاں کان لم تغن ۔۔۔۔ پڑھنا چاہیے۔)

تو آسمان سے بلند تر نہیں ہے اس سے سبق سیکھ کر یہ بھی دن رات (مسلسل) سر کے بل اوندھا ہے ۲۳

[ذرہ سے لے کر آفتاب تک دنیا کے تمام معاملات۔ تو ان کے بارے میں پوچھتا کیوں ہے؟ دیکھتا نہیں کہ ایسا ہی ہے جیسے کبھی وہ تغیر نہ تھی]

آن کے بجائے از

(ایسا کثر تو نہیں ہوتا تاہم کبھی کبھی "د" سے غلطت کے باعث ایسا ہو جاتا ہے اور حرف "ز" اکثر "ن" سے بدل جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے)

[موت کی قطعیت۔ حتی کہ سمندر کی خشکی زمین پر رہنے والوں کی خاک سے بنی ہے]

B M., B ـ (مقالہ ۱۲)

ندیدند ای عجب آن یک طلب گار

L E

سلیمان کوره می خواست روزی	که تا آبی خورد بی هیچ سوری ۲۴
که آن کوره نبود، باشد آنگاه	ر خاک مرده افتاده در راه ۲۵
چنین خاکی طلب کردند بسیار	ندیدند ای عجب از یک ۲۶ طلبگار

I O مخطوطہ

۵۵۹. چندین طلبگار

۵۳۰. چندان طلبگار

سلیمان نے ایک دن ایک کوزہ طلب کیا تا کہ وہ بغیر اپنا دل دکھائے اس میں سے کچھ پانی پی سکے۔

ایک ایسا کوزہ جو راہ میں گر کر مر جانے والوں کی خاک سے بنا ہو۔

انھوں نے بہت تلاش کیا مگر ایسی خاک کا کوزہ ڈھونڈ نہ پائے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ کسی متلاشی سے اسے حاصل نہ کر سکے۔

از کے بجائے آن

[ایک قریب المرگ شیخ کی انکساری، جو اپنے مذہب کے بارے میں بہت متشکر نظر آتا ہے اور اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اسے (مرنے کے بعد) مسلمانوں کے درمیان مدفون کیا جائے۔]

I O 350 (مقالہ ۲۷)

رسید از شیخ را عمر ش به هشتاد

B.M., B.L., L.E.

چون بود آن شیخ سالی شصت و هفتاد — ببعد آن مگر در نزع افتاد
کسی[37] گفت ای بدان عالم قدم زن — کجا دست[38] کنم جائی رقم زن
چنین گفت او که من شوریده ایمان — نخواهم در بر جمعی مسلمان
چو من نور مسلمانی[39] ندارم — بگورستان دین داران چه کارم
نخواهم[40] با جهودان نیز همبر — که بیزار ست از ایشان پیمبر[41]
میان این دو گورستان رمیم — بدست آور که من نه زان نه زیم[42]

ایک بزرگ جب ساٹھ یا ستر سال کی عمر کو پہنچ گئے، اور پھر موت کی گھڑی قریب آ گئی۔
کسی شخص نے ان سے کہا کہ اب آپ دوسری دنیا کو روانہ ہونے والے ہیں، لکھ دیجیے کہ میں آپ کو کس جگہ دفن کروں؟
انھوں نے جواب دیا، میں ایمان کی راہ سے اتنا بھٹک چکا ہوں کہ دوسرے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ دفن نہیں ہونا چاہتا۔
چوں کہ میں نورِ ایمان سے محروم ہوں تو میرا اہلِ ایمان کے قبرستان میں کیا گزر؟
لیکن میں یہودیوں کا ساتھی بھی نہیں بننا چاہتا کیوں کہ پیغمبر (ﷺ) انھیں ناپسند کرتے ہیں۔
میرے لیے ان دونوں کے قبرستانوں سے الگ کوئی زمین لو کیوں کہ میں نہ اُن میں سے ہوں نہ اِن میں سے۔"

از کیمیای این

[اس حکایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صبح سویرے کی پاکیزہ فضا میں سانس لینے سے آہو کا کچھ خون مشک بن جاتا ہے۔ اس سے تصوف کا ایک نکتہ نکلا ہے]

B.M (مقالہ ۴۳)

که جان را کیمیا نیست از الٰهی

B.M., L.E.

که داند آن چنان دم در جهانی — که خون رو مشک[43] گردد در زمانی
چو خونی مشک گردد از دمِ پاک — بود ممکن که روحانی[44] شود خاک
ولی[45] چون نور حق در جان در آید — تنت حالی برنگ جان بر آید
چه گویم بیش ازین امکان ندارد — که عالم بیش ازین فرمان ندارد
اگر تو کیمیا سازی چنین ساز — ولی این کیمیا در راه او[46] باز
چو نیست این کیمیا در عرش و کرسی — ز جان خود طلب دیگر چه پرسی
نسازد این کیمیا گر مرد راهی — که جان را کیمیا نیست این الٰهی

کون دنیا بھر میں ایسے سانس سے واقف ہے جو ایک پل میں خون کو مشک میں تبدیل کر دے؟
جیسے ایک پاکیزہ سانس کے ذریعے خون مشک بن جاتا ہے ممکن ہے کہ خاک بھی یونہی روح میں بدل جائے۔

لیکن جب نورِ الٰہی روح میں داخل ہوتا ہے تیرا بدن نورانی روح کا رنگ اختیار کر لیتا ہے

میں کیا کہوں؟ اب مزید کچھ کہنے کی تاب نہیں کیوں کہ میری روح کو اس سے آگے بیان کرنے کا علم نہیں۔

اگر تم کھیلنا چاہتے ہو تو یوں کھیلو لیکن اس کھیل کو "اُس" کے حوالے کر دو۔

کیوں کہ یہ کھیل "عرش" اور "کرسی" میں نہیں ہے اسے خود اپنی روح میں ڈھونڈو۔ (اس سے زیادہ) اور کیا پوچھتے ہو"

اگر تم (اس) راہ کے مرد ہو تو نکل کھیلو کیوں کہ روح کے لیے یہی قربانی کھیلی ہے۔

نہ کے بجائے بہ

ان دونوں یعنی تردیدی اور تائیدی کلمات کا غلط استعمال خاصی مشکل پیدا کر دیتا ہے خاص طور پر جب اقتباس اور اس کا سیاق وسباق دونوں گنجلک ہوں۔ اس الجھن کی ایک مثال درج ذیل اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے

[خلیفہ ہارون کو، بہلول سے ملاقات کے دوران، اپنے فرائض سے غفلت اور غلاموں کے استحصال پر، اس کی شدید مذمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تب ہارون اس سے نصیحت کا طالب ہوتا ہے] ۲۷

B.M (مقالہ ۱۱)

وگرنہ من نگفتم بہ تو دانی

550 I.O اور .L.E میں نگفتہ کے بجائے غلط طرح سے پڑھا جاتا ہے

B.L

نصیحت خواست از بهلول هارون — بدون گفت آن زمان بهلول مجنون

که ای استاده بر دنیا چنین راست — نشان اهل دوزخ بر تو پیداست

ز رویت محو گردان آن نشانی — وگرنہ من بگفتم بہ تو دانی ۲۷

پھر ہارون بہلول سے نصیحت کا طالب ہوا تو اس دیوانے بہلول نے اس سے کہا:

کہ تو دنیا میں اس قدر خوبی اور عمدگی سے پیوست ہے اہلِ دوزخ کی نشانی تجھ پر ہویدا ہے

اپنے چہرے سے یہ نشان مٹا ڈال۔ بے شک تجھ سے میرا یہی کہنا ہے لیکن تو خوب جانتا ہے۔"

میرا خیال ہے ہم خوب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں "نگفتم" کے بجائے "بگفتم" درست ہے تاہم اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے کیوں کہ ہم .B.M کے نسخے کا مطلب یوں بھی سمجھ سکتے ہیں۔

"اور بے شک (تم ایسا سمجھ سکتے ہو کہ) میں نے کچھ نہیں کہا کیوں کہ تم بہتر جانتے ہو۔"

لیکن (اس بات کے) سیاق وسباق اور بہلول کے لہجے کو مدِنظر رکھتے ہوئے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کا امکان بہت کم ہے ۲۸

می کے بجائے ھمی کا استعمال اور اس کے برعکس

یہ دونوں اکثر غلطی سے ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں لیکن ان کی تصحیح کے بعد یہ واضح ہو جانا چاہیے کیوں کہ اس وقت میرے سامنے کوئی مثال نہیں ہے یہ تصحیح آگے دیے گئے اشعار سے درست ثابت ہو جاتی ہے کیوں کہ اس کے بغیر ان میں تسلسل کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے)

[درج ذیل الفاظ، جو مقالے کے ابتدائی حصے سے لیے گئے ہیں، ہارون اور بہلول کے بارے میں ہیں اور بندگی کی مختصر مدت سے متعلق عطار کے اخلاقی نظریات کا اظہار کرتے ہیں۔]

L E (مقالہ ۱۲)

نمی ماند نمی مانی تو بر پائی

B M, B ۔

نمی ماند کجا مانی تو بر پائی

صحیح

چو سنگی صد هزاران سال بر جای		همی ماند نمی مانی تو بر پائی ؟

چه خواهی کرد در جائی درنگی		که آنجا بیش ماند از تو سنگی

ان اشعار کا مفہوم بہتر طور پر اس وقت بھی واضح ہو سکتا ہے جب ہم فرض کر لیں کہ دوسرا شعر پہلے شعر میں بیان کردہ مفہوم کی صراحت کرتا ہے۔

'چوں کہ ایک چٹان بھی کئی سو ہزار سال تک قائم رہتی ہے جب کہ تمھارے ساتھ ایسا نہیں۔

تم ایسی جگہ پر کیوں طویل قیام کرنا چاہتے ہو جہاں ایک چٹان تم سے زیادہ عرصہ قائم رہتی ہے؟'

نه اور به

(عکسی شکلوں کا فرق)

جب حرف نفی ''نہ'' اور حرف تاکید ''بہ'' اکٹھے استعمال ہوتے ہیں تو اکثر غلط ترتیب سے لکھ دیے جاتے ہیں۔ ''نہ'' کو ''بہ'' سے پہلے آنا چاہیے لیکن عموماً اس کے برعکس ہوتا ہے۔

[ابراہیم کے رد کئے جانے کے باعث فرشتوں کو اس کی بندگی و اطاعت پر شبہ ہوتا ہے لیکن آخر کار انھیں یقین آ جاتا ہے۔]

B L, B M (مقالہ ۱۹)

بنگذارد خلالی چون خلیلست

L E, I.O 559

ملایک چشم بر کارش گشادند[۱]		ز کارش در گمانی او فتادند

که او مشغول چندین گوسفند[۲] است		خدا میگوید او پاك و بلند است

که او مستغرق رب جلیلست		نه بگذارد[۳] خلالی چون خلیلست

ی (تنکیر) کے مقابلے اضافت

''ی'' اور اضافت کو عموماً ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے کیوں کہ کاتب کو اکثر غلط کروایا جاتا ہے اور ان دونوں کی آواز بھی تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ذیل کی مثال میں اضافت کا ثبوت ملتا ہے۔

[معروف صوفی حلاج کی اپنے بیٹے کو نصیحت]

بعیبت می رند برهم جهانی

LE

بعیبت می کشد برهم جهانی

BL

بعیبت می کشد هر دم جهانی

BM

شکم چون سیر گردد یک زمانت[۹۹] — بعیبت گرسنه گردد زبانت[۱۰۰]

چو تیغی تیر بکشاید زبانی — بعیبت می کند درهم جهانی[۱۰۱]

بسی گرچه فرو گوئی بگوشش — نیاری کرد یک ساعت خموشش

جب ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا پیٹ بھر جاتا ہے تو تمہاری زبان غیبت کی بھوکی ہو جاتی ہے۔

جب زبان غیبت میں اپنی تیز تلوار کھینچتی ہے تو پوری دنیا کو تباہ کر دیتی ہے۔

گرچہ تم اس کے کان میں بہت کچھ پھونک سکتے ہو، لیکن تم اسے ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں کر سکتے۔

اگر BL سے درست ہے تو میرے خیال کے مطابق "بعیبت" کا لفظ پہلے کے بجائے دوسرے مصرعے سے جڑتا ہے۔ یوں اس شعر کا مطلب یہ نکلتا ہے۔

جب زبان اپنی تیز تلوار کھینچتی ہے تو ہر لمحہ پوری دنیا کو غیبت کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔[۱۰۲]

لیکن یہ مطلب تسلی بخش کم ہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ زبان غیبت کیے بغیر بھی تلوار کی طرح تیز ہو سکتی ہے۔

آنجا کے بجائے اینجا

نقطوں اور مد کے حذف ہونے کے باعث بعض اوقات، سیاق و سباق پر غور کیے بغیر یہ طے کرنا دشوار ہوتا ہے کہ دونوں میں کون سا لفظ یہاں درست ہے۔

[معروف صوفی ملاح کی اپنے بیٹے کو نصیحت]

BL (مقالہ ۱۹)

عجب نبود گر اینجا شیر گردد (ایک یا دو نقطے حذف ہو گئے ہیں)

یہاں "آنجا" "شاید" "اینجا" کی جگہ استعمال ہوا ہے لیکن اگر ہم فرض کریں کہ ایک "مد" حذف ہو گئی ہے تو یہ "آنجا" بھی ہو سکتا ہے۔

LO 559

عجب نیست اینجا شیر گردد

LE

عجب نیست کاینجا شیر گردد

BM

ترا تا نفس می ماند حیالی   بود در مولشش دائم کمالی ۳ھ
اگر نفست ۵ھ رمانی سیر گردد   عجب نبود که اینجا شیر گردد ۱ھ

جب تک تمھارا نفس آسیب کی طرح تمھارے سامنے رہتا ہے کمال ہمیشہ اسے خود سے دور کرے سے ہی مل سکتا ہے۔
اگر تمھارا نفس ایک پل کے لیے سیر ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں کہ وہ یہاں شیر بن جائے۔

تیرہ کے بجائے تیر کا استعمال

حرف "ت" کے دو نقطے حذف ہونے اور "ہ" کے "ر" سے جڑ جانے کی صورت میں "تیرہ" "تیز" بن سکتا ہے۔

[اس حکایت میں ایک دیندار کے مشتاق صوفی کو گریہ وزاری پر ملامت کی جاتی ہے یہاں تک کہ بصارت کھو دینے کے بعد وہ بصیرت حاصل کر لیتا ہے]

B.L (مقالہ ۳)

دگر ره تیر شد دو چشم گریانش

B.M., I.O. 559, 350, L.E

شعیب از شوق حق ده سال بگریست   ازاں پس چشم پوشیده همی زیست
خدا بیناش کرد از بعد آن باز   که شد ۶ھ ده سال دیگر خون فشان باز
دگر ره تیره شد دو چشم گریانش   دگر ره چشم روری کرد یزدانش

[شعیب نے عشق خداوندی میں دس سال تک گریہ وزاری کی، اس کے بعد وہ اندھا ہو گیا۔
پھر خدا نے اس کی بینائی لوٹا دی لیکن وہ مزید دس سال خون کے آنسو بہاتا رہا۔
یک بار پھر اس کی گریہ کناں آنکھیں تاریک ہو گئیں اور پھر انھیں خدا نے بصارت عطا کر دی۔

"حمد" کی جگہ "جملہ"

یہ بھی ان متبادلات کی ذیل میں آتے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے، جیسے اوپر کی مثال میں تیز اور تیرہ۔ لیکن جب جملہ کی "ل" پیوست ہو جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے تو یہ اس ذیل میں نہیں آتی۔

[مناجات کا ایک حصہ]

B.L (تعارف)

مرا توفیق ده تا جمله خوانم

I.O. 559

مرا توفیق ده تا حمد خوانم   صفات ذات تو بر لفظ رانم
ردر گلهب همین ۸ھ دارم امانی   مرا یارب بدین مقصد رسانی
سخن انجام شد آغاز توحید   کنم از حمد را تحمید و تمجید ۹ھ

"مجھے توفیق دے کہ میں تیری ثنا کر سکوں، تیری ذات کی صفات کو الفاظ میں بیان کر سکوں۔

مجھے تیرے دربار سے امید ہے کہ اے رب، تو مجھے اس مقصد میں کامیاب ہونے کا اہل بنا دے گا۔
آغاز ہی میں توحید کا اعلان سخن کا انجام اور قیامت ہے۔ میں یونہی بآواز بلند خدا کی حمد و ثنا گاتا رہوں گا۔

مکر کی جگہ فکر

[اس مقالے میں کسی شخص کا بیٹا اس سے درخواست کرتا ہے کہ اسے ایک حکیم کے گھر لے جائے جو علم الادویہ اور علم نجوم میں مہارت کے باعث مشہور ہے لیکن اس قدر تنگ دل ہے کہ کسی کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ وہ لڑکا بہر حال چالاکی سے اس حکیم کا قرب حاصل کرنے اور اس کے تمام رازوں سے واقف ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔]

E ل(مقالہ ۲)

پسر کردش از فکر خویش آگاہ

B M ,B ل

پسر گفته که ۱۰ آنجا بر سهام
که من خود حیله ۱۱ این کار دانم

پسر شد با پدر القصه در راه ۱۲
پسر کردش ز مکر خویش آگاه

که پیش این حکیم نه دوان شو ۱۳
ز دل کینه برون کن مهربان شو

بدو گو کودکی دارم کرولال
ندارم نعمتی هستم مقل حال

برای آخرت بپذیرش از من
چنین بار گران بر گیرش از من

که تا در خدمت تو روزگاری
کند چندانکه فرمایش کاری ۱۴

بیٹے نے کہا ''مجھے اداکاری سے وہاں لے جاؤ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کام کیسے کرنا ہے۔
مختصر یہ کہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ اس راہ پر چل پڑا۔ راستے میں بیٹے نے باپ کو اپنی چال سے آگاہ کیا۔
اس نے کہا '' اس ہمدرد حکیم کے سامنے حاضر ہو، اپنے دل کو بغض سے خالی کر کے اس سے مہربانی سے پیش آ۔
اس سے کہہ کہ میرا ایک بیٹا ہے جو گونگا اور بہرا ہے میرے پاس مال و دولت نہیں اور میں مفلس و قلاش ہوں۔
تو آخرت میں جزا پانے کے لیے اسے مجھ سے لے لے، مجھے اس بوجھ سے نجات دلا دے۔
تا کہ وہ اس دوران تیری خدمت بجا لائے اور جس کام کا تو اسے حکم دے انجام دے۔''

گوید کی جگہ گوید

[اس کی ایک مثال یوسف اور اس کے بھائیوں کی کہانی میں ملتی ہے]

E L(مقالہ ۳)

چه گونه گوید او از بی قراری

B M. ,B L

بدو گفتا که چون داری پدر را ۱۵
که میگویند گم کرده ۱۶ پسر را

چنین گفت او که دلیما نماند ست
چو یوسف نیست او تنها نماند ست

جهانی آتشش در دل جان نشسته	میان کلبهٔ احزان نشسته ۱۸ے
چو از یوسف فرا اندیش گیرد	دران ۱۹ے ساعت مرا درپیش گیرد
چه گویم من که آن ساعت براری	چه گوید هو زمان از بیقراری ۲۰ے

تب اس نے کہا کہ تم باپ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس باپ کے بارے میں جسے لوگ 'محروم پیر' کہتے ہیں۔
کسی نے یوں جواب دیا: وہ ابھی تک سانس لیتا ہے جب سے یوسف یہاں نہیں ہے وہ تنہا پڑا رہتا ہے۔
اس کے دل میں ایک آگ جل رہی ہے اور وہ غموں کی کٹیا میں بیٹھا ہے۔
جب اس کا خیال یوسف سے ملتا ہے تب وہ مجھے اپنے قریب آنے دیتا ہے۔
میں کیسے بتاؤں کہ اس لمحے وہ کس طرح گریہ زاری کرتے ہوئے اپنے ایک ایک لمحے کے اضطراب کو بیان کرتا ہے۔"

چنان کی جگہ بدان

غالباً یہ قدرے قیاسی ہے اور B M نسخے کے قدیم طرز تحریر پر منحصر ہے جس میں بعض مقامات پر "دال" پر نقطہ لگا دیا جاتا ہے تاہم اس قیاس کو B.L اور L E کے مسودوں سے تقویت ملتی ہے۔ 'چنین' یہاں اتنا موزوں نہیں جتنا 'چنان'۔ تاہم 'بدان' سے بہتر ہے جس کا یہاں کوئی مطلب نہیں نکلتا۔

[یہ حکایت اسکندر اور اس کی آب حیات، جادوئی طبل اور طلسمی سرے کے صندوق کی تلاش کے بارے میں ہے، جس کے متعلق اس نے پڑھ رکھا تھا۔ اسے ارض ظلمات میں اپنے سفر کے دوران ایک تابدار یاقوت ملتا ہے۔]

B M (مقالہ ۱۴)

بدان پنداشت کان یاقوت پوره

B L, L E

پدید آمد قوی یکپاره یاقوت	که در وی خیره گردد مرد و مبهوت
چنین پنداشت کان یاقوت پوره ۱ے	برای عجز او گشت آشکارا

تصحیح: چنان

ایک بڑا یاقوت دکھائی دیا جو انسان کو مبہوت اور خیرہ کر دینے والا تھا۔
اس نے سوچا کہ اس کی درماندگی کے باعث یہ یاقوت اسے تاریکی میں رستہ دکھانے کے لیے ملا ہے۔

چو کی جگہ چه

[دنیا کی ناپائیداری اور ہر شے کے برباد ہو جانے کے بارے میں]

B M (مقالہ ۱۷)

چه میداند که او را دیر ماگاه

L E

که میداند که او را دیر ماگاه

BL

ارباں قصاب می باید عجب داشت　　　که او هم علم داشت و هم طلب داشت ۲؎

چو میداند که او را نیز ناگاه　　　بخواهندش بریدن سر درین راه

چگونه فارغ و ایمن نشسته　　　نمی خندد ولی ساکن نشسته ۳؎

لیکن ہمیں قصاب پر تعجب ضرور ہے جسے علم ہے اور اس کی جستجو بھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اچانک اس راستے پر اس کا سر بھی کاٹ ڈالیں گے

(میں کہتا ہوں، ہمیں تعجب ہونا چاہیے کہ) وہ کیسے فکر سے آزاد ہو کر، ایک پرسکون دل کے ساتھ، زندگی گزر رہا ہے یوں جیسے وہ

(بالکل) محفوظ ہو۔

رماں کی جگہ زناں

کثر "میم" کی علامت قدرے مبہم ہوتی ہے اور اس کا سر اور حروف کے جوڑے سے ایک نقطے کی شکل اختیار کر لیتا ہے یوں کاتب سہواً

رماں "کو" زناں" لکھ سکتا ہے۔

O ا (بیان ۱۶)

چو دریا را ں رناں برخاست جوشی

BM ,BL

بر آمد از پس پرده خروشی ۴؎　　　چو دریا آں رماں برخاست جوشی ۵؎

نقطے (حذف شدہ یا غلط جگہ لگائے گئے)

یہ معاملہ اکثر پیش آتا ہے اور صرف تجربہ، متن اور اس کے سیاق و سباق کا گہرا مطالعہ نیز دیگر نسخوں کا مطالعہ ہی درست خواندگی میں مدد دے سکتا ہے۔ ان متون کے تحت وہ صورتیں دریافت ہو سکتی ہیں جہاں ایک سطر میں لکھے جانے والے لفظ کے نیچے ایک نقطے کی ضرورت ہو اور اس سے بالکل نچلی سطر میں آنے والے لفظ کے اوپر نقطہ آتا ہو۔ اس صورت میں گویا ایک ہی نقطہ کا کر دونوں لفظوں کی ضرورت پوری کر دی جاتی ہے۔

نقطوں کو حذف کرنے یا غلط جگہ پر لگانے کی اس اکثر رونما ہونے والی غلطی کے علاوہ ہمیں ث، پ اور چ کے تین تین نقطوں کو ملا کر ایک نقطہ لگانے اور گ کو ک لکھنے کی عادت سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔

'پ' کی جگہ 'ب' اور 'چ' کی جگہ 'ج'

BL (مقالہ ۳)

چوں ناگاهش نظر بر شاه افتاد

طعامی ساخت شہرا کرده بر رهو

دل ما زین سگ بی دین سردار

BM

ے

پرداز

اور E ۔ایس

شنیدم کارد شیرویل زنی داشت	که آن زن شاهرا چون دشمنی داشت
مگر یک روز آن زن از سر قهر	طعامی ساخت شه را کرده پر زهر ۱۲ے
چو ناگاهش ۱۲ے نظر بر شاه افتاد	ز دستش کاسه در ۸ے در گاه افتاد
بلرزید و برفت از رنگ رویش	از آن زن در گمان افتاد شویش
طعام او بمرغی ۹ے داد آنگاه	بمرد آن مرغ و حیران ماند آن شاه ۱۰ے
بموبد داد زن را شاه عالی ۱۱ے	که قالب کن ز قلبش زود خالی
بریزش خون و در خاکش نهدار	دل ما ۱۲ے زین سگ بی دین بپرداز

"میں نے سنا ہے کہ بادشاہ اردشیر کی ایک بیوی تھی جو اس کی دشمن تھی۔
تو ایک روز بیوی نے غصے میں اس کے لیے زہر آلود کھانا لے کر آئی۔
جب اچانک اس کی نظر شاہ پر پڑی تو اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر دہلیز پر گر پڑا۔
وہ لرز اٹھی اور اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے شوہر کو اس پر شبہ ہوا۔
بادشاہ نے وہ کھانا ایک پرندے کو کھلا دیا۔ پرندہ مر گیا اور بادشاہ حیران رہ گیا۔
اس نے فوراً اس عورت کو پادری (موبد) کے حوالے کیا اور اسے حکم دیا کہ 'اس کے قالب کو جلد روح سے خالی کر دے۔
اس کا خون بہا اور اسے مٹی میں دفن کر دے۔ میرے دل کو اس بے ضمیر بد بخت سے آزاد کر دے۔"

"ڈ" کی جگہ "ز"

یہی غلطی اکثر نہیں ہوتی لیکن میں نے 'زندہ' کی جگہ 'ڈندہ' اور 'زیان' کی جگہ 'ڈیان' کا استعمال دیکھا ہے۔

"گ" کی جگہ "ک"

سب یا تقریباً سب نسخوں میں "گ" کی جگہ "ک" ملتا ہے۔ "گ" کو بہت کم "گ" کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں "گل" کے بجائے "کل"، "گرہن" کے بجائے "کرہن" اور "گمان" کے بجائے "کمان" وغیرہ ملتے ہیں۔ ۱۳ے

نقطوں کا حذف ہونا اور الفاظ کا باہم ملا کر لکھا جانا

الفاظ کو ایک دوسرے سے ملا کر لکھنے کی مشق کے باعث انھیں صحیح سمجھ پانا مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب کہ نسخوں میں 'پ' اور 'ب'، 'ژ' اور 'ز'، 'چ' اور 'ج' اور 'ک' اور 'گ' میں تمیز کرنا دشوار ہو۔

مثال کے طور پر ہم بیان ۲۰ میں یوسف اور زلیخا کی اس حکایت کو لیتے ہیں۔

(مقالہ ۱۹)B M. , B L. , I.O. , 559, 350, L E

در آمد جبرئیل و گفت آنگاه	که او را بر نمی گیریم از راه

که او آنرا که ما را دوست دارد　　　　جهانی دوستی در پوست دارد

چو او را دوستی اوست پیوست　　　　مرا بهر تو با او دوستی هست

که گفتت مرگ گل در بوستان خواه　　　　هلاک دوستان دوستان خواه

که گر عمری بجان گردانمش من　　　　برای تو جوان گردانمش من

لیکن اغلب ترین یہی ہے کہ درست لفظ "جوان" ہے کیوں کہ پہلے مصرعے میں یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ جوں رہ گی جائے گی بلکہ مرب ند ور کھے جانے کا ذکر ہے علاوہ ازیں اس حکایت میں اسے جوان فرض نہیں کیا گیا ہے۔

جبریل ظاہر ہوا اور اس نے کہا کہ ہم اسے راہ سے نہیں ہٹائیں گے۔

کیوں کہ اس کے دل میں اس کے لیے محبت کی ایک دنیا آباد ہے جو "ہم" سے محبت کرتا ہے۔

چوں کہ وہ ہمیشہ تجھ سے محبت کرتی ہے میرے دل میں تیرے لیے اس کی محبت ہے۔

کس نے تجھ سے کہا ہے کہ باغ میں پھولوں کے مرنے کی تمنا کر، میرے دوستوں کے دوستوں کی تباہی کر۔

کیوں کہ اگر میں اسے عمر بھر زندہ رکھتا ہوں تو میں تیرے لیے ایسا کرتا ہوں۔

نقطوں کا آپس میں مل جانا یا ملا دینا

عام طور پر متصل حروف کے نقطوں کو ملا دینے کی عمومی عادت خاصی مشکلات پیدا کرتی ہے اور باریک بین مشاہدے کی متقاضی ہے خاص طور پر جب تحریر تعلیق حروف میں ہو جیسا کہ سنہ ۱۴۱۰ء کے BM نسخی مسودے میں۔ اس مشکل میں اور اضافہ ہو جاتا ہے جب کاتب لفظ کے آخری میں آنے والی "ی" کے نیچے دو نقطے بھی لگا دیتا ہے مثلاً "می" کی جگہ "یبی"۔ (اکثر نسخوں میں "یبی") اسی طرح کی ایک اور مثال اس نسخے میں "تنہا" کے بجائے "نشہا" ہے۔

زائد نقطے

عموماً خالی جگہ کو بھرنے یا تحریر کو زیادہ ہموار بنانے کے لیے بھی نقطے لگا دیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمیں دولت مند ابراہیم اور فرشتوں کی اس کے بارے میں بدگمانی سے متعلق قصے میں ملتی ہے۔

B.L (مقالہ ۱۹)

خطاب آمد از حق شوی ملایک

B.M., I.O., 559, L.E

خطاب آمد رحق سوی ملایک　　　　که هان چون بود ابراهیم مالک

که چون جبریل نام ما ندا کرد　　　　بنام ملهمه نقدی فدا کرد

فرشتوں کو خدا کی طرف سے خطاب کیا گیا ہاں تو، ابراہیم جو دولت مند اور طاقت ور ہے تمہاری نگاہ میں کیسا ہے؟

کہ جب جبرائیل نے میرا نام پکارا تو اس نے اپنی تمام پونجی میرے نام پر فدا کر دی۔

حروف کا خلط ملط ہونا

یہ اکثر ہوتا ہے خاص طور پر تعلیق تحریر میں، کہ "ہ" کو "و" یا خط نسخ میں "میم" کی ابتدائی صورت سمجھ لیا جاتا ہے۔ "ں" کو "واو"

بھی سمجھا جا سکتا ہے اور "رے" بھی۔ مثلاً

B M (مقالہ ۱۵) میں دو اشعار ایسے ہیں جن میں یہ پہچاننا مشکل ہے کہ یہاں "د" مراد ہے یا "ذ"

[یہ حکایت سلطان محمود اور ایک دہقانی بچے کے بارے میں ہے جس سے سلطان پورے تھان کی قیمت پوچھتا ہے۔]

B M (مقالہ ۱۵)

ذہ

جوابش داد کار ۹۱ کای شہنشاہ   ترا کرباس ذو ۹۰ گز بس دریں رہ

دہ

چو ریں جملہ ترا ذو ۱۱ گز پسند ست   چرا پرسی ز دیگر تا بچند ست

(چوں کہ یہ مقدار کفن کے لیے کافی تصور کی جاتی ہے اس لیے میں "دو" کو بہتر سمجھتا ہوں لیکن دوسرے شعر میں واضح طور پر "دہ" لکھا گیا ہے اور B.L اور L.E دونوں نسخوں میں "دہ" ہی ہے۔)

لڑکے نے اسے جواب دیا کہ اے شہنشاہ! اس راہ میں دو گز کپڑا تیرے لیے کافی ہے

جب اس میں سے صرف دو گز کپڑا ہی تیرے لیے کافی ہے تو پھر باقی سب کی قیمت کیوں دریافت کرتا ہے؟[۴۴]

حروف اور کلمات کا حذف ہونا

اگر بعد میں آنے والا حرف یا کلمہ پہلے آنے والے حرف یا کلمے سے ملتا جلتا ہو تو ایک حرف یا کلمہ حذف ہو سکتا ہے

کسی اور عنوان کے تحت دیا گیا درج ذیل مصرع مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

B.M (مقالہ ۱۶)

درویت محو کردن آن نشانی

B L ,L E

درویت محو کردان آن نشانی

"اس نشان کو اپنے چہرے سے مٹا دو"

الفاظ کی تکرار

ہو سکتا ہے کہ کسی مصرع کا پہلا لفظ، کم توجہی کے باعث، غلطی سے اگلے مصرع کے پہلے لفظ کے طور پر دہرا دیا جائے۔

اس کی ایک مثال خلیف ۴۳ کی کہانی میں ملتی ہے

[مامون اور اس کا ایسا غلام جس کی وفاداری کا وہ امتحان لیتا ہے اور اسے مخلص اور خوددار پاتا ہے]۔

B M. ,L E (مقالہ ۱۸)

چساں آرید در وی رھو آنگاہ

L E

چساں باید کہ کوی و شہر و بازار ۹۴   ہمہ بصرہ بیارائی بیکبار ۹۵

جلاب آریدد و برهو ۹۶ آنگاه　　　　برو ریریدو بو گیریدش ارراه ۹۷

L.E میں چاں کے بجائے "جلاب" کا استعمال یقیناً درست ہے کیوں کہ دوسرے مصرع میں "چاں" سے کچھ معنی نہیں نکلتے۔ پورے مصرعے کا ترجمہ ہو گا "اور جا کر شہر کی گلیاں اور بازار سے پھر عرق گلاب میں ریر ڈال کر لاؤ۔ اس پر چھڑک دو اور اسے راستے سے ہٹا دو"

اعراب

علامت سکون

عام طور پر علامت سکون تحریر میں نہیں آتی لیکن کچھ قلمی نسخوں میں لگائی جاتی ہے، جیسے ۱۲۱۰ کا B.M کا مسودہ، جس میں تحریر اس قدر باریک ہے کہ علامت سکون با آسانی اگلے حرف کا نقطہ بھی سمجھی جا سکتی ہے۔

ہمزہ

اس مضمون کے تعارفی حصے میں کہا جا چکا ہے کہ ہمزہ حروف علت سے پہلے آنے والی ساکن "ہ" کے ساتھ آ سکتا ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہاں "ہ" کے بجائے حرف علت سے پہلے آنے والے حرف کی آواز سنائی دے گی۔ اس لیے کہ ساکن "ہ" کبھی بولی نہیں جاتی۔ بہ ہر وضعی ضرورت کے تحت اس سے پہلے آنے والے حرف علت کی آواز کو کھینچا جا سکتا ہے۔

یہاں ہمزہ کا استعمال نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ ابہام پیدا کرنے کا باعث بھی ہے کیوں کہ اس طرح سے یہ ایک اہم علامت کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے جیسا کہ درج ذیل نسخوں میں لیا گیا ہے

350, 559, I.O اور L.E (مقالہ ۱۷)

ندیده چارهٔ بیچاره گشتم

یہاں ہمزہ کو 'یائے تنکیر' کے طور پر لیا گیا ہے۔

B.M

سراپای جهان صد پاره ۹۸ گشتم　　　　ندیدم چارهٔ و ۹۹ بیچاره گشتم

L.E میں بھی یہی درج ہے مگر ہمزہ نہیں ہے۔

اینجا اور آنجا

آن اور این

ان دونوں لفظوں کے بارے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ کاتب اکثر لاپروائی کے باعث ایک کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر مثنوی روی کے یہ اشعار دیکھیے جو "بقیہ قصہ پیر چنگی و بیان گلش" کے عنوان کے تحت آئے ہیں۔ (دفتر اول)

آن زمین و آسمان بس فراخ　　　　کرد از تنگی دلم را شاخ شاخ

وین جهانی کاندرین خوابم نمود　　　　در ۱۰۰ گشایش پر و بالم را کشود

آن جهان و راهش ار پیدا شدی ۱۰۱　　　　کم کسی یک لحظه اینجا بدی ۱۰۲

تیسرے شعر میں "آن" کے بجائے "این" ہونا چاہیے اور "بحر العلوم" کے متن اور تبصرہ میں یہی آیا ہے۔ اسی طرح "بجا" سے بجائے

اصول سے بھی انحراف ہے۔

دلی بکشاد شیخ و گفت ای شاہ		گرین شاهی نباید سگب ای شاه

:B M ,L E

دلی بکشاد ۱۹ یا شیخ و گفت آنگاه		گرین شاهی نباید سگب ای شاه

تب شیخ نے زبان کھولی اور کہا کہ اے شاہ! کیا تو اس اقتدار پر شرم سار نہیں ہے؟"

امالہ

یہ اصول ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ معروف آواز مجہول آواز کی ہم قافیہ نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ اگر کسی عربی لفظ کا قافیہ حرف علت "ا" ہے جو امالہ کے باعث تبدیل ہو جاتا ہے تو نتیجتاً "ی" کی بجائے "ے" کی آواز برآمد ہوگی۔

[کعب کی بیٹی اور اس کے غلام کا قصہ]

(مقالہ: ١٣)B L , B M , I O , 569 350

ز عدلش میش و گرگ اندر حوالی		بهم گرگ آشتی کردند حالی

یہاں عربی لفظ "حولہ" امالہ کے استعمال سے "حوالے" ہو جاتا ہے جو "حالے" کا ہم قافیہ ہے۔

معروف و مجہول

جیسا کہ امالہ کے ضمن میں مذکور ہے کہ معروف آواز مجہول آواز کی ہم قافیہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے "ے" اور "ی" کے متعلق اس اصول میں کچھ استثنا بھی دیکھا ہے تاہم ایسا بہت کم ہوا ہے۔ جہاں تک "و" اور "او" کا تعلق ہے یہ مثالیں زیادہ ہیں لیکن حد سے زیادہ نہیں۔
درج بالا اصول انتہائی اہم ہے اور اس کی بھرپور پیروی سے غلطیوں کی شناخت ہو سکتی ہے، ابہام دور کیا جا سکتا ہے اور بے معنی اشعار کی وضاحت ہو سکتی ہے۔

بالعموم اگر معروف آواز مجہول آواز کی ہم قافیہ ہو تو شعر کو غلط سمجھ لینا چاہیے یا کم از کم مشتبہ تو ضرور سمجھنا چاہیے۔ اس عمومی اصول کو مدنظر رکھنا ہی بہتر ہے بہ نسبت ان چند استثنائی مثالوں کے جن میں مخصوص ذوق کے حامل علماء جان بوجھ کر انحرافی صورت اختیار کرتے ہیں۔

تصحیف

علم بیان کی ایک قسم تصحیف ہے جو نقطوں کے بدلنے، لگانے یا حذف کرنے سے متعلق ہے۔ عام طور پر علم بیان کی ایک قسم ہونے کے باعث اسے ارادی طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی لاپروائی، غلطی یا کاتب کی جانب سے تدوین متن کی کوشش میں بے سمجھ بوجھ کے استعمال کے باعث بھی تحریر کا حصہ بن جاتی ہے۔ یوں تو اس کا ذکر "نقاط" کے زیر عنوان ہونا چاہیے تاہم یہ واضح کرنے کے لیے کہ نقطوں کے معمولی سے ہیر پھیر سے معنی میں کتنی بڑی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے، مقالہ ١٣ میں کعب کی بیٹی کے قصے سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔
جہاں تک .B M اور B L نسخوں کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ "میم" کی ابتدائی صورت اکثر "خ" کی ابتدائی صورت سے ملتی ہے۔

(مقالہ: ١٣)B M

بعدل و داد امیری پاک دین بود		که حد او فلک را در زمین بود ١٠

B1

"   که جد او ملک را در زمین بود

LE

بعدل و داد امیر پاك دین بود   که جد او ملک راد زمین بود

I.O , 550, 350

"   که جد او ملک راد مهیں بود

(ان تمام نسخوں کے مطالعے کے بعد مجھے گمان ہوتا ہے کہ B.M. کا نسخہ بہترین ہے)۔

آخری دو نسخوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کعب کا تعلق شاہی نسل سے تھا، وہ غالباً سامانی خاندان کے نصر بن احمد کے دور میں بلخ کا گورنر ہوگا جس کے پیش رو اسماعیل نے بلخ اور خوارزم پر قبضہ کیا تھا۔ لگتا ہے کعب عام طور پر ایک صوفی خاتون کے باپ کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا، جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔

حوالہ کے لیے دیے گئے اشعار کا ترجمہ

وہ ایسا حکمران تھا جس کی دینی پاکبازی اس کے عدل و سخاوت سے ظاہر ہوتی تھی اور ان صفات کی حدود داتی وسیع تھیں جتنی زمین پر آسمان کی۔

حواشی

۱۔ الٰہی نامہ شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری کی فارسی مثنوی ہے جو سات ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ (الٰہی نامہ مرتبہ فواد روحانی، تہران، سن ندارد، ص ۱) اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دانش مند خلیفہ کے چھ بیٹے تھے۔ ہر ایک اپنے دل میں کوئی آرزو لیے ہوئے تھا اور اس کے حصول میں ناکامی پر آزردہ تھا۔ ایک روز باپ نے انھیں پاس بلایا اور کہا کہ اگر وہ اسے اپنی آرزو سے آگاہ کریں تو شاید وہ انھیں کامیابی کی کوئی راہ سجھا سکے۔ بیٹوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور یک یک کرکے آرزوئے دل بیان کی۔ پہلا بیٹا شاہ پریان کی بیٹی پر فریفتہ تھا اور وصل کے سوا کسی شے کا آرزو مند نہ تھا۔ دوسرا بیٹا سحر و جادو سیکھنے کا خواہش مند تھا، تیسرے بیٹے کو جام جمشید کی خواہش تھی۔ چوتھا آب حیات کا متلاشی تھا، پانچواں سلیمان کی انگشتری کی کھوج میں تھا اور چھٹا کیمیا سیکھنے کے جنون میں مبتلا تھا۔ باپ نے ہر ایک کی آرزو سنی اور جواب میں عارفانہ نکات و پند پارے سود مندی کی مدد سے انھیں اس امر پر قائل کیا کہ دل کو نفسانی خواہشات کا اسیر رکھنے کے بجائے عشق الٰہی کے نور سے آباد رکھیں۔ یوں اس کہانی میں عطار نے راہ سلوک و معرفت کے مراحل بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں اور طلب، توبہ، عشق، حیرت، توکل، معرفت، توحید، فقر و فنا جیسے مضامین کے باب میں شاعرانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ عطار کا اسلوب شعری پر سوز و گداز اور خلوص عشق سے مملو

ہے۔

روایت ہے کہ مولانا روم جب طفولیت میں علاؤالدین خوارزمی کے ظلم پر اپنے والد کے ساتھ اپنی جائے ولادت بلخ سے ہجرت کر کے مغرب کی طرف روانہ ہوئے تو نیشاپور سے بھی گزرے جہاں ۱۲۱۲ء میں ان کی عطار سے ملاقات ہوئی۔ عطار نے اس ہونہار بچے سے شفقت کا اظہار کیا اسے دعا دی اور اس کی عظمت کی پیش گوئی کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر عطار نے رومی کو اپنی نظم ''الٰہی نامہ'' کا نسخہ بھی تحفے میں دیا۔ (براؤن، A Literary History of Persia، جلد دوم، ص ۵۰۵) جامی نے نفحات الانس میں اس موقع پر جس نظم کے پیش کیے جانے کا ذکر کیا ہے وہ ''اسرار نامہ'' ہے ''الٰہی نامہ'' نہیں۔ رجامی، مولانا عبدالرحمٰن بن احمد، ۱۳۳۶ھ نفحات الانس، تصحیح و مقدمہ، مہدی توحیدی پور، کتاب فروشی محمودی، ایران، ص ۵۹۹) نوادر روحانی نے بھی اسی بات کا تذکرہ کیا ہے (مقدمہ الٰہی نامہ، ص ۹) ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب نے بھی اس موقع کے حوالے سے اسرار نامہ کا ذکر کیا ہے مگر اس روایت کو درست تسلیم کرنے میں انھیں تامل ہے۔ (از گلستان عجم، مترجمہ ڈاکٹر محمد نور محمد خان، ڈاکٹر کلثوم فاطمہ سید، ص ۲۳۱)

۲۔ مصنف نے اس لفظ کو نسخ تحریر کیا ہے۔ اصل لفظ نسخ ہے۔ یہ عربی کا قدیم رسم الخط ہے جو خواجہ عمادالدین یاقوت مستعصمی کا اختراع کردہ ہے۔ چوں کہ اس خط نے پہلے سے رائج پانچ خطوط منسوخ کر دیے تھے اس لیے اس کا نام نسخ قرار پایا۔ قرآن مجید اول اسی خط میں لکھا گیا۔ یہ خط اپنی خوبی میں سنسکرت، زند اور پہلوی خطوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ (جامع اللغات ص ۹۵۶، فرہنگ آصفیہ ۱۹۰۸ء ج سوم چہارم ص ۵۶۲)

۳۔ اردو اور فارسی زبان کا ایک رسم الخط، جس کا موجد میر علی تبریزی تھا۔ یہ خط نسخ اور خط تعلیق کا مرکب ہے اور اپنے تناسب، نزاکت اور خوبصورتی کے باعث بہت مقبول ہے۔ (فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، چہارم ص ۵۵۹، جامع اللغات ص ۹۵۶)

۴۔ فارسی کے معروف صوفی شاعر فریدالدین ابو حامد محمد بن ابو بکر ابراہیم، نیشاپور کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ عطار کی مصدقہ تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہیں۔ ان کی زندگی کے حالات بھی تاریکی کے پردے میں ہیں، تاہم ان کی زندگی اور موت کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں ضرور مشہور ہیں۔ عوفی نے ''لباب الالباب'' میں انھیں بادشاہ سنجر کے زمانے کا شاعر بتایا ہے (جلد ۱، ص ۳۹۵ ـ ۲۳۹) عطار نے بھی اپنے اشعار میں جا بجا سنجر کا تذکرہ کیا ہے۔ لباب الالباب ۶۱۷ھ (۱۲۲۱ء) میں لکھا گیا اور اس میں عطار کو ایک زندہ شاعر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی محققین میں اختلاف ہے۔ قاضی نوراللہ شستری نے ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) قرار دی ہے۔ دولت شاہ نے کئی ایسی مختلف روایات بیان کی ہیں جن میں ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء)، ۶۲۷ھ (۳۰-۱۲۲۹ء) اور ۶۱۹ھ (۱۲۲۲ء) شامل ہیں۔ ۶۲۷ھ (۳۰-۱۲۲۹ء) کے بارے میں کچھ اور لوگوں نے بھی شہادت دی ہے جن کی تعداد اہمیت ... براؤن نے آٹھ بتائی ہے تاہم براؤن نے خود عطار کی تخلیقات کی مدد سے اندازہ لگایا ہے کہ عطار ۵۵۰ء۔ ۶۱۵ھ کی درمیانی مدت میں پیدا ہوئے اور کم از کم ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) تک ضرور زندہ تھے۔ (A Literary History of Persia، جلد ۲، ص ۵۰۸ ـ ۵۰۶) شبلی نے شعر العجم میں ان کی تاریخ ولادت شعبان ۵۱۳ھ قرار دی ہے مگر اس کی کوئی سند پیش نہیں کی۔ (شعر العجم، جلد دوم ص ۷) جامی نے نفحات الانس میں ان کی عمر ایک سو چودہ سال بیان کی ہے لیکن محققین کو اسے قبول کرنے میں تامل رہا ہے۔ (نفحات، ص ۶۰۰) ایک روایت کے مطابق عطار اویسی سلسلے سے وابستہ تھے۔ مولانا روم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''عطار روح بود ...

پچاس سال بعد عطار کی روح پیدا ہوئی۔ (نکات، ص ۵۹۹)

۵۔ غالباً حسن نے اس خیال کا ماخذ براؤن کی کتاب A Literary History of Persia جلد دوم ہے جس میں اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس بات کا اعادہ کیا ہے (ص ۲۶۷) اور براؤن کا یہ خیال رومی سے منسوب اس شعر پر مبنی ہے

عطار روح بود و سنائی دو چشم او　　　ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اقبال نے بھی ۱۹۳۳ء میں جب حکیم سنائی کے مزار پر حاضری دی تو ان ہی کے ایک قصیدے کی تضمین میں چند اشعار قلم بند کیے جو بالِ جبریل میں شامل ہیں۔ ان اشعار کے سرنامے کے طور پر انھوں نے بھی اس شعر کا مصرع ثانی درج کیا ہے: ما از پے سنائی و عطار آمدیم (کلیات اقبال اردو، ص ۴۱۲) تاہم تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعر مولانا روم کا نہیں ہے۔ ایک خیال کے مطابق یہ شعر ان کے صاحب زادے سلطان ولد کا ہے۔ (ڈاکٹر عارف نوشاہی، المشاف، ۲۳ فروری، ۱۹۹۹ء، اسلام آباد)

سنائی تقریباً ۴۷۳ھ میں غزنی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی سیر و سفر، شہرت اور مال و زر کی تمنا میں بھٹکتے ہوئے گزری۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں جن میں ایک قصاب بچے سے ان کے شدید عشق کی داستان بھی شامل ہے۔ ہرات، نیشاپور، بلخ اور خوارزم سے ہوتے ہوئے وہ مکہ پہنچے اور حج کا فریضہ ادا کیا جس کے بعد ان کے اندر ایک ذہنی اور باطنی انقلاب برپا ہوا۔ اب ان کے قصائد، دنیا داری کی سطوت و شوکت اور مدح و شاہد بازی کے بجائے حکیمانہ نکات اور وعظ و پند کے مضامین سے پر ہو گئے۔ اس دور میں سنائی کے اشعار نے ایک نیا اسلوب شعری پیدا کیا جس کی پیروی بعد از اں خاقانی، ظہیر، امیر خسرو اور جامی نے کی۔ ان اشعار میں زہد و حق شناسی کے علاوہ ایک قلندرانہ شان بھی جھلکتی ہے۔ سنائی کا دیوان قصائد، غزلیات، ترکیبات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان کے اشعار کی کل تعداد تقریباً چودہ ہزار ہے۔ ان کی مثنویوں میں سب سے زیادہ معروف 'حدیقۃ الحقیقت' ہے جو تصوف، معرفت، حقیقت اور پند و موعظت کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کی صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں تاہم روایت ہے کہ انھوں نے باسٹھ برس کی عمر میں غزنی میں وفات پائی۔ (زرین کوب، از گلستان عجم، ص ۱۲۲-۱۷۵)

۶۔ عطار کی ایک طویل تمثیلی نظم، جس میں پرندوں کی مدد سے سلوک و معرفت کے دقیق نکات اور عارفانہ اسرار و رموز بیان کیے گئے ہیں۔ یہ نظم تقریباً ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں تیس پرندے (براؤن نے پرندوں کی اقسام کی تعداد تیرہ بتائی ہے ص ۵۱۱) اپنے محبوب، سیمرغ کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سات دشوار گزار اور کٹھن وادیوں سے گزرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی وادی طلب و جستجو ہے، دوسری عشق، تیسری معرفت، چوتھی استغنا، پانچویں وادی کا نام توحید ہے، چھٹی کا حیرت اور ساتویں کا فقر و فنا۔ پرندے ابتدا میں تو اس سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں پہلے بہت لیت و لعل کرتے ہیں مگر بالآخر اس سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد سفر کے اختتام پر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس سیمرغ کے متلاشی ہیں وہ خود ان تیس پرندوں کی حقیقت کے سوا کچھ اور نہیں۔ عرفانِ حقیقت کا یہی لمحہ ان کے سفر کی منزلِ آخر ہے اور یہی وحدت الوجودی تصوف کی روح آخر ہے۔ لفظ "سیمرغ" کا مطلب "تیس پرندے" ہے۔ یوں عطار نے ایک لسانی نکتے کی مدد سے یہ گہری حقیقت بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب نے اس نظم کو ایک عارفانہ حماسہ (Epic) قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس نظم کے بنیادی خیال اور اس کی فنی ساخت کا ماخذ تلاش کرتے ہوئے عالمی ادب کے کئی شہ پاروں کی مثال پیش کی ہے جن میں سالکین اور روحانی

بہت خوبی سے کیا پڑتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے بایزید بسطامی کی داستانِ معراج، ابن سینا کی داستان طیور اور غزالی کی رسالۃ الطیر کے علاوہ قدیم یونانی اور مغربی ادب کے کئی فن پاروں کی مثال بھی دی ہے۔ ان میں چوتھی صدی عیسوی کے رومی شاعر پروڈنس (Prudence) کے اشعار، اوستا (خدا نامہ) کی داستانوں اور منڈائی (صابئین کا ایک فرقہ) سا طیر بھی شامل ہیں۔ تاہم ان کے خیال میں منطق الطیر کی سب سے زیادہ مماثلت غزالی کی رسالۃ الطیر سے ہے۔ البتہ داستان کا جو عطار کے ہاں جس گہری اور لطیف حقیقت کے انکشاف پر ختم ہوتی ہے وہ غزالی کے ہاں مفقود ہے۔ (ارگستانی، مجم، ص ۳۲۷-۳۲۹)

۷۔ اصل میں یہ لفظ خلیمہ ہے۔

۸۔ عطار کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ تاہم محققین نے ثابت کیا ہے کہ ان سے منسوب کئی تصانیف فرید الدین یا عطار نامی دیگر شعرا کی ہیں۔ سعید نفیسی نے اپنی کتاب میں بارہ اشخاص کے نام گنوائے ہیں جن کا لقب یا تخلص عطار تھا۔ لسان الغیب نامی معروف کتاب بھی ان سے منسوب کی جاتی ہے مگر اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ ان کا کلام نہیں۔ خود روحانی نے ان کے نثری شاہکار "تذکرۃ الاولیاء" کے علاوہ آٹھ شعری تصانیف کا ذکر ہے جو مصدقہ طور پر عطار کی تخلیق ہیں۔ ان میں "الٰہی نامہ"، "منطق الطیر"، "مصیبت نامہ"، "اسرار نامہ"، "پند نامہ"، "خسرو نامہ" اور "دیوان اشعار" شامل ہیں۔ ان کے علاوہ "جواہر نامہ" اور "شرح القلب" کے عنوان سے دو اور منظومات بھی ان سے منسوب ہیں۔ ان کے کل اشعار کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہے۔ (روحانی، ص ۹) ڈاکٹر عبد الحسین زریں کوب نے بھی "منطق الطیر"، "الٰہی نامہ"، "مصیبت نامہ"، "اسرار نامہ"، "خسرو نامہ" اور "پند نامہ" کے علاوہ دیگر کتب کو مضامین اور اسلوب کے لحاظ سے اس قدر مختلف قرار دیا ہے کہ ان کی عطار سے نسبت محلِ نظر قرار پاتی ہے۔ (ارگستانی، مجم، ص ۳۳۳)

۹۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں علمائے مغرب پہلی بار عطار کی جانب متوجہ ہوئے۔ "پند نامہ" کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۱۹ء میں سلویستر دی ساسی نے اور منطق الطیر کا فرانسیسی ہی میں پہلا ترجمہ گارساں دتاسی نے ۱۸۵۷ء میں کیا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں انگلستان میں اے آر نکلسن کی کوششوں سے تذکرۃ الاولیا اشاعت پذیر ہوئی۔ الٰہی نامہ کا لیتھوگراف ایڈیشن (سنگی طباعت) پہلی بار ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ (اسی نسخے کو ولسن نے زیر نظر مضمون میں معیار بنایا ہے اور اس کا موازنہ برٹش لائبریری اور بادلین لائبریری کے نسخوں سے کیا ہے)۔ ۱۳۱۶ھ میں تہران سے اس کا لیتھوگراف ایڈیشن شائع ہوا اور ۱۹۴۰ء میں جرمن محقق ہیلموت ریٹر (Helmuth Ritter) کے زیر اہتمام استنبول سے "الٰہی نامہ" کی اشاعت ہوئی۔ (روحانی، ص ۲،)

۱۰۔ فرانسیسی مستشرق اور سامی زبانوں کا ماہر۔ ۱۷۵۸ تا ۱۸۳۸ء

(http //en.wikipedia.org/wiki/silvestre_de_Sacy)

۱۱۔ ارگستانی، روحانی، ص ۱۵۲

۱۲۔ یہ شعر حاشیے میں درج ہے جب کہ اصل متن میں درج ذیل شعر ملتا ہے

تعجب کرد از آن حال سکندر   که موران است آن یاقوت رهبر

مفہوم کے اعتبار سے روحانی کے متن میں درج شعر زیادہ بامعنی ہے۔ سکندر کے لیے یہ نظارہ تعجب کا محل ہو سکتا ہے مایوسی کا

نہیں۔

۳۔ گو سپندان، روحانی، ص۲۱۲

۴۔ که بی عقلند و ایشان می ندانند، ایضاً

۵۔ متن میں اس کے بجائے یہ مصرع درج ہے — از آن سوی قصابی، خود روانند

حاشیے میں درج ذیل متبادلات پیش کیے گئے ہیں

قصابی خود، تعار خون، ایضاً

۶۔ که او هم عقل و علم و هم طلب داشت، ایضاً

۷۔ نشست، ایضاً

۸۔ کسی ران سومه گو میلی کشیدی، روحانی، ص۱۷۷

۹۔ ساق کا ترجمہ ولسن نے ٹانگ کیا ہے جب کہ درست ترجمہ پنڈلی ہے۔ یہاں پنڈلی کا لفظ متن کے بھرپور ابلاغ کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

۲۰۔ نه ای از چرخ دوتو رو نیامور — که او هم سر نگون آید شب و روز، روحانی، ص۷۷

۲۱۔ همه، ایضاً

۲۲۔ قرآن حکیم، سورۂ یٰسین، آیہ ۳۸ (ولسن نے اس آیت کا غلط حوالہ لکھا ہے)

۲۳۔ ولسن نے سرنگوں کے معنی ڈوبنا اخذ کیے ہیں اور ڈوبنے سے سجدہ کا تلازمہ استعمال کیا ہے۔ یہ دونوں ہی تعبیریں درست نہیں۔ فارسی متن میں سجدہ کا ذکر نہیں ہے اور نہ ڈوبنے یا طلوع ہونے کا مطلب نکلتا ہے۔ صرف سر جھکانے کا مفہوم صحیح ہوتا ہے۔ اگر آسمان کو ایک پہیے یا چرخی کے مانند تصور کیا جائے، جیسا کہ مصنف نے لفظ "چرخ" کے استعمال سے اشارہ کیا ہے تو پہیے کی گردش میں ہر مقام عروج اور زوال دونوں سے گزرتا ہے۔ یوں ہی روز و شب کا سلسلہ بھی وجود میں آتا ہے۔ اردو میں بھی سورج کے لیے ڈوبنے اور چڑھنے کے افعال استعمال کیا جاتے ہیں جو عروج و زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مگر عطار نے یہاں یہ مفہوم اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ بلند مراتب کے حصول کے لیے انکساری اور فروتنی لازمی ہے۔ اس تدبر کے بغیر کچھ نہیں۔ سورج جب افق سے طلوع ہوتا ہے تو گویا پستی سے بلندی کا سفر کرتا ہے اور شام کو افق ہی میں غروب ہو جاتا ہے۔ اسی مشاہدے کے نتیجے میں فارسی اور اردو شعرا نے آسمان کو چرخ باندھا ہے۔ زیرِ نظر مضمون کا مصنف لفظ "چرخ" کے تلازمات سے پوری طرح واقف معلوم نہیں ہوتا۔

۲۴۔ سلیمان کوره ای می خواست روزی — که تا آبی خورد بی درد و سوری

روحانی، ص۲۱۱

۲۵۔ که آن کوره نمود ناشد آنگاه — ز خاک مرده ای افتاده در راه، ایضاً

۲۶۔ چندان، ایضاً

۲۷۔ یکی، روحانی، ص۲۳۰

سے وابستہ ہے۔ یہ شدت احساس اس کے دل میں گداز، نرمی اور رقت پیدا کرتی ہے جس کے باعث طول عمری ممکن نہیں رہتی۔ اگر انسان زیادہ دیر تک دنیا میں رہنا چاہتا ہے تو اسے پتھر کے مانند بے حس ہونا پڑے گا لیکن یہ اس کے رہنے کو کم تر کر دے گا۔

۴۱۔ گدازش ایضاً، ص ۴۴۲

۴۲۔ گوسپند ایضاً

۴۳۔ بنگذارد ایضاً

۴۴۔ ای نکو کار۔ ایضاً، ص ۴۴۶
(یہاں پر ولسن کو شعر کا مطلب سمجھنے میں سہو ہوا ہے انھوں نے جہاں اضافت بیان کی ہے وہاں ندائیہ ہے)

۴۵۔ که تو در ره نه ای۔۔۔ ایضاً

۴۶۔ که تنها دم توانی رد بمیلات، ایضاً

۴۷۔ تو بشنو قصهٔ گنگ سخن گوئی حاشیے میں گنگ کے بجائے کبک درج ہے۔ ایضاً، ص ۴۷۰

۴۸۔ اگر لفظ کبک کو درست تصور کیا جائے تو ولسن نے اس کا ترجمہ بلبل کیا ہے جو درست نہیں۔ ادب میں بلبل اور چکور دونوں ایک دوسرے سے الگ تناظر میں استعمال ہوتے ہیں۔ بلبل اپنی خوش نوائی اور عشق گل کے لیے معروف ہے لیکن اس عشق میں نارسائی اور محرومی کا وہ کرب نہیں جو چکور کا مقدر ہے۔ بلبل کو ہزار داستان بھی کہا جاتا ہے۔ اسے سیر گل بھی میسر ہے اور دید گل کی دولت بھی۔ اس کے نغمے عشق کا اظہار کرتے ہیں لیکن چکور کی طرح ان میں دائمی فراق کی کسک اور ہجر کی اندوہناک پکا نہیں ہے۔ چکور کا مرکز عشق اس کی پرواز کی حد سے بہت دور کہیں آسمانوں میں ہے۔ وہ شب مہتاب میں دیوانہ وار چاند کی طرف لپکتا اور اس کی آواز کو چکور کا گیت نہیں، اس کی پکار کہا جا سکتا ہے۔ ادب میں عشق مجازی کے لیے بلبل اور عشق حقیقی کے لیے چکور کا استعارہ زیادہ معنی آفریں ہے۔ اسی لیے عطار نے یہاں دیگر کے عشق نارسا کے بہترین اظہار کے لیے کبک یعنی چکور کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ولسن نے غالباً اس روایت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے بلبل سے تعبیر کیا ہے۔

۴۹۔ رمانش، ایضاً، ص ۴۴۶

۵۰۔ رمانش، ایضاً

۵۱۔ نگشاید، ایضاً

۵۲۔ بعیبت میکشد خلق جهانی، ایضاً

۵۳۔ مصرع بدل جانے کی صورت میں ترجمہ بھی بدل جائے گا۔

۵۴۔ دادن کسالی، ایضاً

۵۵۔ اگر این سگ، ایضاً، ص ۴۴۶

۵۶۔ عجب این اسب کاینجا شیر گردد، ایضاً

۵۷۔ مشد، ایضاً، ص ۴۵۶

۵۸۔ چنین، ایضاً، ص ۴۵۵

۵۹۔　کیم ار حمد و ار تمحید و تحمید، ایضاً

۶۰۔　پسر گفته تو آنجا...، ایضاً ص۵۹

۶۱۔　حیلت، ایضاً

۶۲۔　القصه همراه، ایضاً

۶۳۔　که پیش آن حکیم هندوان شو، ایضاً

۶۴۔　کند چوبان که فرمائیش کاری، ایضاً

۶۵۔　پس آنکه گفت چون نائی پدر را، ایضاً، ص۶۲

۶۶۔　گم کرده او...، ایضاً

۶۷۔　جہان آتشش بر جان ...، ایضاً

۶۸۔　اس شعر کے بعد روحانی کے مرتب کردہ متن میں ایک اور شعر بھی ہے جو درج ذیل ہے

ربس کر دیده او حوناب رانده　　　ر خون و آب در گرداب مانده، ایضاً

۶۹۔　در آن ساعت...، ایضاً

۷۰۔　چه گوسه گوید او ار بے قراری ایضا (ولسن نے اس مصرع کو رد کر دیا تھا مگر روحانی کی تحقیق کے مطابق یہی مصرع درست ہے)

۷۱۔　یاقوت پاره، ایضاً، ص۲۱۷

۷۲۔　که او هم عقل و علم و هم طلب داشت، ایضاً، ص۲۱۳

۷۳۔　ردیف منشست ہے ایضاً

۷۴۔　حروشی، ایضاً ص۲۰۸

۷۵۔　چو دریا ران رمان درحاسب هوشی، ایضاً (ولسن کو یہاں بھی لفظ کے درست انتخاب میں غلطی ہوئی ہے)۔

۷۶۔　طعامی بردشه را　ایضاً ص۲۲۹

۷۷۔　چو در راهش ، ایضاً

۷۸۔　بر، ایضاً

۷۹۔　بموعی ایضاً، ص۲۵۰

۸۰۔　مائد ارآن　ایضاً

۸۱۔　حالی، ایضاً

۸۲۔　دل من ... ایضاً

۸۳۔　موبد کا ترجمہ ولسن نے priest کیا ہے۔ فارسی میں موبد آتش پرستوں کے پیشوا کو کہتے ہیں۔ آتش پرستی قدیم ایران میں عام تھی۔

۸۴۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فارسی متون میں ''ک'' کو ''گ'' کی صورت میں لکھا گیا ہے جیسا کہ دوعانی کے متن میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔

۸۵۔ دوستی تست۔ ایضاً، ص۲۵۲

۸۶۔ جوان گرداندش۔ ایضاً

۸۷۔ مصرعے کے اصل مفہوم میں جوان رکھنے کا نہیں دوبارہ جوان بنادینے کا ذکر ہے۔

۸۸۔ گازر کا مطلب دھوبی ہے مگر ولسن نے اسے رنگ ریز کے معنی میں لیا ہے۔

۸۹۔ گازر، ایضاً، ص۱۹۹

۹۰۔ ده، ایضاً

۹۱۔ ده، ایضاً

۹۲۔ حکایتاً تو کفن کے لیے دو گز کپڑے کا ہی ذکر ہوتا ہے لیکن واقعتاً کفن کے لیے کپڑے کی جس مقدار کی ضرورت ہوتی ہے وہ دو گز سے کہیں زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کفن کے لیے ۲۱ گز کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۹۳۔ خلیمہ

۹۴۔ چنان باید که شهر و کوی و بازار، دوعانی، ص۲۳۳

۹۵۔ بیفزاید یک بار، ایضاً

۹۶۔ آرید در وی رهو... ایضاً

۹۷۔ بدو بدهند و بر گیرندش از راه، ایضاً

۹۸۔ باره، ایضاً، ص۲۱۲

۹۹۔ چاره ای، ایضاً

۱۰۰۔ در، مثنوی معنوی، دفتر اول، ص۳۳۹

۱۰۱۔ پری ایضاً

۱۰۲۔ اس بہت وسیع آسمان اور زمین نے تنگی کی وجہ سے میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا ہے
اور یہ عالم جو اس بعد میں مجھے نظر آیا، اس نے وسعت کی وجہ سے میرے پر و بال کھول دیے ہیں
وہ عالم اور اس کا رستہ اگر نظر آتا کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی اس جگہ رہتا۔
(ترجمہ از قاضی سجاد حسین، مثنوی معنوی، دفتر اول، ص۳۳۹)

۱۰۳۔ مثنوی مولانا روم کے بارے میں ولسن کا یہ خیال درست نہیں۔ اصل متن میں ''آن'' اور ''اینجا'' ہی ہے مثنوی معنوی، ص۳۳۹

۱۰۴۔ کنداب رین، ایضاً، ص۳۳۹

۱۰۵۔ چو در دیدی کسوت عشق من بس، ایضاً

۱۰۶۔ یقینم شد که اندر کار سستی (حاشیے میں تو در عشق سستی) ایضاً

۱۰۷۔ جستی، ایضاً

۱۰۸۔ زرو سیم همه بودی ترا پاک ایضاً

۱۰۹۔ بگشاد، ایضاً

۱۱۰۔ ولس کی بیان کردہ غلطیوں کے الٹ پھیر سے پیدا ہونے والی انتشار کی دلچسپ مثال ہے۔ روحانی کے نسخے میں یہ مصرع اس طرح ہے

که جد او ملک راد رمین بود

یہ مصرع لکھنؤ کے لیتھوگراف ایڈیشن میں بھی اسی طرح درج ہے مگر ولس کو اسے تسلیم کرنے میں تامل ہوا۔ انھوں نے برٹش میوزیم کے نسخے کو ترجیح دی ہے۔

فہرست اسناد محولہ

براؤن، ای۔ جی۔، ۲۰۰۳ء (۱۹۰۶ء)، A Literary History of Persia جلد دوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

جامی، مولانا عبدالرحمن بن احمد، ۱۳۳۶ھ، "نفحات الانس"، تصحیح و مقدمہ مہدی توحیدی پور، کتاب فروشی محمودی، ایران

دہلوی، سید احمد، مولوی، مرتب، ۲۰۰۲ء، "فرہنگ آصفیہ"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

رومی، مولانا جلال الدین محمد بلخی، ۱۹۷۷ء (۱۳۹۸ھ)، "مثنوی معنوی" (دفتر اول)، ترجمہ و مقدمہ قاضی سجاد حسین، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔

زریں کوب، ڈاکٹر عبدالحسین، ۱۹۸۵ء، با کاروان حلہ، مترجم مہر نور محمد خان، ڈاکٹر، کلثوم فاطمہ سید، ڈاکٹر، "گلستان عجم"، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد

عبدالمجید، خواجہ، مرتب، ۲۰۰۳ء، "جامع اللغات"، اردو سائنس بورڈ، لاہور

عطار، شیخ فرید الدین، (سن ندارد)، "الٰہی نامہ"، تصحیح فواد روحانی، کتاب فروشی زوار، تہران،

عوفی، محمد، ۱۹۰۶ء (۱۳۲۴ھ)، "لباب الالباب"، مرتبہ براؤن، ایڈورڈ، جی، مرزا محمد قزوینی، لندن

فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر، مرتب، سن ندارد، "کلیات بلھے شاہ"، الفیصل پبلشرز، لاہور

نفیسی، سعید، ۱۳۴۴ھ، "تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی"، جلد اول و دوم، کتاب فروشی فروغی، ایران۔

مزید مطالعہ کے لیے

الویل سٹن، ایل۔ پی۔، ۱۹۶۳ء، "Elementary Persian Grammar"، کیمبرج

اوسلے، ولیم، ۱۷۹۵ء، "Persian Miscellanies. An Essay to Facilitate the Reading of Persian Manuscripts"، لندن

پامر، ای۔ ایچ، ۱۸۸۶ء "Oriental Penmanship, Specimens of Persian and writing"، لندن

پیپر، ہربرٹ ایچ اور محمد علی جزائری، ۱۹۵۵ء "The Writing System of Modern Persian"، واشنگٹن، ڈی سی۔

تھیکسٹن، ویلر ایم ۱۹۹۳ء "An Introduction to Persian"، واشنگٹن، ڈی سی،

اسٹیورٹ، چارلس، ۱۸۲۵ء "Original Persian Letters and Other Documents with Fac-Similes"، لندن

فضائلی، حبیب اللہ، ۱۳۹۱ھ "اطلس خط"، اصفہان

فوربس، ڈنکن، ۱۸۴۹ء "Oriental Penmanship, An Essay for Facilitating the Reading and Writing of the Ta'lik Character"، لندن

ولیم، ایل۔ ہناوے، اور ای سپر، ۱۹۹۵ء "Reading Nasta'liq"، مزدا پبلشرز، کیلیفورنیا

یوسفی، غلام حسین "Calligraphy"، انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا، جلد ۴، صفحات ۶۸۰-۷۱۸

Abstract

C.E. Wilson's article " Aids to Reading Persian MSS, in view of Editorial Work" was published in "Islamic Culture", in October 1923. In this article the author has presented his observations and suggestions regarding commonly occurring errors in reading Persian manuscripts. For the purpose, he has used various printed copies and manuscripts of "Elahi Nama", a mathnavi by a renowned Persian poet Farid-ul-Din Attar, as a primary source and has mentioned the misunderstood spellings and incorrect selection of the words. He has claimed that most of these errors are due to the misconception and carelessness of the Copyist. But here the present translator has pointed out that he (Wilson) himself has committed a lot of mistakes in reading the Persian text. The

translator has mentioned such mistakes in the references after comparing it with the text of Elahi Nama compiled by Fawwad Roohani of Tehran, who had consulted and compared 21 copies of the text

معیار ۔ علمی و تحقیقی مجلہ، شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری - جون ۲۰۰۹ء

غالب اور غمگین کی مراسلت

از "معیار"

کوالالمپور، ملیشیا کے NTERNATIONAL INSTITUTE OF ISLAMIC CIVILIZATION AND THOUGHT کا کتب خانہ اپنے ذخائر علمی اور بالخصوص عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کے ذخیرے کے لحاظ سے نہایت بار ثروت ہے۔ اس کے قلمی ذخیرے میں اسلامی عہد کے دورِ آخر کے متعدد اہم فارسی و اردو مخطوطات اس عہد کے مطالعۂ تاریخ و ادب اور تحقیق میں انتہائی قیمتی اور ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کتب خانے کے ذخیرۂ عبدالرحمٰن بارکر میں غالب کے بھی چند نوادر موجود ہیں جن کی نشاندہی اور ابتدائی تعارف راقم الحروف نے ایک الگ مقالے میں تحریر کیا ہے۔[1]

غالب اور میر سید علی غمگین دہلوی (۱۷۵۳ء - ۱۸۵۱ء) کے روابط متعدد محققین کا موضوعِ مطالعہ و تحقیق رہے ہیں۔ ان دونوں کی باہمی مراسلت کا تذکرہ بھی سامنے آتا رہا ہے۔ اس مراسلت کو غمگین کے ایک مرید خاص حافظ ہدایت الہیٰ نے ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۲ء میں نقل کر کے محفوظ کر لیا تھا، جو کتب خانہ فقیر منزل، گوالیار میں موجود ہے۔ اس مخطوطے میں غمگین کے چار خطوط اور غالب کے دس خطوط غمگین کے نام اور مزید دو خطوط ان کے کسی لکھنوی دوست کے نام شامل ہیں۔

اس مجموعۂ مکاتیب کے کسی اور مخطوطے کا علم عام نہیں ہے لیکن اس کا ایک نسخہ کوالالمپور کے مذکورہ ادارے کے کتب خانے میں ذخیرۂ عبدالرحمٰن بارکر میں بہ ذیل شمار ۱۹۱ فارسی موجود ہے۔ جو ۲۷/ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء کو گوالیار میں مکمل ہوا تھا۔ اس کتب خانے کی مذکورہ فہرستِ مخطوطات فارسی کے فہرست نگار نے اس کے مرتب کا نام ہدایت اللہ تحریر کیا ہے جسے دراصل ہدایت الہیٰ پڑھا جانا چاہیے تھا۔ پھر فہرست نگار نے ان خطوط کو غیر مطبوعہ بتایا ہے جو غلط ہے۔ ان میں سے چند خطوط کو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر سید وزیر الحسن عابدی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔[2]

مخطوطہ نہایت کرم خوردہ اور روئی مائل کاغذ پر ہے اور چوں کہ اوراق کو دونوں جانب سے موٹی کاغذ چسپاں کر کے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اس لیے متن کا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے۔ روشنائی سیاہ ہے لیکن کہیں کہیں مکتوب نگار کے نام پر سرخ خط کھینچ کر نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خط پختہ نستعلیق ہے۔ مکتوبات ۱ تا ۲۵ صفحات کا احاطہ کرتے ہیں۔ صفحات کا نمبر شمار بعد میں پیشانی پر درمیان میں درج کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوبات پر مشتمل یہ متن کسی اور متن کے ساتھ کتابت اور مجلد کیا گیا تھا، جسے بعد میں علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ پیشانی پر

بائیں جانب اوراق کے نمبر شمار درج ہیں۔ حسن کے مطابق یہ متن ورق ۱۶۲، الف سے شروع ہو کر ۱۸۴ ب پر ختم ہوا ہے۔ متن کے آغاز سے پہلے اور اختتام کے بعد کے صفحات سادہ ہیں۔ سائز ۶×۱۹ انچ ہے اور فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں۔ مخطوطے کے متن اور کاتب مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ و ریاض الحسن عابدی کے مرتبہ متن میں کاتب سے لفظی اختلافات موجود ہیں۔ القاب و تخاطب میں بھی کہیں کہیں فرق موجود ہے۔ غالب کے وہ خطوط، جو انھوں نے اپنے کسی لکھنوی دوست کو، حسن کا نام موجود نہیں ہے لکھے تھے، وہ دونوں خطوط زیرِ نظر مخطوطے میں ڈاکٹر سید عبداللہ و ریاض الحسن عابدی کے مرتبہ متن کے مطابق غالب کے آٹھویں خط کے بعد شامل ہیں۔ مخطوطے میں خطوط کی ترتیب اس طرح ہے:

ذیل میں غالب و غمگین کی مراسلت کا کل متن، جو عبدالرحمٰن بار کر کے مذکورہ نسخے میں موجود ہے منحصر بفرد اور نایاب اور ہے۔ چوں کہ یہ شدید طور پر کرم خوردہ ہے اس لیے بہ سہولت اس کی قرأت بھی ممکن نہیں۔ اس خیال سے کہ یہ کسی طرح استفادے میں آسکے اور محترم محققین کو ترتیبِ متن و تدوین کے لیے دعوتِ مقابلہ (Challange) دے سکے یہاں بصورتِ عکس پیش کیا جا رہا ہے۔ م۔ع

حواشی

۱۔ جیسے "ملتیاتِ غالب کے نوادر" مشمولہ "ارمغانِ ڈاکٹر سید عبداللہ" مرتبہ: ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر ضیاء الحسن، لاہور، شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء اور "غالب کا ایک نودریافت منقبت بند درشانِ مشکل کشا" مشمولہ "بازیافت" لاہور، شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء

۲۔ حالات اور روابط کے لیے محمد یونس خالدی "مطالعۂ حضرت غمگین دہلوی"، محمد مسعود احمد "سید علی غمگین" مشمولہ "نوائے ادب" (بمبئی، اپریل ۱۹۶۳ء)، "حضرت غمگین، غالب کی نظر میں" مشمولہ "اردو"، (کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء)، حضرت جی گوالیاری "مقدمہ" مشمولہ "مخزن الاسرار" مصنفہ سید علی غمگین (گوالیار، ۱۹۵۹ء)، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی "غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات" مشمولہ "یادبودِ غالب" دہلی ۱۹۹۳ء۔

۳۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی "غالب کے فارسی رقعات" مشمولہ "اردوئے معلی" دہلی فروری ۱۹۶۰ء، ص ۳۹–۵۶، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۸۶–۱۰۵؛ ڈاکٹر سید عبداللہ و سید وزیر الحسن "غمگین و غالب کے فارسی خطوط" مشمولہ "اورینٹل کالج میگزین" لاہور، فروری ۱۹۶۳ء، ص ۱–۳۷، محمد مسعود احمد "مرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب" مشمولہ "اردو نامہ" (کراچی، شمارہ ۸) ص ۸۱–۸۳۔ یہاں مقالہ نگار نے ان خطوط کے مطالعے کے مزید حوالے درج کیے ہیں۔

۴۔ دیکھیے حوالہ ۱، ۲ اور ۳۔

Abstract

Ghalib the most famous and important poet of his time and Rangin, a renowned sufi, both were contemporaries and close associates. They were friends having mutual interest and common literary taste. They consulted each other by exchanging letters in highly ornamented and scholastic Persian language. These letters consist of numberous topics that are very interesting and provocative as they belong to these two learned figures of the time. The language and diction of these letters also have an importance in the history of Persian prose during 19th century in India.

These letters are very rare and now preserved in the Library of "The Institute of Islamic Civilization and Thought", Kuala Lumpur, Malaysia and are still not compiled and edited properly and did not publish completely. The scanned copy of these letters are presented here to make these rare letters, in original impression, available easily to the researchers and scholars and to initiate them to include these letters in their research projects and studies.

Academic and Research Journal

No. 1 January – June, 2009 Vol. 1

Department of Urdu

International Islamic University, Islamabad

Editorial Board

For Contact:

Department of Urdu,
International Islamic University,
H-10, Islamabad
Telephone: 051-9019547, 051-9019304
E-mail: meyar@iiu.edu.pk

Layout & Designing: Asma Nazir

The Me'yar does not necessarily agree with the views presented in the articles.

ISSN: 2074-675X

Contents

English Section

Linguistic Studies:

Urdu Section

Me'yar: Academic and Research Journal, Department of Urdu, IIUI, Vol: 1, No: 1, Jan-Jun 2009

Symbols for Urdu Scientific Literature

S.G.H. Taqvi *

Introduction

The present Arabic letters do not provide useful symbols due to similarity of shapes and as the distinction is done by modifiers i.e. dots (nuqtas) etc. Difficulty is faced while writing or translating scientific literature into Arabic orientated languages. Thus, one turns to Roman or Greek letters. An attempt is made here to present a list of symbols to be used in Urdu scientific literature.

Development of Symbols

Study of letters shows that systems which employ the principles of superposition (linear and non-linear), rotation and reflection are geometrically simple, have minimum area, minimum number of strokes and maximum distance (the difference in form) between the letters.

Principles

(a) Superposition:

It is defined as a combination of two or more symbols to create a third symbol.

(1) Liner Superposition:

It is the superposition of two or more symbols without changing the orientation of any of the elements, e.g.

U + U = W

(2) Non-Linear Superposition:

* Embedded Systems Laboratory, Department of Physics, University of Karachi, Karachi-32, Pakistan

The superposition is non-linear when the orientation of one or

more elements is changed to form a new symbol, e.g.

(b) Rotation:

Rotation is defined as a change in orientation of a symbol by 90°, e.g.

(c) Reflection:

Reflection in defined as a mirror image of a symbol i.e. rotation by 180° e.g.

(a) w – m

(b)

b	d
p	q

We will make use of these principles to:-

(a) Expose the inherent characteristics of the present Arabic letters.
(b) Adopt these and explore other systems of Arabic letters such as Kufic and South Arabic to employ them as mathematical symbols

Arabic Letters

Authors differ (Siddiqi, 1962, & Dringer, 1953) on the forms of early

Naskh and Kufic letters .Even Diringer (1953) gives different forms in the third edition compared to the second edition of his book.

With the advent of Islam to Persia, the subcontinent and the Far East, sounds were added to Arabic letters by adding modifiers. Additions of modifiers took different forms in Persian, Urdu, Sindhi, Pashtu and Malay.

Letters are tabulated in table.I-A and table.I-B

Rules for developing Urdu Scientific Symbols

Symbols or signals should be efficient in transferring maximum possible information with minimum redundancy. If this condition is not satisfied then the system of symbols or signals is inefficient.

Keeping in view the above observations the object was generate new symbols from Arabic letters by taking out the essence and maximizing the distance.

Following rules are formulated to evolve the symbols:

1. The maximum possible distance between the symbols, and the fluency in writing i.e. minimum number of strokes.
2. The original symbols if distinct not requiring any change, are retained. If not, then suitably modified to increase the distance between the near similar symbols and to make it more practical. This was done keeping in view the similarity of the form with the original letters.
3. Those sections of the alphabet which are the main source of information were retained, and the rest of the section deleted.

4. The principles of superposition (linear and non-liner), rotation and reflection were applied in the development of the proposed symbols.
5. If the symbols have one dot and do not come under the above rules, the current practice of Katib's is incorporated i.e. the dot is connected with the main body of the alphabet by a line that can be turned into or bent outside the main body of the symbol.

6. In cases where a symbol is composed of two portions and contains a symbol itself as a modifier , e.g. . is replaced by a bar
and superposed on the other portion of the symbol in such a way as to increase the distance with the other symbols, keeping in view the fluency in writing.
7. There shall be no change in the phonetic value of the modified symbols.
8. If two or more Nuqtas, are present, then they are joined to form a geometrical figure e.g. the , . etc. into ∆ or ∇ that contains the required information while the base line is deleted.

Derivation of the Suggested Symbols

The Urdu letters are divided into groups on the basis of similarity in form. The modifications or adoptions are dealt with group by group. The modifications are as follows:

Group – I

The Group-I consists of ☪ and ♆. These two symbols are similar except the modifier ~ to increase the distance. The alphabet ☪ is retained without any modification, whereas ♆ is modified by applying the principle of superposition and the resultant form is T, and of course, without any change in phonetic value. To differentiate between ☪ and 1, Kufic version of ☪ i.e. t can be used.

Group – II

Group –II comprises of letters ☯ , ॐ , ☸ , ♉ and ♈. The alphabet ☯ can be considered as a semicircle with a dot placed beneath it. The form will be retained without the dot with more curvature. Here

☯ is transformed into U. This form is closer to Kufic

The letters ॐ and ♉ have three dots below and above the reference line. The meaning is derived by the position and the pattern of the dots. Even if the reference line

is deleted it is possible to get an idea of the alphabet by just looking at the dot patterns, which has the meaning and the distance. So that it is possible to delete the base line and still use the dot pattern to symbolize the alphabet. To achieve a definite shape the

three dots are joined by three lines. This modification results in a triangle. Thus ∇ represents ॐ and ∆ represents ♉ and it can be observed that one is a reflection of the other

The alphabet ✵ has two dots. Following the arguments for ॐ and ♉ , the symbol ✵ can be represented by V.

The alphabet ♈ consists of two portions. The modifier itself is an alphabet. . In this case ♈ meaning is conveyed by both the portions. These two portions are to be superposed to evolve a compact and unique symbol having minimum number of strokes, fluency in writing and still keeping the similarity with the original symbol. The reference line is joined to □ so that the new symbol appears as □. The extended portion stands for the reference line.

Group-III

This group has ♊, ♋, ♌ and ♍, The letters ♊ and ♌ have their Kufic equivalent as λ and Z respectively. There letters are retained with slight modifications the alphabet ♋ has two portions both containing information. Visual inspection shows that 7 i.e the initial portion of ♋ as well as the dots are the sources of info☐ation. Superposition of these two portions of leads to the symbol . For the sake of fluency in writing, it is written as Ƶ in which the original triangle, formed by the dot pattern, is inverted and superposed

In the case of ♍, information is contained in both portions. The alphabet ♍ is transformed into 7. Here, the acute angle is turned into the right

angle. The dot is absorbed by extending the flat top of the symbol inside

to save space and to facilitate writing. Thus, ♍ is transformed into 7. As there is no other such symbol the meaning can still be conveyed easily without absorbing the dot, as explained above. Hence, ♍ can be written as 7.

Group-IV

This group consists of ♎, ♏, and ♐ which have similar basic form except

the modifiers. Thus, modifiers are to be absorbed into the main body of the letters by superposition or otherwise. The symbol ⊃ has the form similar to Kufic, hence no modification is required. For ♏, according to the rule 6, the modifier ☐ is replaced by a bar and is superposed in such a way that the maximum distance with the near similar letters is maintained, while maintaining the similarity of the form. Therefore, ♏ becomes ⊇ . For the dot is absorbed into the main body of the alphabet and it takes the form ⊇ . Here, the distance between ⊃ and ⊃ is very short, but any drastic modification to increase the distance may lead to a completely different form.

Group-V

This group consists of ♑, ♒, ♓ and ☊. The Kufic form of the letters ♑ and ♓ is retained as they need no modification. The Kufic form for ♑ and ♓ are ♑ and ⌡ respectively in case of ♒ the modification is done using the rule 6. By adding a bar for ☐, ♒ becomes J.

For ☊ modification is required. .According to previous arguments, the three dots are to be replaced by a triangle, so ☊ becomes ♑ but in this case it lacks fluency in writing. A little thinking shows that it can be written as ℑ.

Group-VI

This group consists of ● and & the Kufic form of ● and & is used with slight modification. The ● and & are similar in form except

dots. The symbol ـسـ is suggested, for ●, where the extended line indicates three dots. Whereas, in case of & it is represented by ـسـ without any extension.

Group-VII

This group has two letters ص and ض . The Kufic form of ص will be ratained without any modification or as P. The difference between ص

and ض lies in a dot. Considering the similarities in the form, a way is to

be devised to absorb the dot in the main body. Keeping in view the fluency in writing, the dot is not absorbed in the upper portion of the alphabet, but a line is drawn in the lower portion to symbolize the dot. Hence ض is written as [illegible] . Though, this step is in contradiction to the rules framed above, but, the conditions of maximum distance and fluency is writing has forced to break the rule.

Group-VIII

The Kufic equivalent of ط is retained. Whereas in case of ظ the dot is absorbed by connecting with the main body. So ظ is transformed to [illegible]

Gorup-IX

This group has ع and غ. The present form of ع is retained without modicication, whereas, for غ the symbol ⊂ is adopted for the sake of distance between the two symbols.

Group-X

The group has two letters ف and ق . In this case Kufic versions will be adopted without any modification, but to further increase the distance between the symbols ف and ق a modification is suggested. From Table-1 it can be seen that the Kufic version of ف is 9 . This is composed of a circle and a line cutting the circle tangentially. Clearly, modified version of ف i.e ϕ which is quite distinct from و i.e ق

Group-XI

This group includes ک and گ . Visual inspection shows that the

information is contained in the first half portions of the letters i.e. ⍰ and F. Hence these portions will be taken as the modified forms of the symbols.

Group-XII

Rest of the letters is in this group. These are unique and distinct. It seems logical to select those Naskh or Kufic letters which satisfy the

conditions of maximum distance and fluency in writing. Table-I shows such a selection.

A modification is done in Naskh version of و and is ن written as O to distinguish it from ق . For ن either Kufic version can be adopted or the dot can be absorbed in the main body of the symbol. The joining line connecting the dot and the main body of the alphabet, can be turned inside or bent outside. Thus ن can be written as ע or ט.

For comparison, the current symbols (Aftab Hasan, 1985) are shown along with the proposed symbols in tables II to X.

Conclusion

An attempt is made here to develop upper and lower case symbols, using Arabic and subcontinent version of letters, to satisfy the need of symbols in Urdu scientific literature.

The simplification and compactness that results by the proposed symbols, is evident from the examples and are as effective as western system of symbols.

No translation of letters is recommended. The mathematical signs/symbols used internationally such as +, -, <,>, π, etc. are retained. Following the standard practice, vectors will be denoted by bold symbols. For unit vectors, a bar will be placed above the symbols. The principle of position will be used, as in the western system, to represent the power of a symbol. As regards numerical system, no change is proposed.

Acknowledgement

Thanks are due to Mr. Tariq Mahmood of BCCT for his interest in this work. Special thanks are due to Mr. Syed Ali Arif Rizvi of BCCT for his encouragement and useful discussion, which were held quite often during the preparation of this paper.

Table-I-A

GROUP	MODERN NASTALIQ	KUFIC2 MID PERIOD	KUFIC2 7th CENTURY	NASKH2 ERLY PERIOD	KUFIC3	SOUTH1 ARABIC	PROPOSED UPPER CASE	SY
	⌖	-	-	-	-	-	T	
I	🗁	آ	t - L	l - L	L t 𝓛	λ	|	
	☯	ـــ	ل	ـــ بـ	ـــ	٦	∪	
	ॐ	-	-	-	-	-	∇	
II	✵	-	صـ	♑-♐	ں	X	V	
	♈	-	-	-	-	-	ط	
	♉	-	-	-	-	8	Δ	
III	♊	ـــ	λ	>	λ	7	λ	
	♋	-	-	-	-	-		
	♌	صـ	N		N	Ψ	Ƶ	
	♍	-	-	-	N	ጀ	٦	
	⌘	[illegible]	[illegible]	y	-		[illegible]	
IV	♏	-	-	-	-	-	∋	
	♐	-	-	-	-	N	[illegible]	
	♑	-	-	-	-	♑	♑	
V	♒	-	-	-	-	-	J	
	♓	د	ل	J	د	X	د	
	er	-	-	-	-	-	[illegible]	
VI	&	سد	سد	سد	سد	┤	W	
	●	سد	سد	▤	عسر	≷	٦W	
VII	❍	ـ▭	P	ꝓ p	-	┬	p	
	■	-	-	-	-	⊟	ꝑ	

Table-I-B

GROUP	MODERN NASTALIQ	KUFIC2 MID PERIOD	KUFIC2 7th CENTURY	NASKH2 ERLY PERIOD	KUFIC3	SOUTH1 ARABIC	PROPOSED UPPER CASE	SYMBOL CASE
VIII	☐	b	b	b	b	◫	b	
	◘	-	-	-	b	⚲	ƃ	
IX	❑	Z ጀ	ـعـ	۶ ع	ع γ	O	∈ ∈	
	❒	-	-	-	-	π	⊂	
X	•	g	ـــ	و	و	◊◊	[illegible]	
	♦	g	ـــ	ۇ	و	♁ ∅	[illegible]	
XI	◆	ط	ط	ط	ط	╒	Γ	
	❖	-	-	-	-	-	F	
	⬩	ر ل	ل	ر ل	ل	1	[illegible]	
	☒	-O-ꝓ	ـو	-O-ꝓ	-O-	[illegible]	ꝓ	
	⊠	ر ر	[illegible]	ں ڷ	┘	N৸	[illegible]	
	و	𝒥	و	و	و	∞ ⊕	O	
	ه	Φ, 𝒥, d	d	[illegible] Φ α	d ϕ	ᛘ	d	
	ھ	-	-	-	-	-	θ	
	ی		[illegible]	[illegible]	ς	♀	s	

References

Gelb, I .J . (1954). " A study of writing: The Foundations of Grammatology", pp. 136-37, Routledge and Kegan Paul, Ltd. London.

Siddiqui, M. I. (1962). "Fan-e-Tahrir Ki Tarikh", p.208, Anjuman-e-Tarriqqi-e-Urdu, Aligarh.

Dringer, D. (1953, 1968). "The Alphabet: A key to the History of Mankind", 2nd Ed. Pp.209-76. 3rd Ed. Vol.2, p.205, Hutchinson's Scientific and Technical Publications, London.

Aftab Hasan "Science aur Risazi Ki Darsi Kitabain" Bureau of Composition, Compilation and Translation, University of Karachi, Karachi.

Abstract

The principles of superposition (linear and non-linear), rotation and reflection are defined and applied to Arabic and sub-continental version of letters to generate a system of symbols for use with Arabic-script orientated languages as mathematical symbols.

The letters used in any alphabet are in fact symbols and every letter is a symbol for a specific sound. While writing scientific papers with symbols in the languages that have adopted Perso-Arabic script, writers are faced with certain difficulties. Similarly, translating scientific material into these languages poses problems as far as the use of scientific symbols is concerned. In order that these difficulties are addressed to and a reliable system of symbols which writers can agree upon may be developed, this paper tries to give some rules for developing Urdu scientific symbols.

A Study of Relationship between

Foreign Language Anxiety and Emotional Intelligence among University Students

Riffat-un-Nisa Awan *1
Azim Sabir *2
Sara Iqbal *3

Key Terms: Foreign language anxiety, emotional intelligence and EFL-English as a foreign language

Introduction

Learning another language gives the learner a chance to know the other
culture with its context. In this human race, nations and people are more dependent upon one another to supply goods and services, share
Learning a foreign language involves interest, time and effort. Having a clear idea of why learning a language is important, may help in improving the motivation to study. Language learning is a difficult process. Fundamental issues such as components of language, cognition, learning behaviors, previous language experience, learners' personality, classroom conditions, culture, and teacher's personality with his / her language proficiency skills and teaching metholodgy are addressed in this process. This paper considers the literature on language learning anxiety in an effort to explain the relationship between foreign language anxiety and emotional intelligence. This study explores factors that may influence foreign language learning. This paper concludes that anxiety is indeed a cause of poor language learning in some individuals and discusses the possible sources of anxiety including difficulties in valid self-presentation and various language teaching practices.

*1 Assistant Professor Department of Education, University of Sargodha, Pakistan
*2 M. Phil. Scholar International Islamic University, Islamabad
*3 M. Phil. Scholar International Islamic University, Islamabad

Foreign Language Anxiety

Anxiety can be defined as a subjective feeling of tension, apprehension, uneasiness, and stress. The term "foreign language anxiety" was coined by Horwitz, and Cope (1986) as a specific anxiety affecting the learning of a second language. MacRityre and Gardner (1991) generally define foreign language anxiety as a type of situation-specific anxiety that is specifically associated with second language contexts in speaking, listening, and learning. Horwitz and Cope (1986) describe foreign language anxiety as a distinct complex phenomenon of "self-perceptions, beliefs, feelings, and behaviors related to classroom language learning arising from the uniqueness of the language learning process".

Anxiety plays different roles in the foreign language learning process. According to MacIntyre (1995), when the task is simple, anxiety may stimulate students to increase efforts toward learning. Students' performance is therefore improved by the anxiety. Anxiety is "facilitating" at this stage. Once efforts cannot fully compensate for the cognitive interference, performance will be impeded. Anxiety causes negative influence at this stage and becomes "debilitating" (MacIntyre, 1995). As a result of debilitative anxiety, students may face depression and lead to skip classes or drop out. These facilitative and debilitative anxieties vary among individuals.

Horwitz, and Cope (1986) developed the Foreign Language Classroom Anxiety Scale (FLCAS) to draw attention to three performance related anxieties: communication apprehension, test-anxiety, and fear of negative evaluation. According to Horwitz, and Cope (1986), the first source of anxiety in their self-report questionnaire, the Foreign Language Classroom Anxiety Scale (FLCAS) is communication apprehension. It mostly happens while students listen to or speak the foreign language. Those who are shy encounter more difficulties in oral communication in the foreign language than those who are not.

The second source of anxiety that Horwitz and Cope (1986) try to investigate in their FLCAS study is test anxiety. To the authors, test anxiety causes performance anxiety, which is triggered from a fear of failure in the foreign language classroom. Finally, Horwitz, and Cope (1986) support Watson and Friend's (as cited in Horwitz, & Cope,

1986) definition of fear of negative evaluation as being the last component of FLCAS. Watson and Friend's assert that fear of negative evaluation is an apprehension about others' evaluations, avoidance of evaluative situations, and the expectation that others would evaluate them negatively.

Emotional Intelligence

The concept of emotional intelligence first had great appeal in business communities during the past decades. The term was first proposed in 1990 by Peter Salovey and John Mayer and refers to the ability to recognize and regulate emotions in one self and in others (Golernan, 1995). Daniel Goleman (1995, as cited in Santrock's, 2001, p.114) in his book *Emotional Intelligence*, argues that when it comes to predict a student's competence, IQ as measured by standardized intelligence tests can matter less than emotional intelligence.

What is emotional intelligence? Emotional Intelligence consists of emotional self-awareness (such as, separating feelings from actions), managing emotions (such as, controlling anger), reading emotions (such as, taking the perspective of others), and handling relationships (such as, solving relation problems). Mayer and Salovey (1990) defined emotional intelligence as the subset of social intelligence that involves the ability to monitor one's own and others' feelings and emotions, to discriminate among them, and to use this information to guide one's thinking and action.

Sternberg (1996) proposed the theory of "successful intelligence." He stated that successful intelligence involves an individual's discerning his or her pattern of strengths and weaknesses, and then figuring out ways to capitalize upon the strengths and at the same time to compensate for or correct the weaknesses. He further suggested that in order to have successful intelligence, one should have three broad abilities: analytical, creative, and practical. Analytical abilities help an individual to identify the existence of a problem, by defining the nature of the problem, setting up a strategy for solving the problem, and by monitoring one's solution processes. Creative abilities enable a person to generate problem solutions, and the practical abilities are one's tacit knowledge which enables one to accomplish things. According to Sternberg's theory of successful intelligence, students' multiple abilities can be used to predict their school achievement.

Within the construct of multiple intelligences, Gardner (1993, 1998) included linguistic intelligence, musical intelligence, logical-mathematical intelligence, spatial intelligence, bodily-kinesthetic intelligence, inter-personal intelligence and intra-personal

intelligence. He suggested that multiple intelligences should have the same weight as IQ. Gardner (1998) further defined interpersonal intelligence as a person's capacity to understand the intentions, motivations, and desires of other people and to work effectively with others. In addition, Gardner believes that intra-personal intelligence involves the capacity to understand oneself, to have an effective working model of oneself—including one's own desires, fears, and capacities. Gardner's two intelligences correlate with Salovey and Mayer's (1990) theory of emotional intelligence. The two intelligences have an influence on one's academic achievement.

While most of the researchers have attempted to understand some aspects of emotional intelligence and its impact on foreign or second language learning, whereas many others have focused on the effects of stress management and self-esteem on emotional intelligence. For instance, Deffenbacher (1980) found that worry and emotionality are inter-correlated with test anxiety. Ganschow and Sparks (1996) suggested that anxiety has negative results on language skills and aptitude. More recently, the idea of emotional intelligence has become an issue in second language learning and much focus is now being paid to this study.

If teachers are concerned with helping students develop their second language ability, they may also want to address and improve students' emotional intelligence skills. Through the use of appropriate emotional intelligence skills, one can apply his or her judgment and reasoning to deal with anxious situations. Once the 'danger signal' (Elder, 1997) or 'the internal earthquake' (Watkins & Karr, 1940) arising from encountering special situations is off, the speed of language learning will be accelerated.

Objectives of the Study

The main objective which guided this study was to explore the level of anxiety among EFL (English as a foreign language) students and find the relationship between foreign language anxiety and emotional intelligence among EFL university students in Sargodha.

Methods

The research was done at five departments using convenient sampling

in the University of Sargodha with undergraduate students in January-February 2007. Subjects for this study were a group of one hundred and seventeen (117) students who were enrolled in English reading, writing, listening, and speaking classes in first

semester. Of the 117 students, 62 (53%) were male and 55 (47%) were female. Table1 presents the demographic information of the sample according to the categories of department as well as gender.

Table 1

Number of Subjects by Departments and Gender

	Male (n=62)	*Female (n=55)*	*Total*
Mathematics	22	10	32
Zoology	05	17	22
English	14	13	27
Business Study	04	04	08
Chemistry	17	11	28
Total	62	55	117

Instrumentation

To determine whether foreign language anxiety has any correlations with students' emotional intelligence, two instruments were used: Foreign Language Classroom Anxiety Scale (FLCAS) and Self Assessment (SA) scale of emotional intelligence.

The Foreign Language Classroom Anxiety Scale was developed by Horwitz, and Cope (1986). The Likert-type scale consists of thirty-three statements about foreign language learning. An abbreviated version of 'Foreign Language Classroom Anxiety Scale' consisted of seventeen items was used. The modified Foreign Language Classroom Anxiety Scale was pilot tested and its reliability was (.75) alpha coefficient. The scoring of the FLCAS was done at five (5) point scale where five indicates high anxiety and one (1) means that anxiety didn't exist (E. K. Horwitz, personal communication, July 16th, 2007).

The other instrument that was used in this study is Santrock's (2001) Self Assessment (SA) scale of emotional intelligence based on Daniel Goleman (1995) definition of emotional intelligence. The emotional intelligence profile of participants was developed via the standards that the author provided in his book *Educational Psychology*. The instrument has been shown to have a relatively high validity and reliability in terms of its alpha coefficient (.71).

Data Analysis

The purpose of this study was to identify students' foreign language anxiety level and their emotional intelligence and to determine whether there were any correlations between foreign language anxiety and emotional intelligence. SPSS 12.0 (Statistical Package for Social Sciences) was used to calculate Pearson Product Moment Correlation Coefficient. The data set was organized for analysis according to the original research questions.

Results

The collected data were grouped by gender and level of foreign language anxiety. Students whose score was 60 or above were judged to be highly-anxious; those whose score was 30 or above but below 60 were judged to be average-anxious; those whose score was below 30 were judged to be low-anxious. Based on the FLCAS results, males and females were scored according to the categories of high, average, and low anxiety. The distribution of high, average and low language anxiety by gender is demonstrated in the following table.

Table 2

Number of Subjects by Gender and Level of Anxiety

Gender	*Male*	*Female*	*Total*

Anxiety Level	N	Percent	N	Percent	N	Percent
Highly Anxious	6	9.7%	4	7.3%	10	8.5%
Average Anxious	56	90.3%	51	92.7%	107	91.5%
Low Anxious	0	0%	0	0%	0	0%
TOTAL	62	100%	55	100%	117	100%

For the purposes of this study, an overall language anxiety level was presented followed by gender comparison. It was observed that only ten percent of the total sample was highly anxious, while all others which is a bulk i.e. about 92% rated themselves as moderately anxious because the students were forced to study this course (English language course) as a degree requirement. No students were low anxious which means every student was anxious to a certain level.

Table 3

Descriptive Statistics for Foreign Language Classroom Anxiety Scores (FLCAS) by Gender

	Mean	S.D.	Maximum	Median	Minimum
All	48.60	9.02	71	49	27
Male	49.77	8.56	71	48.5	28
Female	47.27	9.42	67	49	*27*

Table 3 gives descriptive statistics for Foreign Language Classroom Anxiety Scores (FLCAS) by Gender which makes it clear that the mean scores of both males and females were slightly different since the males were more anxious than females.

Table 4

Pearson Product Moment Correlation Coefficient (r) of foreign language anxiety and Emotional Intelligence

Variables	*N*	*Correlation Coefficient (r)*	*R^2*	*Sig*
Foreign Language Anxiety & Emotional Intelligence	117	-.24*	0.058	.009

* Correlation is significant at the 0.01 level (2-tailed).

The results in Table 4 reveal that there is a significant Correlation between foreign language anxiety and Emotional intelligence (r =-.24, p = .009) at 0.01 level of significance which means that the more the students are emotionally intelligent and stable, the less they have anxiety in learning English language.

Table 5

Comparison of Emotional Intelligence and Language Anxiety according to levels of anxiety (paired samples t-test)

	N	*EI (Mean)*	*LA (Mean)*
High Language Anxiety (Male)	6	58.50	64.83
Ave. Language Anxiety (Male)	56	60.60	48.16
High Language Anxiety (Female)	4	63.25	64.25
Ave. Language Anxiety (Female)	51	62.02	45.94

From Table 5, it is apparent that high foreign language anxiety students and average foreign language anxiety students are different in terms of Emotional Intelligence. Average anxiety group is significantly different from high anxiety group in terms of their emotional intelligence across both genders. In other words, the average level of foreign language anxiety group has better control over their Emotional Intelligence skills. However, the high level of foreign language anxiety group shows less ability in controlling emotional intelligence.

Table 6

Patterns of Correlation between Foreign Language Anxiety and Emotional Intelligence according to Gender and Levels of Anxiety

	N	*E I (Mean)*	*LA (Mean)*	*r*
Male	62	60.40	49.77	-.320*
Female	55	62.11	47.27	-.138
High Language Anxiety (Male)	6	58.50	64.83	.253
Average Language Anxiety (Male)	56	60.61	48.16	-.365**
High Language Anxiety (Female)	4	63.25	64.25	-.004
Average Language Anxiety (Female)	51	62.02	45. 94	-.194

* Correlation is significant at the 0.05 level (2-tailed)

**Correlation is significant at the 0.01 level (2-tailed)

Table 6 reveals that both genders have different patterns in terms of controlling their

emotional intelligence skills. Few exceptions were found. Correlations computed for foreign language anxiety and emotional Intelligence scores show a significant correlation for males (r =-0.320, p = .011) at the 0.05 level and for females (r = -.138, p = .317) which is not significant. For three categories of language anxiety, the correlation value for the "average anxiety males" was significant at .01 level of significance.

Findings

1. Almost all the subjects of the study have a certain levels of language anxiety in learning a non-Asian Language (English).
2. The subjects of the study seem to have relatively good control over their emotional intelligence (N = 117, mean = 61.2051, Std. dev. = 7.55).
3. The male subjects of the study are more anxious (n = 62 mean = 49.72, Std. dev. = 8.56) about foreign language as compared to females. (n = 55, Mean = 47.27, Std. dev. = 9.42). Although, the difference is not too large.
4. The female subjects of the study are more emotionally intelligent (mean = 62.11) as compared to males (mean = 60.40). Although, the difference is not so great.
5. A significant correlation (r = -0.242, p = .009) at the .01 level has been found for the study sample (N = 117) between language anxiety and emotional intelligence.
6. A significant correlation (r = -0.320, p = 0.11) at the 0.05 level has been found for male population of the study (n = 62) between language anxiety and emotional intelligence.
7. A weak correlation (r = -1.38, p = .317) has been found for female population of the study (n = 55) between language anxiety and emotional intelligence.

Discussion

This study is about the role of language anxiety and emotional intelligence in learning English as a foreign language (EFL) by the students in University of Sargodha whom first language is Punjabi or Urdu.. In order to gain insights into foreign language learning, this study discussed two components, foreign language anxiety and emotional intelligence, and attempted to explore how their relationship may influence foreign language learning.

Foreign language anxiety arises when learners are exposed to an unfamiliar language environment. It is observed that foreign language anxiety is one of the most important

predictors of language acquisition. Evidence shows that students with high levels of foreign language anxiety with low emotional intelligence tend to experience more anxiety in target language activities (MacIntyre & Gardner, 1991).

Language serves as a tool for communication which communicates our thoughts through different channels such as terms, pictures, or other symbols. When one's emotional intelligence skills are low, one's communication may be repressed by anxiety. Therefore, the concern of language anxiety and emotional intelligence skills becomes more and more significant in foreign language learning and teaching.

In this study, the first research question explored students' foreign language anxiety level in University of Sargodha at undergraduate level. The results suggest that the subjects of this study seem to have relatively higher language anxiety in learning a non-Asian foreign language. In addition, most of the subjects' emotional intelligence (EI) falls into the 'Strengthen' range of EI, and the overall subjects' control over EI is slightly good.

Research question two attempted to discover the relationship between foreign language anxiety and emotional intelligence. The major findings of this exploratory study suggested that EI negatively but significantly correlate with foreign language anxiety.

The results reveal that students with high level of foreign language anxiety have less control of their EI. On the other hand, students with

average level of foreign language anxiety tend to employ their EI better.

In essence, the findings of this study suggest that EI skills have a strong relationship with foreign language anxiety across both genders. In addition, compared to females, males have high correlation between Foreign Language Anxiety and EI.

In short, the first step to remove obstacles from second language acquisition is to lower one's foreign language classroom anxiety which leads to increased learning. Furthermore, building one's social interactions will create opportunities for employing the target language and strengthen one's second language competence. Emotional intelligence plays a crucial role in achieving this purpose.

Conclusion and Recommendations

Data analysis of this study revealed the fact that students did experience a certain level of language anxiety as foreign language learning is an extremely multifaceted and

complex matter, resulting from the interaction of language with the learning process, and its parallel EI skills. To know students better by understanding their foreign language anxiety level and their parallel EI skills is very important and necessary for providing suitable assistance to students' learning a foreign language. Moreover, to reinforce students' EI skills would, in turn, raise their self-confidence and reduce their levels of foreign language anxiety, and reinforce their efficiency in learning the target language.

This study made it clear that emotional intelligence skills were significant factors in language learning. Evaluative programs planned to improve foreign language learning are strongly recommended and it is believed that these programs may be improved by focusing on emotional intelligence skills development.

The findings of this study suggest that to develop students' EI skills educators should be aware of the impact that students' EI skills have on foreign language learning. These skills need to be developed to assist the student's aptitude for learning a foreign language. Therefore, curricular or any educational intervention should be based on the relationship between EI and language anxiety. To this end, curriculum developers, educators, and all stake holders need to be aware of the impact one's emotional intelligence has on language learning specifically and academic learning in general. Moreover, this research explored only the level of anxiety; it was felt that qualitative approaches may be adopted by the researchers to explore in depth the factors and the reasons behind this high level of anxiety and how this anxiety could be minimized for effective foreign language learning. In essence, language learning, language teaching, language anxiety, and emotional intelligence are complex constructs that need further research and in-depth investigation.

REFERENCES

Cummins, J. (1984). *Bilingualism and special education: Issues in assessment and pedagogy.* San Diego, CA: College-Hill

Deffenbacher, J. L. (1980). Worry and emotionality in test anxiety. In I. G. Sarason (Ed.), *Test anxiety: Theory, research, & applications* (pp. 111-128). Hillsdale, NJ: Erlbaum.

Elder, L. (1997). Critical thinking: The key to emotional intelligence. *Journal of Developmental Education, 21* (1), 40-41.

Ganschow, L., & Sparks, R. L. (1996). Anxiety about foreign language learning among high school women. *Modern Language Journal, 80* (2), 199-212.

Gardner, H. (1993). *Frames of mind: The theory of multiple intelligences* (2nd ed.}. New York: Basic Books.

Gardner, H. (1998). Are there additional intelligence? The case for naturalist, spiritual, and existential intelligences. In J. Kane (Ed.), *Education, information, and transformation* (pp. 111-131). Englewood Cliffs, NJ: Prentice-Hall.

Ghaith, G. M. (2002). The relationship between cooperative learning, perception of social support, and academic achievement. *System, 30* (2002), 263-273.

Goleman, D. (1995). *Emotional intelligence.* NY, NY: Bantam Books.

Goleman, D., Boyatzis, R., & McKee, A. (2002). *Primal leadership: Realizing the power of emotional intelligence.* Boston, MA: Harvard Business School Press.

Gregersen, T., & Horwitz, E. K. (2002). Language learning and perfectionism: Anxious and non-anxious language learners' reactions to their own oral performance. *The Modern Language Journal, 86* (iv), 562-570.

Harper, S. N. (1985). Social psychological effects of simulation in foreign language learning. *System,* 73(3), 219-224.

Horwitz, E. K. (1986). Preliminary evidence of the reliability and validity of a foreign language anxiety scale. *TESOL Quarterly, 20,* 559-562.

Horwitz, E. K., & Cope, J. (1986). Foreign language classroom anxiety. *Modern Language Journal, 70,* 125-132.

Maclntyre, P. D. (1995). How does anxiety affect second language learning? A reply to Sparks and Ganschow. *Modern Language Journal, 79,* 90-99.

Maclntyre, P. D., & Gardner, R. C. (1991). Investigating language class anxiety using the focused essay technique. *The Modern Language Journal, 74* (iii), 296-304.

Maclntyre, P. D., & Gardner, R. C. (1994). The subtle effects of language anxiety on cognitive processing in the second language. *Language Learning, 44,* 283-305.

MacIntyre, P. D., Noels, K. A., & Clement, R. (1997). Biases in self-ratings of second language proficiency: The role of language anxiety. *Language Learning, 47* (2), 265-287.

Mayer, J. D., & Cobb, C. D. (2000). Educational policy on emotional intelligence: Does it make sense? *Educational Psychology Review, 12(2),* 163-183.

Mayer, J. D., & Geher, G (1996). Emotional intelligence and the identification of emotion. *Intelligence,* 22, 89-113.

Mayer, J. D., & Salovey, P. (1990). Emotional intelligence. *Imagination, Cognition and Personality,* 9(3), 185-211.

Mayer, J. D., & Salovey, P. (1995). Emotional intelligence and the construction and regulation of feelings. *Applied & Preventive Psychology,* 4, 197-208.

Salovey, P., & Mayer, J. D. (1990). Emotional intelligence. *Imagination, Cognition and Personality, 9* (3), 185-211,

Santrock, J.W. (2001). *Educational Psychology* (International Edition). McGraw-Hill, Companies Inc, NY.

Sternberg, R. J. (1996). *Successful intelligence,* NY, NY: Simon & Schuster.

Watkms, D. E., & Karr, H. M. (1940). *Stage fright and what to do about it.* Boston, MA: Expression Company.

Abstract

The main spirit of this study was to examine the association between foreign language anxiety and emotional intelligence among university students who were learning English as a foreign language in University of Sargodha. The research was done in January-February 2007 in five departments (using convenient sampling) at undergraduate level. The sample population for this study was 117 BS students (62 males and 55 females). Data for the study were collected by using the research instrument that determines levels of foreign language anxiety and emotional intelligence. Descriptive statistics, comparisons of means, and Pearson-moment

correlation coefficient were applied to examine the relationship between foreign language anxiety and emotional intelligence across gender and language anxiety level. The findings indicated that there is a significant relationship between foreign language anxiety and emotional intelligence. Results also suggest that gender differences have an impact on emotional intelligence and language anxiety.

Me'yar: Academic and Research Journal, Department of Urdu, IIUI, Vol: 1, No: 1, Jan-Jun 2009

The Source Material in Modern South Asian Languages

Arabic, Persian and Urdu Sources in The European Libraries

By: ***Me'yar***

Contents

Preface

Following is a select list of "The Source Material in Modern South Asian Languages, Arabic, Persian and Urdu in the European Libraries." These sources were consulted by this compiler in several visits of major libraries, prominent for their oriental collections, in Europe.

The aims and objects of these visits were to compile a list of sources inevitable in the study of South Asian topics related with the history and culture. Thus, these sources cover and help mostly in the studies in South Asian Muslim culture and history and related areas.

Although, here are some 'Catalogue of Catalogues' And 'Bibliography of Bibliographies' available on the subject, this list contains the entries of material personally consulted by the compiler and found more or less useful on the subject concerned and on its related aspects.

1- ***Bibliographic survey of Source Materials:***

Awwad, Kurkis., 1984. *Faharis al Maxtutat al Arabiya fi'l a'lam*. 2 vols. Kuwait.

Banerjee, D.L., 1963. *Index Translationum Indicarum: A Camulation of entries for India in 'Index Translationum'*. Vols 2-11. Paris.

Besterman, T.1939. *A world Bibliography of Oriental Bibliographies*. London. Rev. by Pearson, J.D., New Jersey, 1975.

Birnbaum, Eleazer., 1983-84. *Turkish manuscripts cataloguing since 1960 and manuscripts still uncatalogues*. Part 2: Yugoslavia, Bulgaria, Romania, . Part 4: Hugary, Czechslovakia, Poland, Great Britain, Ireland, The Netherlands, Belgium, France, Germany, Switzerland, Austria, Italy, Finland, United States. In: *Journal of the American Oriental Society*. Nos. 10, 103.

Biswas, S.C., 1998. *Bibliographic Survey of Indian Manuscript Catalogues. Being a Union List of Manuscript Catalogues*. Delhi.

Campbell, F.B.F., 1897. *An Index Catalogue of Bibliographical works relating to India*. London.

Geddes, C.L., 1985. *Guide to Reference Books for Islamic Studies*. Denver.

Gidwani, N.N. and Navalani, K., 1974. *A Guide to Reference Materials on India*. Jaipur.

Gupta, B.M., 1994. *South Asian Bibliography and Documentation*. 13 vols. New Delhi.

Hebson, A., 1970. *Great Libraries*. London.

Huisman, A.J.W., 1967. *Les Manuscrits Arabes dans le monde: une Bibliographie des Catalogues.* Leiden.

Khan, Shafaat Ahmed., 1926. *Sources for the History of British India in the seventeenth century*. London.

Mikhailova, I.B. and Khalidove, A.B., 1982. *Bibliographiya Arabskikh Rukopisei.* Moscow.

Nunn, G.R., 1980. *Asia: Reference Works, a Select Annotated Guide.* London.

Patterson, M.L.P. and Indes, R.B., 1962. *South Asia: an Introductory*

Bibliography. Chicago.

Pearson, J.D., 1958-96. *Index Islamicus. Several pts and suppls.*

Cambridge.

------------------1966. *Oriental and Asian Bibliography: an Introduction with some References to Africa.* London.

Pritcherd, A.P, 1976. *An Idex of Articles in the British Museum Quarterly on Material in the Department of Oriental Manuscripts and Printed Books*. In: *British Library Journal* 2. pp. 133-37.

Roman, Stephan., 1990. *The Development of Islamic Library Collections in Western Europe and North America*. London.

Roper, Geoffrey. (Ge. ed.), 1992-94. *World Survey of Islamic Manuscripts*. 4 vols. London.

Salih, Alich., 1969. *International Bibliography of the History of Religion*. Leiden.

Sauvaget, Jean. 1965. *Introduction to the History of the Muslim East: a Bibliographical Guide.* Los Angles.

Sezgin, Fuat. 1990-95. *Bibliographie der Deutschsprachigen Arabistic und Islamikunde.* 21 vols. Frankfurt.

Steele, Colin., 1976. *Major Libraries of the World: A selective Guide*. London.

Storey, C.A., 1927-97. *Persian Literature: A Bio- Bibliographical Survey*. 5 vols. London.

Vajda, G. and Durantet, M., 1949. *Repertoire des Catalogues et inventaires des manuscrits Arabes*. Paris.

Zenker, J.T., 1846-61. *Bibliotheca Orientalis: Manuel de Bibliographie Orientale*. 2 vols. Leipzig.

2. *Unpublished Sources:*

a. *Catalogues of Printed Books*

Classified list of about two thousand books in the Library of Munshi Muhammad Hasan of Kanpur. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. Fol. 1-28 and 39-56.

Classified list of Arabic and Pesian Books in the Library of the Raja of Benaras. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. Fol. 29-38.

Fihrist i Kitabha. A Catalogue of Persian, Arabic and Urdu books in the

Library of Ferzada Kole. Nastalix. fol. 96. 15 lines. 9 by 6 cm. preserved in 'Royal Asiatic Society, London'. (M.Ms. Cat. 162A.)

Lists of Books in various Libraries belonging to Saiyad Shah of Marharah, Rae Todarmal of Patna, Hafiz Muhammad Husain of Lucknow, Ali Muhammad Khan of Jhajjar, Hakim Nizamuddin Husain of Bandah, Siraj al Mulk of Hayderabad, Navab Dilavar jang of Farrukabad, Raja Guran Singh of Banaras. Preserved in the British Museum, London. Or. 2066. fol. 128-167.

List of Books in the Library of Xadim Husain Xan, Sadr as Sudur in Kanpur. Preserved in the British Museum, London. Or. 2064. fol. 46.

List of 2780 volumes in the Library of Raja Ratan Singh of Bareli. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 77-101.

b. *Catalogues of Manuscripts*

A Catalogue of Oriental Manuscripts in the Library of the College of Fort William (Calcutta). Comp. before 1812. fol 110. 13 lines. 10.5 by 7.75 in. preserved in the British Museum, London. Add. 24,042.

A Catalogue of Persian, Arabic and Hindi Manuscripts in the Library of Munshi Ram dayal (of Ilahbad?). before 1817. Nastalix. Fol 37. 10.5 by 6.5 in. preserved in the British Museum, London. Add. 25,864.

A list of Manuscripts belonging to Mulla Firoz, son of Mulla Kaus. Preserved in the British Museum, London. Or. 2071. fol. 10.

Alphabetical list of Manuscripts in a Library of Hayderabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 70. fol. 24.

Classified list of Arabic and Persian Manuscripts in the Library of Ali Muhammad Xan, Navab of Jhajjar, at Khtauli. Preserved in the British Museum, London. Or. 2063, fol 1-9, 12-68.

Classified list of Manuscripts in the Library of Kausji Faridunji Marzubanji of Bombay. Preserved in the British Museum, London. Or. 2064. fol. 97-105.

Classified list of Manuscripts in the Library of Maharao Savai Bani Singh, Raja of Alwar. Preserved in the British Museum, London. Or. 2072. fol. 24.

Descriptions of Historical Manuscripts in a Library in Lucknow. Preserved in the British Library, London. Or. 2066. fol. 101-127.

Descriptions of Manuscripts belonging to Janki Parshad, Meer Munshi of Lucknow Residency. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 156-159.

Description of Manuscripts belonging to Saiyed Niyaz Ali Tahsildar of Shamsabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 140-145.

Descriptions of Manuscripts in the Library of Saiyyad Muhammad Ali Xan Musavi Safavi of Shamsabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 57-61.

Descriptions of Miscellaneous Manuscripts, containing mostly Sufi works, in a Lucknow Library. Preserved in the British Museum, London. Or. 2066. fol. 1-54.

Descriptive list of Historical Manuscripts in the Library of Navab of Carnatic. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 160-161.

Descriptive list of Historical Manuscripts belonging to Saiyyad Ahmad Xan. Preserved in the British Museum, London. Or. 2064. fol. 70-76.

Detailed list of manuscripts belonging to Zainuddin of Muradabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2064. fol. 85-87.

Fihrist Kitabxana-e Acche Sahab of Marhara. Preserved in the Bodliean Library, Oxford. Per. Ms. Ousley, Add. 10.

Fihrist Kitabxana-e Navab Muneer al mulk Bahadur. Preserved in the Bibliotheque Nationale, Paris. Indien 838.

Fihrist Kitabxana-e Sarkar Daulat Madar (Moti Mahal?). Preserved in the British Library, London. Or. 2066. fol. 55-100.

Fihrist i Kutub Kitabxana Sirkar. A Catalogue of the Oriental Manuscripts in the College of Fort William. 1813. Nastalix. fol. 138.9 lines. 10 by 8.5 cm. Preserved in 'Royal Asiatic Society, London'. M.Ms.Cat. 162.

Historical Manuscripts in the Libraries of Ameer Al Daulah, Hussam alMulk and Sharaf al Umara' of Carnatic. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 67-70.

List of Historical Manuscripts in the Libraries belonging to Mirza Ali Akbar of Illahbad, Tahsildar of Damoh, Raja Bhup Sigh of Patna, The late Maulvi Muhammad Basit of Qannauj, Shams al Umara' of Hayderabad, Maulvi Muhammad Husain of Hayderabad, Maulvi Karamat Ali, Nazim-e Adalat, Muneer al Mulk, Nasrullah Xan, Deputy collector of Aligarh, Ja'far Ali, Meer Munshi, Gawaliyar, Saiyad Vahid Ali, Sadr Baxshi, Koel, Maulvi Hayder Ali, Faujdar Muhammad Xan and Sikandar Begam of Bhopal. Preserved in the British Museum, London. Or. 2067. fol. 1-29, 30-37.

List of Manuscripts belonging to Cunni Lal of Delhi. Preserved in the British Museum, London. Or. 2064. fol. 47-61.

List of Manuscripts belonging to Madhu parshad. Preserved in the British Museum, London. fol. 89-93.

List of Manuscripts belonging to Raja of Tirooa, Faruxabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 160-163.

List of Manuscripts in some private Libraries in Hayderabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 133-134.

List of Manuscripts in some private Libraries in Hayderabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 164-165.

List of Manuscripts in the Library of Nazim of Murshidabad. Preserved in the British Museum, London. Or. 2064. fol. 62-63.

List of Manuscripts in the Library of Qazi Jivan of Dajal. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 73-76.

List of Manuscripts in the Library of Raja of Bhuj. Preserved in the British Museum, London. Or. 2069. fol. 6.

List of Manuscripts in the Library of Raja Ratan Singh of Bareli. Preserved in the British Museum, London. fol. 1-45.

List of thirty two Manuscripts in the Library of the Emperor of Delhi. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 71-72.

Lists of Historical Manuscripts in the Libraries of Meer Ali Murad, Ziyauddin Xan of Delhi, Muhammad Raziuddin, Sadrus sudur of Hayderabad,Shams al Mulk, etc. Preserved in the British Museum, London. Or. 2073. fol. 40-64.

Lists of Manuscripts in various Libraries in Lucknow. Preserved in the British Museum, London. Or. 2068. fol. 1-4.

Lists of Royal Library of Bijapur. Preserved in the Bibliotheque Nationale, Paris. Indien 838.

Notices of Historical Manuscripts in a Library of Delhi. Preserved in the British Museum, London. Or. 2065. fol. 102-133.

Notices of Miscellaneous Manuscripts in the Libraries of Bareli. Preserved in the Britiush Museum, London. Or. 2068. fol. 5-45.

Sabir Ali, Sayad. Kaifiyat un Nasx: Notices of Manuscripts in the Library of the Mullas of Thatta. Preserved in the British Museum, London. Or. 2073. fol. 3-33.

3. ***Published Sources:***

a) *Catalogues of Printed Books*

Arberry, A.J., 1937. *Catalogue of the Library of the India Office*. Vol II, pt VI, Persian Books. London.

Asher & Co. 1866. *Catalogue of Oriental Literature*. London.

Baer, J. & co., 1895. *Bibliotheca Indica.* Frankfurt.

Binark, Ismet and Eren, Halit., 1986. *World Bibliography of Translations of the Meanings of the Holy Qur'an: Printed Tranlsations,* 1515-1980. Istanbul.

Blumharadt, J.F., 1900. *Catalogue of the Library of the India Office*. Vol II, pt. II, Hindustani Books. London.

-------------------1889. *Catalogue of Hindustani printed Books in the Library of the British Museum.* London.

Campbell, F. B.F., 1900. *Index Catalogue of Indian Official Publications in the Library of the British Museum*. London.

Chauvin, V., 1922. *Bibliographie des Ouvrages Arabes ou Relatifs aux Arabes Publies Danes l'Europe Chretienne de 1810-85*. 12 vols. Leipzig.

Chijs, J.A. van der., 1875-79. *Prove eever Nederland Indische Bibliographie, 1659-1870*. Batavia.

Cumming, J.G., 1927. *Bibliography relating to India, 1900-1926*. London.

Dogra, R.C., 1988. *Catalogue of the early printed books on South Asia from 1586 to 1864 in the Library of the School of Oriental and African Studies, London.* London.

Edwards, E. 1922. *A Catalogue of the Persian Printed Books in the British Museum*. London.

Ellis, A.G., 1894-1935. *Catalogue of Arabic Books in the British Museum*. 3 vols. London. rep. 1967.

Evans, M. & Co., 1891. *Bibliothequa Orientalia or Literature of the East. No.8: A Catalogue of Books relating to India and the East.* London.

-------------------1892. *India and the East: A Catalogue of Books.........relating to India and adjoining countries.* London.

-------------------1892. *A Catalogue of Books………… containing of Voyages and Travels….. including a collection of works on Indian Mutiny of 1857-58*. London.

Francis, F.C., 1951. *Catalogues of the British Museum: Oriental Printed Books and Manuscripts.* London. rev. and enl. 1959.

Fluegel, G. ed., 1835-58. Lexicon *Bibliographicum et Encyclopaedicum.* Haji Xalifa. 7 vols. Leipzig and London. rep. 1966.

Fulton, A.S. and Lings, M., 1960. *Second Supplementary_Catalogue of Arabic Books in the British Museum,* 1927-57. London.

Gupta, B.M., 1994- *South Asian Bibliography and Documentation*. 13 vols. New Delhi.

Huisman, A.J.W., 1967. *Manuscrits Arabes dans le monde.* Leiden.

Hunter, W.W., 1974. *Catalogue of Chief Printed Materials in the India Office for the Imperial Accounts of India*. London.

India Office., 1884. *A Classified List of Reports and other Publications in the Record Branch of the India Office.* London.

-------------------1887. *Catalogue of the Library of the India Office*.

London.

-------------------1895. *Catalogue of the Library of the India Office*. Vol

I, Suppliment. London.

Kak, E., 1880. *Persidskiya, Arabskiya i Tyurkokiya Rukspisi Turkistankoi Publishnoi Biblioteki.* Tashkent.

Livotova, O.E., 1950. *Bibliografiya Izdaniy Aziatskogo Muzea i Instituta Vostokovedeniya.* Moscow.

Luzac & co., 1891. *Luzac and co.'s oriental List. (monthly list),* London.

-------------------1891. *Catalogue containing the chief part of the Library of the late Col. Sir. H. Yule….* London.

Ockeloen, G., 1966. *Catalogue van booken en Tijdschriften uitgegeven in Ned. Ost. Indie, van 1870-1937*. 2 vols. Amsterdam.

Paul, K., 1887. *List of Books in Hindustani Language*. London.

-------------------1890. *List of Books on British India……* London.

Petherick, F.A., 1886. *Catalogue of the York Gate Library*. London.

Quraishi, Salim al-din. 1991. *Catalogue of Urdu bookds in the Indis Office Library 1800-1920, Supplimentary to J.F. Blumhardt's Catalogue of 1900.* London.

Quaritch, B., 1865. *Catalogue of Oriental Literatures*. London.

Roessingh, M.P.H.ed., 1982. *Sources of the History of Asia and Oceana in the Netherlands*. Part I, Sources upto 1796. Munich.

Rossi, E. and Bombaci, A., 1961. *Elinco di drammi religiosi Persiani (fondo Manuscritti* Vaticani Cerulli). Vatican.

Royal Asiatic Society London. 1940. *Catalogue of the Printed Books Published before 1932 in the Library of the Royal Asiatic Society London*. London.

Schwab, M., 1876. *Bibliographie de la Perse.* Paris. rep. *Amsterdam*, 1962.

Semenov, A.A. 1935. *Opisanie Persidskich, Arabiskich i Tureskich Rukopisei Fundamental noi Biblioteki Sredneaziatskogo Gosudarstvennogo Universiteta Tashkent.* Tashkent.

Trubner & co. 1853. *Catalogue of Books chiefly in Oriental Languages*. London.

-------------------1882. *Trubner's Oriental and Linguistic Publications: A Catalogue of Books, Periodicals and Serials of the History, Languages, religions, Antiquities, Literature and Geography of the East…* . London.

Williams & Norgate's Oriental Catalogue. 1890. No. VI: *The Languages, Religions and Literature of the East.* London.

Zenker, J.T., 1840. *Bibliotheca Orientalis: Libros Continens Arabicos, Persicos, Turcicos Inde ab arte Typographica inventa and nostra usque Tempora impress,* Lipsiac.

b) Catalogues of Manuscripts

Abbott, T.K., 1900. *Catalogue of the Manuscripts in the Library of Trinity College, Dublin.* Dublin.

Afshar, Iraj., 1967-68. *Nusxaha hae xatti-e Farsi-ye Kitabxana ha-e Sultani-ye Kupanhag. In: Nusxaha-e Xatti.* 5. pp. 689-713.

------------------1967. *Nusxaha-e Xatti-e Farsi dar Kitabxanaha-e Danishgah-e Adinburg. In: Nusxaha-e Xatti.* 5, pp. 684-688.

------------------1966. *Nusxaha-e Xatti-e Farsi dar Kitabxana ha-e umumi-e Faransa. In: Nusxa ha-e Xatti.* 4.pp. 129-38.

------------------1967. *Nusxaha-e Xatti-e Farsi-e Anjuman-e Padishahi-e Asiyai, London.* London.

Ahlwardt, W., 1887-99. *Verzeichnis der Arabischen Handshriften der*

Kgl-Bibliothek zu Berlin. 10 vols; Berlin. New ed. Hildesheim, 1969.

Apor, E., 1971. *The Persian Manuscripts of the Vambery bequest; Bibliothecae Academiae Scientarium Hungaricae.* Budapest.

Arberry, A.J., 1936. *A Catalogue of the Arabic Manuscripts in the Library of the India Office.* Vol III. London.

------------------1955-66. *The Chester Beatty Library, A Hand List of the Arabic Manuscripts.* 8 vols. Dublin.

------------------1959-62. *The Chester Beatty Library, A Hand List of the Persian Manuscripts and Miniatures.* 3 vols. Dublin.

------------------1952. *A Second Supplementary Hand list of the Muhammadan Manuscripts in the University and Colleges of Cambridge.* Cambridge.

------------------1939. *Hand list of Islamic Manuscripts acquired by the India Office Library, 1936-38*. In: *Journal of the Royal Asiatic Society*. pp. 353-96.

------------------1939. *Notes on Islamic Manuscripts recently acquired by the India Office Library.* In: *Islamic Culture.* 13 (1939), pp 440-58.

Arnold, F.A. and Muller, A., 1876. *Verzeichnis der Orientalischen Handschriften der Bibliothek des Hallischen Waisenhause.* Halle.

Arnold, Thomas. rev. by J.V.S. Wilkinson., 1936. *The Library of A. Chester Beatty: a Catalogue of the Indian Miniatures.* London.

Aro, J., 1959. *Die Arabischen, Persischen und Turkischen Handschriften der Universitatbibliothek zu Helsinki.* Helsinki.

Assemaneus, L.S., 1719. *Bibliotheca Orientalis Clementino-Vaticana in que Manuscripts Syriaco, Arabicos, Persicos, Turcicos...* . Roma.

Ashraful Hakh and others., 1925. *A Descriptive Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts in Edinburgh University Library.* Hertford.

Aumer, J. 1866. *Die Arabischen Handschriften der K. Hof und Statsbibliothek in Munchen.* Munchen. New ed. Wiesbaden, 1970.

------------------1866. *Die Persischen Handschriften der K.Hof und Statsbibliothek in Munchen.* Munchen.

------------------1875. *Verzeichniss der Orientalischen Handschriften der K.Hof und Statsbibliothek in Munchen*. Munchen.

Bartholomaeo, P.a s., 1793. *Musei Borgiani Velitris codices avenses peguani Siamici, Malabarici, Indostani animadversionibus Historico criticis castigati et illustrate, et cosmogonia Indico Tibetana.* Romae.

Batts, J.S., 1976. *British Manuscripts of the Nineteenth Century*. Totowa.

Beeston, A.F.L., 1954. *Catalogue of the Persian, Turkish, Hindustani and Pushto Manuscripts in the Bodleian Library.* Pt. III. *Additional Persian Manuscripts*. London.

------------------1954., *The Oriental Manuscript Collections of the Bodleian Library*. Oxford.

Bibliotheca Lindesiana, 1898. *Hand list of Oriental Manuscripts, Arabic, Persian, Turkish.* Aberdeen.

Bibliotheque Nationale, Paris., 1973. *Tresors d'Orient.* (Exhibition Catalogue, incl. Arabic, Persian, Urdu mss.). Paris.

------------------1981. *Sources de l'histore de l'Asia et de l'Oceanie dans les Archives et Bibliotheques Francaises.* Vol 2: *Bibliotheque Nationale.* Incl. lists with brief details, Arabic, Persian, Urdu. Munich.

Blaskovic, J., 1961. *Arabische, Turkische und Persische Handschriften der Universitatsbibliothek in Bratislava.* Bratislava.

Blochet, E., 1905-34. Catalogue *des Manuscrits Persan de Bibliotheque Nationale*. 4 vols. Paris.

-------------------1909. *Catalogue des Manuscrits Arabes, Persans et Turcs offerta la Bibliotheque Nationale par J.A. Decourdemanche*. Paris.

-------------------1916. *Inventaire de la collection de Manuscrits Musulmans de M. Decourdemanche.* Paris.

-------------------1923. *Notices sur les Manuscrits Persans et Arabes de la collection Marteau*. Paris.

Blumhardt, J.F., 1926. *Catalogue of the Hindustani Manuscripts in the Library of the India Office.* Oxford.

-------------------1899. *Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum,* London.

Bonnelli, L., 1878. *Catalogo dei codici Arabi, Persiani, Turchi della Biblioteca Casanatense.* In*: Cataloghi dei codici Orientali di alcune Bibliotecad'Italia*. Roma. pp. 403-474.

Brambach, W. and others., 1892. *Die Handschriften der grossherzoglich badischen hof- und landesbibliorhek in Karlsruhe.* Vol II*, Orientalische Handschriften.* Karlsruhe.

Bridson, G.D.R., 1980. *Natural History Manuscript Resources in British Isles.* London.

Brockelman, C., 1898-1949. *Geschiste der Arabischen Litterature.* 2 vols. Weimer, 1898; Berlin, 1902; suppl. 3 vols, Leiden, 1937-42, second suppl. 2 vols, Leiden, 1943-49. Arabic translation, Abd al Kalim Naggar, in 1 vol. Cairo, 1961-62.

-------------------1903. *Verzeichnis der Arabischen, Persischen, Turkischen und Hebraischen Handschriften der Stadtbibliothek zu Breslau.* Breslau.

-------------------1908. *Katalog der Orientalischen Handschriften der Stadtbibliothek zu Hamburg*. pt. I, Hamburg; New ed. 1969.

Brown, E.G., 1896. *A Catalogue of the Persian Manuscripts in the Library of the University of Cambridge.* Cambridge.

-------------------1932. *A Descriptive Catalogue of the Oriental Manuscripts belonging to the late E.J. Brown.* ed. R.A.Nicholson. Cambridge.

------------------1900. *A Hand list of the Muhammadan Manuscripts including all those written in the Arabic character, preserved in the Libraries of the University and Colleges of Cambridge.* Cambridge. suppl. 1922.

------------------1917. *Persian Manuscripts of the late Sir Albert Houtum-Schindler. In: Journal of the Royal Asiatic Society*. pp. 657-94.

------------------ and E. Denison Ross. 1902. *Catalogue of two collections of Persian Manuscripts Preserved in the India Office Library.* London.

Cabaton, A., 1912. *Catalogue Sommaire des Manuscrits Indiens, Indo-Chinos and Malayo-Polynesiens.* Paris.

Cambridge South Asian Archives., 1987. *Principal Collections of Papers in the Cambridge South Asian Archives.* Cambridge.

Chanykov, V., 1865. *Die Sammlung von Morgenlandischen Handschriften, Welche die Kaiserliche Offentliche Bibliothek zu St. Petersbourg.* St. Petersburg.

Christensen, A. and Ostrup, J., 1915-16. *Description de Quelques Manuscrits Orientaux Apartenant a la Bibliotheque de l'Universite de Copenhague.* Copenhague.

Clarke, J.B.B., 1834. *A historical and descriptive Catalogue of the European and Asiatic Manuscripts in the Library of the late Dr.Adam Clarke*. London.

Codrington, O., 1892. *Catalogue of the Arabic, Persian, Hindustani and Turkish Manuscripts in the Library of the Royal Asiatic Society. In: Journal of the Royal Asiatic Society*. pp. 501-569.

Colas, G. and Richard, F., 1984. *Le fonds Polier a la Bibliotheque Nationale*. in: *Bulletin de l'Ecole Francais d' Extreme-Orient.* 73. pp. 99-123.

Cureton, W. and Rieu, C. 1838-71. *Catalogue of the Arabic Manuscripts in the British Museum.* 4 pts. 2 vols. London. rep. Osnabruck, 1969.

Curzon, R., 1849. *Catalogue of materials for writing,... rolled and other Manuscripts and Oriental Manuscripts, Books, in the Library of the honourable Robert Curzon*. London.

Danvers, F.C., 1892. *Report to the Secretary for India.... on the Portuguees Records relating to India contained in the Archivo da Torre do Tombo and the Public Libraries at Lisbon and Evora.* London.

Delisle, L., 1868-81. *Le Cabinet des Manuscrits de la Bibliothequ Imperiale.* 3 vols. Paris. rev. by E. Poulle, 1977.

Deloncle, M.F., 1879. *Catalogue des livres Orientaux et autres composant la Bibliotheque de fue m. Garcin de Tassy, suivi du Catalogue des Manuscrits Hindustanis, Persans, Arabis, Turcs.* Paris.

Derenbourg, H. 1884. *Les Manuscrits Arabes de l'Escurial*. Paris.

Dobraca, K., 1963. *Katalog Arapskih, Turkih i Perzjiskih rulopisa. Gazi Husrevbegova Biblioteka.* Sarajevo.

Dogra, R.C., 1978. *A Hand list of the Manuscripts n South Asian Languages in the Library of the School of Oriental and African Studies, London.* London.

Dorn, B., 1846. *Das Asiatische Museum der Kaiserlischen Akademie der wissenschaften zu St. Petersbourg.* St. Petersbourg.

------------------1852. *Catalogue des Manuscrits et Xylographes Orientaux de la Bibliotheque Imperiale Publique de St. Petersbourg*. St. Petersburg.

Dozy, R.P.A. and others. 1851-77. *Catalogoues Codicum Orientalium Bibliothecae Acadmiac Lugduno Batavae*. 6 vols. Lugduno Batavorum.

Duda, Dorothea., 1983. *Islamische Handschriften 1: Persische Handschriften.* Vienna.

East India Company., 1845. *A Catalogue of the Library of the East India Company.* London.

------------------1851. *A Suppliment to the Catalogue of the Library of the East India Company.* London.

Eberti, F.A., 1831. *Catalogus codicum Manuscriptorum Orientalium Bibliothekae Regiae Dresden*. Lipsiae.

Ellis, A.G. 1894-1901. *Catalogue of Arabic books in the British Museum.* London.

------------------1945. *The Manuscripts belonging to the collection of the late A.G. Ellis described in Luzac's "Bibliotheca Orientalis"* xlv, pp. 3-35.

-------------- and Edwards, E., 1912. *A Descriptive list of Arabic Manuscripts acquired by the trustees of the British Museum*. London.

Ethe, H., 1916. *The National Library of Wales: Catalogue of Oriental Manuscripts, Persian, Arabic and Hindustani.* Aberystwyth.

-------------------1903-37. *Catalogue of Persian Manuscripts in the Library of the India Office*. rev. and comp. E.Edwards. 2 vols, London.

Ewald, G.H.A., 1839. *Verzei chniss der Orientalischen Handschriften der universtatsbibliothek*. Tubingen.

Fagnan, E., 1893. *Catalogue des Manuscrits Arabes, Persans et Turcs de la Bibliotheque Musee d'Alger.* Paris.

Fleischer, H.O., 1831. *Catalogus Codicum Manuscriptorum Orientalum Bibliothecae Regiae Dresdensis…. Accedit Friderici Adolfo Eberti… Catalogus codicum Manuscriptorum Orientalium Bibliothecae duclis guelferbytanae*. Leipzig.

-------------------1838. *Catalogus Librarum Manusriptorum qui in Bibliotheca Senatoria Civitatis Lipsiensis Asservantur*. Grimae

Flugel, G., 1865-67. *Die Arabischen, Persischen, Turkischen*

Handschriften der Kaiserlich-Koniglichen Hof Bibliothek zu Wien. 3 vols, Wien. rep. Hildeshein, 1970.

Fonahn, A., 1910. *Zur Quelenkunde der Persischen Medizin*. Leipzig.

Forbs, D., 1866. *Catalogue of Oriental Manuscripts, chiefly Persian, collected within the last five and thirty years by Duncan Forbs.* London.

Frank, O., 1814 *Ueber die Morgenlandischen Handshriften der Loniglischen Hofund Centralbibliothek in Munchen*. Munchen.

Fraser, James., 1742. *A Catalogue of Manuscripts in the Persic, Arabic and Sanskerrit Languages, Collected in the East by James Fraser*. London.

Garbe, V.R., 1899. *Verzeichniss der Indischen Handschriften. Zwachs der Jahre 1865-1899*. Tubingen.

Gabrieli, Giuseppi., 1930. *Manoscritti e Carte Orientali nelle Biblioteche e negli Archivi d'Italia. Dati Static e Bibliografici delle Collezioniloro Storia e Catalogazione*. Firenze.

-------------------1926. *La fondazione Caetani per gli studi Musalmani. Nolizia della Sua istituzione e Catalogo dei suoi mss. Orientale*. Roma.

Gafurov, B.G. and Mirzaov, A.M., 1967. *Alphabetical Catalogue of Manuscripts found by 1959-63 Expedition in Gorno-Badakhshan*. Moscow.

German Asiatic Society., 1880-81. *Katalog der Bibliothek der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft. 1: Druckschriften und Ahnliches, 2: Handschriften, Inscriften, Munzen, Verschiedenes.* Leipzig.

Gildemeister, J., *1864-1876. Catalogus Librorum Manuscriptorum Orientalium in Bibliotheca Academica Bonnensi Servatorum*. Bonnae.

Glasgow University Library., 1983. *William Hunter, Book Collector: Catalogue of an Exhibition Compiled by Jack Baldwin.* Glasgow.

Goeje, M.J. De, M. Th. Houtsma. 1873-77. *Catalogus Orientalum Bibliotheca Acdemiae Lugduno Batavac.* Vols. V, VI and VII. Batava

Guidi, I., 1878. *Catalogo dei Codici Siraici, Arabi, Turchi a Persiani della Biblioteca Vittorio Emanuele. in: Cataloghi dei Codici Orientali di Alcune Biblioteche d'Italia.* Roma.

Guise, S., 1795. *A Catalogue of Oriental Manuscripts, collected in Indoostan. By Mr. Samuel Guise…. From the year 1777 till 1792*. London.

Ha'len, Herry. 1978. *Handbook of Oriental collections in Finland*. London.

Hammer, G.De., 1820. *Codicisa Arabicos, Persicos Bibliotecae Caesarco-regio-platiane, Vindobonensis.* Vindobonae.

-------------------1839. *Catalogo dei Codici Arabi, Persiani e Turchi della Biblioteca Ambrosiana. In: Biblioteca Italiana.* pp. 22-49, 322-348.

-------------------1826. *Lettre sui Manuscritti Orientali. In: Biblioteca Italiana*. pp. 27-36.

Hansen, O., 1938. *Die Mittelpersischen papyri der papyrussammlung der staatlichen museen zu Berlin*. Berlin.

Hashmi, Saiyyad Naseeruddin., 1932. *Yorop men Dakhni Maxtutat*. Hayderabad.

Heinz, W. and Eilers, W. 1968. *Verzeischnis der Orientalischen Handschriften in Deutschland. Vol 14. Persische Handschriften*. Wiesbaden.

Hill, S.C., 1916. *Catalogue of Manuscripts in European languages: The Orme Collection*. London.

-------------------1927. *Catalogue of the home miscellaneous series of the India Office Records.* London.

Hoghoughi, A., 1964. *Catalogue Critique des Manuscrits Persans de la Bibliotheque Nationale et Universitaire de Strassbourg.* Strassbourg.

Hopwood, D., 1961. *The Islamic Arabic Manuscripts in the Mingana collection. in: Journal of the Royal asiatic Society*. pp. 100-5.

Hunter, W.W., 1872-73. *Catalogue of Manuscripts in the Library of the India Office*. London.

Husain, Aaga Iftexar., 1967. *Maxtutat-e Paris*. Karachi.

Irmisher, J.C., 1852. *Handschriften Katalog der Koniglischen Universitatsbibliothek Erlangen: Arabische, Turkische und Persische Manuscripte*. Frankfurt.

Iskandar, A.Z., 1967. *A Catalogue of Arabic Manuscripts in the Wellcome Historical Medical Library.* London.

James, D., 1981. *Islamic Masterpieces of the Chester Beatty Library.*

London.

James, M.R., 1895. *A descriptive Catalogue of the Manuscripts in the*

Fitzwilliam Museum, Cambridge. Cambridge.

Jang, Z., 1956. *Islamski rulopisi iz Jugoslovenskihkolekcija. Les manuscrits Islamics dans les collections Yugoslave.* Balgrade.

Jong, P. De. 1862. *Catalogus Codcum Otientalium Bibliotheca Academiae Regiae Scientarum.* Leyden.

------------------- and Goeje, M.J.De. 1865-1866. *Catalogus Orientalum Bibliotheca Academiae Lugduno Batavae*. Vols III et IV. Batavae.

Kahl, E., 1889. *Persidskiya, Arabskiya i Tyurkiskiya rukopisi Turkestanskoi publicnoi Biblioteki.* Tashkent.

Kaye, G.R. and Johnston, E.H., 1937. *Catalogue of Manuscripts in European languages: Minor Collections and miscellaneous Manuscripts*. London.

Kern, Anton., 1942-67. *Handschriften der Universitatsbibliothek Graz*. 3 vols. Vol 1, Leipzig; vol 2, 1956, Vienna; vol 3, 1967, Vienna.

Kerney, M., 1898. *Bibliotheca Lindesiana, Handlist of Oriental Manuscripts: Arabic, Perisan, Turkish in the John Rylands Library, Manchester*. Aberdeen.

Klette, A. and Staender, J., 1858-76. *Chirographorum in Bibliothekca Academica bonnensi servatorum Catalogus. Volumen II quo libri descripti sunt praeter Orientales rclicui.* Bonnae.

Kraemer, J., 1956. *Persische miniaturenund ihr umkreis, buch-und schriftkunst Arabischer, Persischer, Turkischer und Indischer Handschriften aus dem besitz der fruhren Preussischen staats-und der Tubinger Universitasbibliothek.* Tubingen.

Kremer, A.F.V., 1885. *Ueber meine sammlung Oirentalischer Handschriften*. Wien.

Krafft, A., 1842. *Die Arabischen, Persischen und Turkischen Handschriften der K.K.Orientalischen Akademic zu Wien.* Wien.

Kurio, Hars., 1981. *Arabesche Handschriften der Bibliotheca Orientalis Sprengeriana in der Staatsbibliothek Preusischer Kulturbesitz-Berlin*. Verlag.

Lancaster, J.C., 1966. *A Guide to lists and Catalogues of the India Office records.* London.

Landauer, S., 1892. *Die Handschriften der Hof-und Landesbibliothek in Karlsruhe. II, Orientalische Handschriften*. Karlsruhe.

-------------------1881. *Katalog der Hebraischen, Arabischen, Persischen und Turkischen Handschriften der Kaiserlischen Univesitats und landesbibliothek.* Strassburg.

Leroux, E., 1878. *Catalogue de la Bibliotheque Orientale de feu m. belin. Livres sur la Turquie. Textes et Manuscrits arabis, Turcs et Persans.* Paris.

Levin, G.M.B. and Desyatovskaya, M.I.V., 1986. *Indian Texts from Central Asia: Leningrad Manuscripts Collection.* Tokyo.

Lindhagen, Nils. and others., 1957. *Oriental Miniatures and Manuscripts in Scandinavian collections.* Stockholm.

Losty, J.P., n.d., *British Museum: Illustrated Manuscripts from South Asia in the department of Oriental Manuscripts and Printed Books, a handlist.*

Loth, O., 1877. *Catalogue of the Arabic Manuscripts in the Library of the India Office.* vol 1, London. rep. 1971.

Luzac & Co., 1913. *Bibliotheca Orientalis XII: being a catalogue of Oriental Manuscripts (Arabic, Hindustani, Persian and Turkish) with a few reproduction of Mughal Paintings on sale by Luzac & Co*. London.

Mahmudul Haq, Qazi., 1965. *A descriptive Catalogue of the un-catalogued Arabic, Persian and Urdu Manuscripts, relevant to the History and Culture of the Muslims in India, acquired by the British Museum since the publications of its last printed Catalogues……* . London.

------------------1965. *A descriptive Catalogue of the un-catalogued Oriental Manuscripts, relevant to the History and Culture of the Muslims in India, acquired by the Royal Asiatic Society since the publication of its last printed Catalogue….* . London.

------------------1993. *Hand list of Urdu and Punjabi Manuscripts acquired by Oriental Collections since 1899*. London.

------------------1993. *Supplimentary Catalogu of the Urdu Manuscripts in the Department of Oriental Manuscripts and Printed Books.* London.

Maellero, J.H., 1825. *Catalogus Librorum tam Manuscriptorum…… in Bibliotheka Gothana.* Gothae.

Maio, A. 1831. *Scriptorum veternumnova collectio. vol IV: 2a, Catalogus codici Bibliotecae Veticanne Arabiscorum, Persiscorum, Turciscorum.* Roma.

Majda, T., 1967. *Katalog Rekopisow Orientalnych ze Zbiorow Polskich. Vol 5. pt. II, Catalogue des Manuscrits Turcs et Persans.* Warszawa.

Margoliouth, D.S., 1904. *Catalogue of the Oriental Manuscripts in the*

Library of Eton College. Oxford.

Marshall, D.N., 1967. *Mughals in India: Bibliographical Survey. vol I, Manuscripts.* London. New ed. New York, 1985.

Mehren, A.F., 1857. *Codeces Persici, Turcici, Hindustanici Veruque alu Bibliothecae Regiae Hafniensis Jussu et Auspicus Regus.* Copenhagen.

Meredith-Owens, G.M., 1968. *Hand list of Persian Manuscripts in the British Museum, 1895-1966*. London.

Mikloukho, M.N.D., 1955. *Opisaniye Tadjikskikh i Perisdskikh rukopisei*. Moscow.

Mingana, A. 1934. *Catalogue of the Arabic Manuscripts in the John Rylands Library, Manchester.* Manchester.

Mironov, N.D., 1914. *Katalog Indiskikh Rulopisei. Catalogus Codicum Manuscriptorum Indicorum qui in Academiae Imperialis Scientarium Petropolitanae Museu Asiatico Asservantur.* St. Petersbourg.

-------------------1918. *Katalog Indiskikh Rukopisie Rossisskio Publichnoi Biblioteki.* St. Petersbourg.

Mohl, J. and Lacroix, P., 1843. *Catalogue des livres et Manuscrits Orientaux provenant de la Bibliotheque de feu M.J.St. Harriot.* Paris.

Moir, Martin., 1988. *A General Guide to the India Office Records.* London.

Morley, W.H., 1838. *A Catatlogue of the manuscripts in the Arabic, Persian, Turkish and Hindustani languages, preserved in the Libraries of the royal Asiatic Society and the oriental Translation fund of Great Britain and Ireland.* London.

-------------------1854. *A Descriptive Catalogue of the Historical Manuscripts in the Arabic and Persian Languages in the Library of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland..* London. reps. London: 1971, Osnabruck, 1978.

Muhiuddin, A.H.M. and Macdonald, J., 1960. *Catalogue of Oriental Manuscripts.* IX, *Persian Manuscripts. University of Leeds*. Leeds.

Musharraf ul Hukk, M., 1911. *Katalog der Bibliothek der Deutschen morgenlandischen gesellschaft.* Zweiter band: Handschriften. Teil B: Persische und Hindustanische Handschriften. Liepzig.

Nallino, C.A., 1900. I *Maniscritti Arabi, Persiani, Siraici e Turchi della*

Biblioteca nazionale e della r. accademia delle scienze di Torino. Torino.

National Library of Scotland. 1938. *Catalogue of Manuscripts acquired since 1925.* Edinbrough.

-------------------1964. *Hand list of Material relating to India.* Edinbrough.

Nessel, D.D., 1690. *Catalogus sive recensio specialis omnuim codicum Manuscriptorum Gracorum, nec non linguarum Orientalum, Augusissimae Bibliothecae Caesareae vindobonensis.* Vindobonae. Another ed., Hanovera, 1712.

Nicoll, A., 1787-1835. *Bibliothecae Bodleianae codicum Manuscriptorum Orentalium .....Catalogus.* Oxonii.

Nistor, I.I., 1946. *Manuscrisele Orientale din Biblioteca Academici Romane cu inventarul.* Bucaresti.

Octavi, C., 1846. *Codices Orientales Bibliothek Regale Havniensis*. Havnie.

Ouseley, W., 1831. *Catalogue of several Hundred Manuscript Works in Various Oriental Languages.* London.

Palmer, K. 1867. *Catalogue of the Oriental Manuscripts in the Library of King's College, Cambridg.* London.

------------------1870. *descriptive Catalogue of the Arabic, Persian and Turkish Manuscripts in the Library of Trinity College, Cambridge.* Cambridge.

Paulune, P. and Bartholomaco, S., 1793. *Musei Borgiani Velitris codices manuscripti Avenses, Peguani, Siamiei, Malabarici, Indostani animadversionbus historicocriticis et illustrati accedunt monumenta inedita, et cosmogonia indico-Tibetana.* Roma..

Pearson,J.D., 1954. *Oriental Manuscript Collections in Great Britain and Ireland.* London.

------------------1971. *Oriental Manuscripts in Europe and north America; a surey.* Zug.

------------------1989., *A Guide to Manuscripts and Documents in the British Isles relating to south and South-East Asia*. vol 1: *London*. London; Vol 2 : 1990, *British Isles (Excluding London).* London.

Pertsch, W., 1888. *Verzeischniss der Persischen Handschriften der Koniglischen Bibliothek zu Berlin. Berlin.* rep.1970.

------------------1859-64. *Die Orientalischen Handschriften der Herzoglichen Bibliothek zu Gotha.* Wien. rep. 1970.

------------------1877-92. *Die Arabischen Handschriften der Herzoglichen Bibliothek zu Gotha.* 4 Vols. Gotha.

------------------1893. *Die Orientalishen Handschriften der Herzoglichen Bibliothek zu Gotha. .. Anhang: Die Orientalischen Handschriften mit ausnahme der Persischen, Turkischen und Arabischen.* Gotha.

Petracek, K. and others., 1961. *Arabische, Turkische und Persische Handschriften der Universitatsbibliothek in Bratislava.* Bratislava.

Petritsch, Ernst., 1984. *Orientalische Handschriften der Konsularakademie. Vienna.*

Pfannmuller, G.1923. Handbuch der Islam-Litterature. Leipzig. New ed. 1971.

Piemontese, A.M., 1989. *Catalogo dei Manuscritti conservati nelle Biblioteche d'Italia.* Rome.

Preston, T., 1853. *Catalogus Bibliothecae Burckhardtianae, cum appendice librorum aliorum Orientalium in Bibliotheca Academiae Cantabriginsis asservatorum.* Catabrigiae.

Purgstall, J.D.H., 1820. *Codices Arabicos, Persicos, Turcicos, Bibliothecae Caesarco-regio-palatinae vindobonensis.* Vindobonae.

Quaritch, B., 1902. *A Catalogue of works on Oriental history, languages and literature.* London.

Quraishi, Salim al Din, 1978. *Bartanya men Urdu Maxtutat*. In: *Kitab* (Lahore), July, pp. 21-36.

------------------1981. *Fihrist-e Maxtutat-e Urdu Indiya Office Library, London.* London.

------------------1990. *Catalogue of the Urdu, Punjabi, Pashto and Kashmiri Manuscripts and Documents in the India office Library and Records.* London.

Reade, Julian*., 1996. Provisional Hand list of Royal Asiatic Society Manuscripts in Arabic Script*. London.

Regamey, C., 1968. *Manuscrits sur feuilles de palmier. Les Manuscrits Indiens et Indochinois de la section ethnographique du musee Historique de Bern. Catalogue descriptif. Sonderdruck aus dem jahrbuch des Bernischen Historischen Museumsin Bern.* Bern.

Reinhardt, R., 1905. *Katalog der Bibliothek des Vereins fur Erdkunde zu Leipzig.* Leipzig.

Richter, G., 1933. *Verzeichnis der Orientalishchen Handschriften der Staats-und Universitas-bibliothek Breslau*. Leipzig.

Riddick, J.F., 1993. *A Guide to Indian Manuscripts: Materials from Europe and North America.* Westport.

Riedel, W., 1923. *Katalog over Kungl. Bibliothekets Orientaliska Handskrifter.* (Stockholm) Upsala.

Rieu, C., 1879-83. *Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum.* 3 vols. rep. 1895. Suppl. 1996.

------------------1894. *Suppliment to the Catalogue of the Arabic Manuscripts in the Library of the India office.* London. rep. Olms, 1979.

------------------1895. *Suppliment to the Catalogue of the Persian Manuscripts in the Library of the India office.* London. rep. London 1977.

Robertson, E. and others., 1925. *Descriptive Catalogue the Arabic and Persian Manuscripts in Edinburgh University Library*. Hertfort.

Robson, James., 1945. *Catalogue of Oriental Manuscripts in the library of the university of Glasgow.* Glasgow.

Romaskewicz, A. 1925. *Indices alphabetici codicum manu scriptorum Persiscorum, Turcicorum, Arabicorum qui in Bibliotheca Literarum Unversitats Petropolitanae adservantur. Supplementum confecit.* Leningrad.

Rosen, V.R., 1886. *Les Manuscrits Persans de L'Institut des Langues Orientales.* St. Petersburg. rep. Amsterdam, 1971.

------------------1885. *Remarques sur les Manuscrits Orientaux de la Collection Marsigli a Bolgne, suivies de la liste complete des Manuscrits Arbes de la meme collection.* Rome.

Rossi, E. 1948. *Elenco dei Manoscritti Persiani della Bibliotheca Vaticana*. Rome.

Roth, R.V., 1865. *Systematisch-Alphabetischer Hauptkatalog der Koniglischen Universitatsbibliothek.... M. Handschriften. a Orientalische. 1. Indische Handscheriften.* Tubingen.

Rousseau, J.L., 1817. *Catalogue d'Une collection de cinq cents Manuscrits Orientaux.* Paris.

Royal Commonwealth Society. Library., 1975. *The Manuscript Catalogue of the Library of the Royal Commonwealth Society.* London.

Sachau, E. and Ethe, H.1889-1930. *Catalogue of the Persian, Turkish, Hindustani and Pashto Manuscripts in the Bodlian Library.* Oxford.

Saifuddin Najmabadi, *Dastnavisha e Farsi dar Kitabxana-e Saltanati Barlin. In: Mujalla-e Dinishkada-e adabiyat*.vol 7, No.4.

Salemann,C. and Rosen, V., 1888. *Indeces Alphabetici Codicum Manuscriptorum Persicorum, Turcicorum, Arabicorum qui in Bioblitherea Imperialis Literarum Universitatis Petropolitanae Adservantur.* St. Petersburg. Suppl. 1925.

Semenov, A.A., 1925. *Katalog Rukopisei Istoricheskogo Otdela Bukharskoi Tsentral noi Biblioteki.* Tashkent.

------------------1935. *Descriptive Catalogue of the Persian, Arabic and Turkish Manuscripts preserved in the Library of the Middle Asiatic State University.* Tashkent.

------------------1952-56. *Sobraniya Vostotchnyh Roukopissei Akademii Naouk Uzbekskoi S.S.R.,* 4 vols. Tashkent

Serjeant ,R.B., 1942. *A Hand list of the Arabic, Persian and Hindustani Manuscripts of New College, Edinburgh*. London.

Sezgin, Fuat.,1967-84. *Geshichte des Arabischen Schriftums* .10 vols.Leiden.

Schefer, C., 1900. *Catalogue de la Collection de Manuscrits Orintaux, Arabes, Persans et. Turcs.*Paris.

Scholberg, Henry., n.d.., *South Asia: Research Collections on Microform*. Leiden.

Sieg, E., 1908. *Verzeischnis der Bibliotheca Indica und Verwandter Indischer serien nach werken und nummern.* Leipzig.

Sims, john., 1987. *Selections from the Records of the Government of India*,1849-1937.Zug.

Sims- Williams, Ursula., 1986. *Hand list of Islamic Manuscripts acquired by the India Office Library, 1938-85.* London.

Skeat, T.C., 1962. *The Catalogues of the Manuscript Collections in the British Museum.* London.

Spaho, F. 1942. *Arapski, Perzijiski i Turski rukopisi Hrvatskih zemaljskih muzeja u Sarajevu.* Sarajevu.

Sparvenfeldius, L., 1706. *Catalogue centuriae liborum rarissimorum Manuscript and partim impressorum, Arabicorum, Persicorum, Turcicorum qua... Bibliothecum Publicum.* Upsaliae.

Sprenger, A., 1857. *A Catalogue of the Bibliothca Orientalis Sprengeriana*. Geissen.

Starcke, S. G., 1695. *Bibliotheca Manuscripta Abrahami Hinkelmanni...sicuti Pleraque ex parte constat ex codicibus Orientalibus.* Hamburgi.

Stchoukine, Ivan and others., 1971. *Illuminierte Islamische Handschriften*. Wiesbaden.

------------------1954. *Les Penitures des Manuscrits Timurides*. Paris.

Stern , L., 1892. *Die Orientalischen Handschriften des Sir Thomas Phillips in der Koniglischen Bibliothek zu Berlin.* Berlin.

Storey, C.A., 1930. *A Catalogue of the Arabic Manuscripts in the Library of the India Office.* Vol II, London.

Strothmann, A., 1922. *Arabischen und Persischen Handschriften aus dem Besitz des verstorbennen Reisenden Dr. Burchardt*. O.L.Z.

Talman, M., 1702. *Elenchus Librorum Orientalum Manuscriptorum ... a... Aloysio Ferdinando Marsigli...* . Vienna.

Taqi Danishpazoh, Muhammad., 1979. *Nusxaha-e Xatti dar Kitabxanaha-e Ittehad –e jamhuri-e Shuravi : Guzarish va Fihrist. In: Nusxaha-e Xatti.8.*

------------------1979. *Paragandaha, yad dasht dar bara-e Nusxaha-e Bunyadha-e Farhangi-e Kishwar-e Shuravi.* in: *Nusxaha-e Xatti.* 10. pp. 287-373.

Tauer, F., 1932. *Les Manuscrits Persans Historiques des Bibliotheques de Stamboul*. Prage.

Tornberg, C.J., 1849. *Codices Arabici, persici et Turcici Bibliothecae regiae Universitatis Upsaliensis.* Upsala.

------------------1850.*Codices Orientales Bibliothekae Regale Universites Lundansis*. Lundae.

------------------1830-50. *Die Arabischen, Persischen und Turkischen Handschriften der Universitatsbibliothek zu Upsala*. Upsala.

Tritton, A. S., 1951. *Catalogue of Oriental Manuscripts in the Library of Physicions. In: Journal of the Royal Asiatic Society.* pp.182 ff.

University of Leeds., 1958.*Catalogue of Oriental Manuscripts*. Leeds.

Unterkircher, Franz., 1959. *Die Griechischem, Slawischen, Hebraischen und Orientalischen Handschriften…* .vol 2 .Vienna.

Utas, Bo., 1974. *Manuscripts collections in the USSR, Iran, Afghanistan and Germany. In: Annual Newsletter of the Scandinavian Institute of Asian Studies*.pp 8, 33-40.

-------------------1976. *Collection of Muslim Manuscripts in Moscow and Baku. In : annual News Letter of the Scandinavian Institute of Asian studies*. 10.pp .24-27.

Vajda, G., 1957. *Index Generale des Manuscrits Aarabes Musalmans de la Bibliotheque Nationale.* Paris.

------------------ and Sauvin, Y., 1978. *Catalogue des Manuscrits Arabes. Deuxieme Parte. Manuscrits Musalmans*. Paris.

Vallee, Leon., 1894. *La Bibliotheque Nationale: Choix de Documentes pour servir a L'Histoire de cet etablissmente et de ses Collections.* Paris. rep. Amsterdam, 1969.

Voigt, W., 1961. *Verzeichnis der Orientalischen Handschriften in Deutschland*. Wiesbaden.

Vollers, K., 1906. *Katalog der Islamischen… Handschriften der Universitats Bibliothek zu Leipzig.* Leipzig.

Voorhoeve, P., 1957. *Hand list of the Arabic Manuscripts in the Library of the University of Leiden and other Collections in the Netherland.* Lugduni Batavorum.

Wainwright, M.D. and Mathews, N., 1965. *A Guide to Western Manuscripts and Documents in the British Isles relating to South and South East Asia.* London.

Waley, Muhammad Isa., 1994. *Supplimentary Handslist of Persian Manuscripts in the British Library Oriental collection.* London.

Weir, T.H., 1906. *The Persian and Turkish Manuscripts in the Hunterian Library of the University of Glasgow.* in: *Journal of the Royal Asiatic society. pp. 595-609.*

Werden, J.P., 1792. *Examen Historico Criticum codicum Indicorum Bibliothecae Sacrae congregationis de propaganda fide*. Roma.

West, E. and others., 1876. *Verzeichniss der Orientalischen Handschriften aus dem nachlasse des Professor Dr. Martin Haug*. Munchen.

Westergaard, N.L., 1846. *Codices Indici Bibliothecaeregiae Havniensis*. Havnia.

Wickerscheimer, E., 1923. *Catalogue general du Manuscrits des Bibliotheques Publiques de France*. Paris.

Wilhelm, R., 1839. *Bergeichnih ber Orientalischen Handschriften der Universitat Bibliothek zu Tubingen.* Tubingen.

Wilson, H.W., 1828. *The Mackenzie Collections: a descriptive catalogue of the Oriental Manuscripts and other articles illustrative of the literature, history, statistics and antiquities of the South India, collected by.... Col. Mackenzie. Calcutta. 2nd ed. Madras,* 1882. The collection is now mostly in the Oriental and India Office collections of the British Library, London.

Zaidi, S. Mujahid Husain., 1973. *Verzeichnis der Orientalischen Handschriften in Deutschland: Urdu Handschriften.* Wiesbaden.

Zettersteen, K.V., 1930-35. *Die Arabschen, Persischen and Turkischen Handschriften der Universitats Bibliothek zu Uppsala verzeichnet und beschricben*. 2 vols. Uppsala.

Zotter, Hans. und Slaje, Walter., 1985. *Ausstellung der Universitatsbibliothek Graz. Aussereuropaische Drucks und Handschriften. Katalog*. Graz.

Abstract

Some of the major and prominent libraries of Europe have very rich and highly precious collections of South Asian sources on history, culture, languages and literature. These sources are not confined to some particular languages. Among modern languages, a plenty of valuable sources in Arabic, Persian and Urdu are also available in several libraries which are prominent for their Oriental Collections.

The present list of sources, consist of such materials available in these three significant languages belonging to Muslims' history, society and literature, is compiled to facilitate researchers and scholars in their studies on above subjects. This list covers a large number of different sources available in both manuscript and printed forms. Apart from this, these consist of lists, catalogues and bibliographies that are helpful for the scholars of South Asian subjects relating to Muslim history and culture.

Archival Annexure

A Rare Translation of Iqbal's Famous Poem:

Shama Aur Shair

By: *Me'yar*

Introduction:

Like others, Iqbal's famous Urdu poem Shama aur Shair has attracted several translators to render this into English, which are already known and available too. [Like: The Candle and the Poet by M.A.K. Khalil, in: "Marching Bell." (English Translation and commentary of Bang-i-Dara, (Lahore, 1997), pp 270-76; The Candle and the Poet by A. R. Tariq, in: "Longer Poems of Iqbal" (Lahore, 1978), pp 69-95; "The candle and the Poet" by S. Rehmatullah, in: "The Sun", Nov. 4, 1977)] But, there is another translation of this poem, which is rather unknown and quite rare and perhaps the oldest one, is translated by M. Rashid. This was published by the translator himself in 1925 in a book form from Los Angeles. The title was not translated and spelled same as Shama aur Shair but it is sub titled in bracket as: (Cangle and Poet).

The information and details about translator are not known and he himself did not even give any hint about his self or his whereabouts. He dedicated this work only in these letters: To "L.S.H" on a whole page. The text of the translation starts on page 5 and ends on 31.

Since this translation is very rare and unavailable, it is presented here completely. (M.A.)

SHAMA AUR SHAIR

(CANDLE AND POET)

by

The Hon. Knight Sir Dr. M. Iqbal,
K. C. I. E., M. A., Ph. D., Bar-at-Law.

TRANSLATED
by
M. RASHID

Published By
M. Rashid
Los Angeles
1925

SHAMA AUR SHAIR

The Poet:

Yesterday I said to the flickering candle of my ruined home,

Lustre has been lent to thy hair by the comb of thy lover's wings—the
moth.

But look at me! I am like a rose in the desert— unfortunate not to be
used for decoration—

Either in the festive hall or in some fair maiden's hair.

For an indefinite eternity a fire has been consuming me.

This fire burns endlessly and yet I am like the moth around the light.

A thousand wonder visions, a million activities stir my soul.

But alas! My lunatic heart does not let me move from the procession of
ordinary life.

I wonder, whence came this spark in me that consumes the world?

I wonder, whence did this insensible insect learn Moses' capacity for
emotion?

The Candle replied:

The wave of breath is harbinger of my death;

But the same breath creates the music of life in thee.

I am burning; for combustion is my nature;

But thy light is and effect, so the moth is in love with thee.

I drip and melt, for the heart in me has a storm of tears;

Thy tears are like the welcome of dew among the roses.

The lap of my morning is always filled with the roses blooming from
my night's blood.

But alas! dost thou see any link between thy yesterday and the morn?

Yes, it is true that thou hast a consuming flame, but it is soulless.

Thou art like the beautiful rose of the desert, with no feeling, no
usefulness, no soul.

Look into thy soul and see if thou art worthy to be called a [1]saqi,

Since thy customers are thirsty and thy cane contains no ruce.

The method of living is so strange that thine own soul is ashamed and
weary of its surrounding.

Thy God is in thy bosom, but thou art looking for Him in a temple.

What an extravagant madness! What a careless desire.

How couldst thou expect a [2]kais in thy garden?

It is so narrow; and too thy [3]Mahmil has no Leila in it.

O shining Pearl! O the happiness in the bosom of the waves!

Thou knowest not what storms mean.

Thy melodies are too late; thy admirers are gone.

Thy garden is in ruin; thy music is out of fashion.

Those who loved the beautiful sights are gone.

Of what consequence is thy promise of vision,

since it is too late, and the old timers have left the garden?

Of what avail is thy coming, O Bartender! with the wine of life?

Alas! the spring is gone and the roses are dead.

The message of eternal spring has no meaning to the garden.

The latter part of the night has been full of suffering for the victim.

It is too late to see him in the morning.

Dead is the flame, the attraction to which all the moths danced.

What need is there now that it burn to the end?

Thy melodies have no meaning to the roses.

The caravan is dead to the tinkling of bells.

1- Bartender.

2- Lover of Leila.

3- Saddle – box.

Thou wert the light of the festivity, but insensible to fiery emotion.

And thus thy lovers also remained insensible to the touch of thy flame.

Thou couldst, if thou wished, unite them.

But alas! Thou hast left the beads scattered.

Desire to explore is gone; the fools and the wise are alike in thy chains.

Neither do I see that burning desire, nor the consuming flame.

Aimless are a thousand lovers around the wick.

Secure is thy title of Generosity; but whom shalt thou serve?

Neither are those lovers of wine, nor lively gatherings around the bar.

In tears is the decanter that had a thousand wine glasses clustered around it.

Silence prevails in the lively deserts where Leila danced and [4]Majnun lived.

O Failure, the treasure of the caravan is lost, and the caravan has lost the sensibility of loss!

The cities that illumined the distant woods have turned to woods and

ruins.

Truly eternal peace in the world is only possible by proper regulation.

The vast freedom of the ocean creates tears in the clouds.

The vision that lightning envied stands helpless before the light of Sinai.

The thousand nightingales whose music prevailed over the Universe—

Alas! They have retired and secluded themselves in the vale of silence;

And the lightning that played on the vast heaven is lost in the coffin of

Mother Earth.

But why should the blood- filled eyes seek flowers from the garden?

For the thousand tears have filled the lap with flowers.

The night of sorrow brings a message of morning happiness;

The darkness gives a glimpse of the Dawn of Hope.

4- Mad lover.

Good news to thee, O Bartender of the desert!

After a long time thy lunatics have regained their senses.

Self – respect had become the product of the rival;

But look! now every one is singing thy praise.

And the spell that bound thee will soon be broken.

Solomon's vision bears the message of Activity.

And Lo! Hear! They are asking for domestic wine;

For the western wine choked into silence the emotions of Spirituality.

Sing heigh-ho! For this is not the occasion to be disheartened;

For the morning sky is full of the Glory of the Dawn.

Suffers for others and make others feel for the word.

Open thine ears for a word to the wise is enough.

The fore- runners have said that poetry is and absolute element of
prophecy.

So give the message of happiness; open their eyes with the promise
of light.

Awaken the sense with the burning melodies of knowledge!

The loss of country opened the eyes of the people.

The dust from the deer hoof became soot in the eye of the desert.

Thy desire for luxury robbed thee of courage;

Thou wert an ocean in the desert, but reduced to a pool in the oasis.

With the observance of the Principles thou wert great;

By deserting them thou didst become but the scattered odor of lilies.

The life of the rain – drop contains the secret of life;

For sometimes' tis a pearl, sometimes dew, and sometimes a tear.

Create unity again for it is great wealth.

What is that life where the heart is a stranger to the bosom?

All thy lay in the unity of the nation;

Thou didst become an object of pity and shame when thou dist lose it.

The individual is harmonious in the nation— nothing alone.

The waves are beautiful in the ocean – outside they have no meaning.

Keep thy love hidden in the bosom of thy heart;

Do not expose thy wine in a cup.

Like Moses. Set thy tent in the valley of Sinai;

Make the fire of thy search become a living vision.

Let the candle also know the consequence of oppression;

Build up the morning with the dust of moths.

If thou hast and self- respect put not thyself under obligation to the

Bartender;

In the midst of the river do not satisfy thyself with bubbles.

There is no magnetism in the old hills and dales;

Thy madness is new; create a new name for it.

O predestined one, if thou hast fallen,

Re- create from that fallen grain!

Ah yes! Make thy nest again in the same old tree,

And with thy melodies entrance thy neighbors.

It matters not who it may be in this garden—

Either become melody incarnate or do not sing.

Why art thou in the garden like the passing dew?

Open thy lips, for thou art the great trumpeter of the Universe.

O, fool, realize thyself!

For thou art the seed, the fertility, the product.

Alas! What quest keeps thee wandering?

Thou art the path, the guide, the traveler, the destination.

And why art thou fearful before the storm?

Thou art the pilot, the ocean, the boat and the shore.

Come to the lane of the lunatics sometimes;

For thou art the lover, the beloved, the words and the Mahmil.

Woe be to thy ignorance that thou hast become a beggar!

Why, thou art the wine, the wine- glass, the bar- tender, and the bar.

Sweep like fire upon everything false;

Why should thou fear the falseness, for thou art the destruction of falseness.

O, fool thou art the essence of time!

In this world thou art the last message of God.

Understand thy self a bit, O ignorant one!

For, though a drop, thou art yet like a shoreless ocean.

Why hast thou imprisoned thy self in the magnetism of nothingness?

Look within, for thou hast the grandeur of a storm.

Thy breast contains the secret of Him,

Who is visible and invisible in the Universe.

That which would conquer the seven worlds with out the sword—

O ignorant one! Thou dost possess that talisman too.

The message unto which Faran stands a silent witness—

O forgetful one! Dost thou remember that promise?

It is thou only who art contented with a few buds;

Otherwise there is a remedy in the garden for the narrowness of thy lap.

O ignorant one! Thou art the jewel in the mirror of time!

Thou, art the last message of God on earth.

The speech contains the emotions of thy heart.

In thy transparent decanter thy wine is both clothed and naked.

My fiery nature has turned me to ashes,

For this is the process of my life.

See the secret of these fiery expressions in my heart,

And behold the reflections of life in the mirror of my heart.

The sky shall be clothed bright with the beauty of the dawn.

And the darkness of the night shall disappear.

The morning breeze shall scatter exceeding generous the pearls of dew,

That the sleeping fragrance may become the music of roses.

The tenants of the garden shall embrace the broken hearts,

The breeze and the roses shall unite in one.

My tears shall create a sadness and a music,

And every little bud in this garden shall feel the melody.

And thou shalt see the fate of the turbulent ocean,

For every wave shall become a chain upon its feet.

And the hearts shall remember the promise of obedience,

And every forehead shall kiss the earth with a tender kiss of prayer.

From the sighs of the bird- trapper the birds shall borrow their songs,

And he gardener's blood shall serve to color the coats of the roses.

What a vision! Words cannot express!

Stupified with awe I know not what the world shall be.

The bright sun shall change the night into a beautiful day,

And the garden shall be alive with songs of His Divinity—His

Supremacy.

Abstract

The poem Shama aur Shair is one of the famous and eloquent poems of Allama Iqbal published in his first collection Bang-e-Dara in 1924. This poem is among most inspiring poems of Iqbal, where Iqbal expressed his feelings and presented his thoughts about life, nature and society very impressively.

This poem attracted a number of translators to convert this into other languages. There are many versions of this poem available in English language which are usually accessible and have been published time to time from several places, but the translation presented here by some unknown A. Rashid is a very rare and undiscovered to the admirers and scholars of Iqbal. It was published in Los Angeles, USA in 1925, perhaps by the translator himself, just a year after Bang-e-Dara was published.